ماہنامہ
حکایت
لاہور
لکھتے رہے جنوں کی حکایت!
جولائی 2020ء
Pakistanipoint
Learning Point

اور اللہ کی راہ میں (مال) خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو اور نیکی کرو بیشک اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے (195) اور اللہ (کی خوشنودی) کیلئے حج اور عمرے کو پورا کرو اور اگر (راستے میں) روک لئے جاؤ تو جیسی قربانی میسر ہو (کردو) اور جب تک قربانی اپنے مقام پر نہ پہنچ جائے سر نہ منڈاؤ اور اگر کوئی تم میں بیمار ہو یا اُس کے سر میں کسی طرح کی تکلیف ہو تو (اگر وہ سر منڈا لے تو) اُس کے بدلے روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے پھر جب (تکلیف دُور ہو کر) تم مطمئن ہو جاؤ تو جو (تم میں) حج کے وقت تک عمرے سے فائدہ اٹھانا چاہے وہ جیسی قربانی میسر ہو کرے اور جس کو (قربانی) نہ ملے وہ تین روزے ایامِ حج میں رکھے اور سات جب واپس ہو۔ یہ پورے دس ہوئے۔ اور یہ حکم اس شخص کیلئے ہے جس کے اہل وعیال مکہ میں نہ رہتے ہوں اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے (196)

سورۃ البقرہ

جلد: 50 | جولائی 2020ء | شمارہ: 11

مدیر:
عارف محمود 0323-4329344
وقاص شاہد 0321-4616461

قیمت 120/ روپے

ہیڈ آفس 26- پٹیالہ گراؤنڈ لنک میکلوڈ روڈ لاہور 042-37356541

مضامین اور تحریریں ای میل کیجئے:
monthlyhikayat44@gmail.com
primecomputer.biz@gmail.com

اس شمارے میں

اس شمارے میں

حصولِ اقتدار اور اصولِ اقتدار میں فرق!

ابھی چند دن پہلے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی 181ویں برسی منائی گئی۔ دانا دور اندیش اور دلیر رنجیت سنگھ پنجاب کی تاریخ کا اک ایسا باب ہے۔ جسے بائی پاس کر کے پنجاب کی تاریخ لکھنا ممکن ہی نہیں۔ رنجیت سنگھ 13 نومبر 1780ء کو گوجرانوالہ میں سردار مہان سنگھ کے گھر پیدا ہوا اور سکر چکیہ مثل کا سربراہ تھا جو سکھوں کی مشہور بارہ مثلوں میں ایک جانی پہچانی مثل تھی۔ جس کی بنیاد رنجیت سنگھ کے دادا چرٹ سنگھ نے رکھی تھی اور یہ وہ دور تھا جب پنجاب پر احمد شاہ ابدالی کے حملے جاری تھے ایک صوفی شاعر نے لکھا۔

"کھادا پیتا لاہے دا
تے باقی احمد شاہے دا"

یہ کاشتکاروں کا گھرانہ تھا جو مدتوں سے گوجرانوالہ کے قریب موضع سکر چک میں آباد تھا اور اس خاندان کا پہلا فرد جس نے ہندو مت ترک کر کے سکھ مت کو گلے لگایا، اس کا نام بدھومل تھا۔ دھرم کی تبدیلی کے بعد بدھو سنگھ کہلانے لگا۔ وہ انتہائی مضبوط کاٹھی اور مجرمانہ ذہنیت کا مالک تھا۔ سو اس نے ایک گروہ منظم کر کے ڈاکہ زنی شروع کر دی۔ جس کے نتیجے میں آس پاس کے علاقوں پر اس کی دہشت طاری ہو گئی۔ بدھو سنگھ کے بعد اس کے دونوں بیٹوں نے بھی باپ کے نقشِ قدم پر چلنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا بڑا بیٹا نودھ سنگھ انتہائی تندخو اور جنگجو تھا۔ جس نے اپنے گروہ میں خاطر خواہ اضافہ کرتے ہوئے اسے مزید طاقتور بنا دیا۔ اسی کے عہد میں نادر شاہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ نادر شاہ جب لوٹ مار کے بعد واپس جا رہا تھا تو نودھ سنگھ نے اک اور مثل کے سردار کپور سنگھ کی معاونت سے نادر شاہ کے عقب پر چھاپہ مارا اور یہ دونوں بہت سا مال لوٹ کر فرار ہو گئے۔ جس سے اس کی شہرت اور دہشت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا اور پنجاب کے نامی گرامی سکھ سردار بھی اس کا احترام کرنے لگے۔

نودھ سنگھ 1756ء طبعی موت مرا اور پیچھے چار بیٹے چھوڑ گیا۔ سب سے چھوٹے بیٹے چڑت سنگھ کی عمر اس وقت تقریباً بیس برس تھی۔ جب گروہ کی قیادت اس کے ہاتھ آئی تو اس وقت بہت سی مثلیں قائم ہو چکی تھیں۔ جن میں بھنگی مثل اور آہلو والیہ مثل کا بڑا نام تھا۔ یہاں یہ بھی کہتا چلوں کہ صرف ڈاکوؤں کے گروہوں کی قیادتیں ہی اولادوں کو منتقل ہوتی ہیں۔ جبکہ جنیوئن اور جدید جمہوریتوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ اگر ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ سیاسی جماعت نہیں۔ بلکہ اس کے پردے میں چھپا ڈاکوؤں کا گروہ ہے اور گروہ بھی ایسا جو مقامی دولت پر ڈاکے ڈالنے کے بعد بیشتر دولت بیرونِ ملک منتقل کر دیتا ہے۔ یعنی یہ جدید ڈاکو قدیم ڈاکوؤں سے کہیں زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔

اب واپس چلتے ہیں چڑت سنگھ کی طرف، جس نے سکھوں میں بہت نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا۔ سو اب اس نے ملک گیری کا منصوبہ بنانا شروع کر دیا اور پہلے مرحلہ میں ایمن آباد پر حملہ کر کے اسلحہ سمیت بہت سا مال بھی لوٹ لیا۔ اس مہم کی کامیابی کے بعد ''ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں'' والی بات تو فطری سی ہے۔ سو چڑت سنگھ نے گوجرانوالہ میں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کرایا تا کہ توسیع پسندانہ عزائم کی تکمیل میں آسانی پیدا ہو۔

چڑت سنگھ کی مسلسل کامیابیوں سے حسد میں مبتلا بھنگی مثل نے چڑت کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ آخر کار 1771ء میں اک جھڑپ کے دوران جب چڑت سنگھ اپنی نئی بندوق کی ٹرائی لے رہا تھا کہ اچانک بندوق اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور یہ مہم جو اپنی ہی گولی سے ہلاک ہو گیا۔

سردار چڑت سنگھ نے دو بیٹے اپنی نشانی چھوڑے، بڑا بیٹا مہان سنگھ صرف دس سال کا تھا۔ بچوں کی ماں دیساں انتہائی زیرک عورت تھی جس نے کم سن بیٹے مہان سنگھ کے نام پر مثل کے تمام تر معاملات اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ مائی دیساں نے اپنی بیٹی کی شادی بھنگی مثل کے نامور سردار جے سنگھ کے لڑکے صاحب سنگھ سے کر دی اور اپنے بیٹے مہان سنگھ کی شادی اک اور بڑے سردار کی بیٹی سے کر کے خود کو مزید مستحکم کر دیا۔ جب مہان سنگھ سن شعور کو پہنچا تو اس نے مثل کے تمام اختیارات خود سنبھال لئے اور باپ کے نقش قدم پر فتوحات کا نیا سلسلہ شروع کر دیا اور سیالکوٹ کے قریب کوٹلی لوہاراں تک جا پہنچا۔ پٹھانوں کی اک اور بستی علی پور پر قبضہ کر کے اس کا نام اکال گڑھ رکھ دیا۔ یہی مہان سنگھ ایک اور کامیاب معرکہ کے بعد جب گوجرانوالہ پہنچا تو اُسے بیٹے کی پیدائش کی خوشخبری سنائی گئی۔ اپنی تازہ ترین فتح اور جنگ جیتنے کو یادگار بناتے ہوئے اُس نے بیٹے کا نام رکھا ''رنجیت سنگھ''۔ رنجیت سنگھ نے اپنے نام کی لاج رکھی۔ باپ کو مایوس

نہیں کیا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کہلایا جس کے ذکر بنا پنجاب کی تاریخ لکھی ہی نہیں جاسکتی۔

اسلام آباد میں مندر کی تعمیر کے معاملہ پر جہاں ایک طرف سیاست ہو رہی ہے، وہیں جھوٹا پروپیگنڈہ بھی خوب کیا جا رہا ہے جس کا مقصد پاکستان کو بدنام کرنا ہے۔ این جی اوز میدان میں نکل آئیں۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل نے بھی بیان جاری کر دیا۔ پاکستان کے مذہبی طبقہ کا بھی ردِعمل سامنے آ رہا ہے۔ یہ معاملہ ایک تنازع کی صورت اختیار کر چکا ہے کہ آیا مندر اسلام آباد میں بننا چاہئے یا نہیں۔ اب ذرا حقائق سن لیں۔

اسلام آباد میں مندر کی تعمیر کے لئے نواز شریف دورِ حکومت (2016ء) میں چار کنال زمین کی جگہ سی ڈی اے کی طرف سے متعین کی گئی۔ تحریک انصاف کی حکومت کے آنے بعد حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ قومی خزانہ سے پچاس کروڑ روپیہ مندر کی تعمیر کے لئے مختص کیا جائے۔ جس پر ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ حال ہی میں سی ڈی اے سے بغیر منظوری کے مندر کے لئے مختص پلاٹ پر دیواریں بنانا شروع کر دی گئیں۔ جس پر قانونی طور پر سی ڈی اے نے نوٹس جاری کر دیا۔ قانون کے مطابق کسی قسم کی تعمیر کے لئے سی ڈی اے سے منظوری لینا لازم ہے۔ نوٹس لینے پر یہ ایشو بنا دیا گیا کہ سی ڈی اے نے مندر کی تعمیر روک دی جس کی وجہ قانونی نہیں بلکہ مذہبی ہے۔ جو سراسر جھوٹ ہے لیکن اس جھوٹ کو خوب پھیلایا جا رہا ہے اور اسی جھوٹ کی بنیاد پر ایمنسٹی انٹرنیشنل، این جی اوز اور ایک مخصوص طبقہ اپنی اپنی دُکانیں چمکا رہے ہیں۔ کوئی ان سے پوچھے۔ کیا امریکہ، برطانیہ، یورپ میں بغیر اجازت کے کوئی مسجد، کوئی مندر حتیٰ کہ کوئی گرجا گھر بنانے کی اجازت دی جاسکتی ہے؟ اگر نہیں تو سی ڈی اے اگر قانون کی عملداری کے لئے مندر کی غیر قانونی تعمیر کو روکنے کے لئے نوٹس جاری کر رہا ہے تو اس پر اتنا شور کیوں؟

جس دن مندر کی تعمیر کے غیر قانونی کام کو روکنے کے لئے سی ڈی اے نے نوٹس جاری کیا اور اسے اقلیتوں کے حقوق کے خلاف اقدام گردانا گیا۔ اسی روز اسلام آباد کے ہی علاقہ سہالہ میں ایک ایسی مسجد کو شہید کیا گیا جو ایک غیر قانونی تعمیر تھی۔ کیا اس مسجد کے شہید کئے جانے پر ایمنسٹی انٹرنیشنل، این جی اوز، میڈیا اور ہماری پارلیمنٹ میں کوئی بات ہوئی؟ بالکل نہیں۔ گویا مندر کی تعمیر کے قانونی معاملہ کو مذہبی رنگ دینا دراصل ایک غیر قانونی عمل کی حمایت کرنا ہے جس پر کوئی بات نہیں کر رہا۔ جہاں تک مندر کی تعمیر کے مذہبی معاملہ کی بات ہے تو اس پر مفتی تقی عثمانی صاحب نے کہا کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو حق ہے کہ جہاں اُن کی آبادی کے لئے ضروری ہو، وہ اپنی عبادت گاہ برقرار رکھیں اور وہ ضرورت کے مطابق نئی

عبادت گاہ بھی بنا سکتے ہیں لیکن حکومت کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے خرچ پر مندر تعمیر کرائے۔ نہ جانے ایسے نازک وقت میں کیوں ایسے شاخسانے کھڑے کئے جاتے ہیں جس سے انتشار پیدا ہونے کے سوا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

مجھے عملی سیاست سے نفرت ہے، گھن آتی ہے لیکن عمران خان کو یاد رکھنا ہوگا کہ وہ اکیلا سٹیک ہولڈر ہے۔ انجام ٹھیک نہ ہوا تو باقی بغل بچے اپنے اپنے بستے اٹھا کر یوں چلتے بنیں گے جیسے کبھی آئے ہی نہ تھے۔

میرا دکھ یہ ہے میں اپنے ساتھیوں جیسا نہیں
میں بہادر ہوں مگر ہارے ہوئے لشکر میں ہوں

بہادر کون؟ عمران خان!

ہارا ہوا لشکر کون؟ پی ٹی آئی۔ میری خفگی اس باپ جیسی ہے جو قابل بچے کے گریڈز گرنے پر دکھی ہو جاتا ہے۔ آج کے اخبار میرے سامنے ہیں۔ بچپن میں ایک فیورٹ شغل تھا کہ نکتے ملا کر تصویریں بنایا کرتے تھے۔ آج وہی ایکسرسائز کر رہا ہوں۔ اخباری خبروں کے نکتے ملائیں اور دیکھیں کہ مستقبل کی کیسی المناک تصویر ابھرتی ہے۔ صرف سرخیوں پر توجہ فرمائیں۔

''کابینہ میں فواد چوہدری کے بیان پر گرما گرمی، سینئر قیادت پر وزیراعظم بننے کے لئے سازشوں کا الزام''۔

''وزرا چھ ماہ میں کارکردگی بہتر بنائیں ورنہ معاملات دوسری طرف چلے جائیں گے''۔ وزیراعظم

سازشیں ہو رہی ہیں۔ فیصل واڈا کی اسد عمر، رزاق داؤد، ندیم بابر پر کھل کر تنقید۔

''کارکردگی نہ دکھانا ہماری کوتاہی ہے۔ پی ٹی آئی حکومت کے پاس چھ ماہ ہیں''۔ فواد چوہدری

وزیراعظم کا کابینہ میں بڑے پیمانے پر اکھاڑ پچھاڑ، چند کو سبکدوش کرنے کا فیصلہ''۔

بند مٹھی میں ریت سرکنے کا اور کون سا ثبوت درکار ہے؟

اندر کی رسہ کشی خودکشی ہوتی ہے۔ حصولِ اقتدار اور اصولِ اقتدار میں فرق ہوتا ہے۔ ہوم ورک کنٹینرز پر نہیں ہوتے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مردم شناسی اَن پڑھ جلال الدین اکبر کو بھی مغلِ اعظم بنا دیتی ہے۔

دستگیر شہزاد

دنیا کیا کہے گی؟

ہم اپنی آدھی سے زائد خوشیوں کے دروازے دنیا کے ڈر سے خود پر بند کر لیتے ہیں اور ہمارے آدھے سے زیادہ مسائل کی وجہ بھی دنیا کا بے جا خوف ہے۔ مثلاً اگر شادی سادگی سے کی تو دنیا کیا کہے گی۔ اگر بچی کو بھاری جہیز نہ دیا تو دنیا کیا کہے گی۔ اگر مہمان کو کوک یا پیپسی کے بجائے شربت یا چائے پلائی تو دنیا کیا کہے گی۔ اگر ہم نے فیشن کے مطابق کپڑے نہ پہنے تو دنیا کیا کہے گی۔ اگر ہم نے فنکشن پر کھسرے یا کنجریاں نہ نچائیں تو دنیا کیا کہے گی۔ اگر ہم نے بچوں کی شادیاں ان سے پوچھ کر کیں تو دنیا کیا کہے گی۔ اگر ہم نے بچوں کی شادیاں برادری سے باہر کیں تو لوگ کیا کہیں گے۔ اگر ہم نے دھوم دھام سے مُردے کا تیجا (قل)، دسواں، بیسواں، تیسواں، چہلم یا برسی نہ کی تو لوگ کیا کہیں گے۔ نوجوان پڑھ لکھ کر جب جاب حاصل نہیں کر پاتے تو چھوٹا موٹا کاروبار یا آبائی کام نہیں کرتے کہ لوگ کیا کہیں گے۔ ہم بالغ ہوتے ہی بچوں کی شادیاں نہیں کرتے کہ لوگ کیا کہیں گے۔ ہم پردہ نہیں کرتے یا داڑھی نہیں رکھتے کہ لوگ کیا کہیں گے۔ ہم بچوں کو سرکاری سکول یا دینی مدرسے میں داخل نہیں کراتے کہ لوگ کیا کہیں گے وغیرہ وغیرہ......

یوں ہم لوگوں یا دنیا کے خوف سے بہت سے ایسے کام نہیں کر پاتے جو کرنا چاہتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ دنیا کے خوف یا لوگوں کے ڈر کے کچھ فوائد بھی ہیں کہ انسان غلط کام اور جرم سے بہت حد تک باز رہتا ہے لیکن ہم اس خوف کی وجہ سے بہت سے اچھے کام بھی نہیں کر سکتے کیونکہ وہ عام لوگوں کی نظر میں اچھے نہیں ہوتے یا دنیا کے عمومی معیارات کے مطابق نہیں ہوتے لیکن دیکھنا چاہئے کہ جس دنیا کی ہم اتنی پروا کرتے ہیں وہ ہماری کتنی پروا کرتی ہے۔ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہی ہوگا۔ کیونکہ دنیا کسی کی پروا نہیں کرتی اور دنیا کے خوف کے باعث کچھ کام کرنے کے بعد آپ قرض یا مصیبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں تو دنیا کوئی مدد نہیں کرتی بلکہ زخموں پہ مزید نمک پاشی کرتی ہے تو پھر درست کاموں میں اس کی پروا کرنے کی کیا ضرورت

ہے؟ دنیا کا تو کام ہے باتیں کرنا، اسے باتیں کرنے دیں، آخر کب تک باتیں کرے گی بالآخر چپ ہی ہو جائے گی۔

اگر آپ کا عمل اخلاق، قانون یا شریعت سے متصادم نہیں تو بے شک رواج کے خلاف ہو، ضرور کر گزریں کیونکہ غلط رواج کو ختم کرنا بھی ایک جہاد اور ثواب کا کام ہے جس کے لئے بڑے دل گردے کی ضرورت ہے لیکن اگر کام اخلاق، قانون یا شریعت کے خلاف ہے تو بظاہر کتنا ہی اچھا ہو اسے کبھی نہ کریں۔ اس سلسلے میں دنیا کی ہی نہیں دین کی پروا کرنی بھی ضروری ہے ورنہ کئی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں مثلاً اسلام میں عدل کی شرط پر ضرورت اور استطاعت کے مطابق ایک سے زائد چار تک شادیوں کی مرد کو اجازت ہے مگر معاشرہ ہندو اثرات کے تحت اسے پسند نہیں کرتا خصوصاً پہلی بیوی کی موجودگی میں کوئی اپنی کنواری مطلقہ یا بیوہ لڑکی بھی دینے کو تیار نہیں۔ رہ گئیں بیویاں تو ان کا دل تو عموماً بڑا ہوتا ہی نہیں کہ اس سلسلے میں مرد کے ساتھ تعاون کریں نتیجتاً ناجائز تعلقات استوار ہوتے ہیں اور زیادہ بُرے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔

کے ایچ مجاہد

سرِورق کی کہانی

لکھتے رہے جنوں کی حکایت!

تجارتی صحافت و معاملات میں تو کلمۂ حق کا تصور ہی کھوتا جا رہا ہے۔صرف ایک آندھی ہے، جس میں کرنسی نوٹ آزو بازو اُڑتے پھرتے ہیں اور لوگ پاگلوں کی طرح ان پر لپک رہے ہیں۔تاہم آندھی زیادہ سے زیادہ ایک پہر کی ہوتی ہے مگر ہوا ہمیشہ موجود رہتی ہے۔انسانیت کو آندھی نہیں، ہوا کی ضرورت رہی ہے اور رہے گی۔

☆ جابر سُلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنا بہترین جہاد ہے۔

○ عنایت صاحب سابق فوجی تھے۔اس کے باوجود انہوں نے دُرست کو دُرست اور غلط کو غلط کہا، حق بات میں فوجی یا جمہوری سرکار کے لیے ''لاتخسر و فی المیز ان '' کی قرآنی نص سامنے رکھی۔

☆ اب تو قُوتِ اِظہار نے صرف کمائی کی صورت اِختیار کر لی ہے اور کمائی کے راستے ہی برتی ہو گئے ہیں۔

○ اگر تم حق کے لئے لڑتے ہو تو ابھی بھی لڑو، اگر دُنیا طلبی کے لیے لڑتے ہو تو تُم سے زیادہ بُرا کون خُدا کا بندہ ہو گا۔

☆ ہر ظالم شخص مُلک یا گروہ کو فطرت ایک مقام پر خُود ہی ہانکا کر کے شِکاری کی طرف لے آتی ہے۔

○ اِشاعتِ حق روزِ اوّل سے ہی بہت مُشکل کام رہا ہے۔اس میں سر قلم ہوتے ہیں، ہاتھ قلم ہوتے ہیں۔

++*+*+*+*+*+*+*+*+*+*+*+*+*+*+*+*+*

لکھتے رہے جنوں کی حکایت خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

حق

حق لکھنا اور کہنا یعنی اشاعتِ حق روزِ اوّل سے ہی بہت مُشکل کام رہا ہے۔

یہ ۱۹۸۰ء کے عشرے کی بات ہے، مُلک میں بم دھماکا ہوا اور متعدد بے گناہ افراد اپنی جان کی بازی ہار گئے۔صدر جرنیل ضیاء الحق نے کہا، ہم اس طرح کے اور بھی بم دھماکے برداشت کر سکتے ہیں۔عنایت صاحب نے حکایت میں لکھا کہ صدر صاحب اس طرح کے دو تین دھماکے آپ کے گھر کے سامنے ہوں تو پتا چلے کہ آپ کتنے دھماکے برداشت کر سکتے ہیں۔

اسی طرح ایک بار جب ہر شعبہ ہائے حیات میں فوج عبث گھس رہی تھی تو انہوں نے عسکری قیادت کو مخاطب کرتے ہوئے اداریہ لکھا کہ ٹھیک ہے آپ ملک کے دیگر اندرونی معاملات دیکھیں، رات کو مُلک کی بیرونی حفاظت کے لیے، سرحدی دیہات کے عوام خود ہی ٹھیکری پہرے کا انتظام کر لیں گے۔

جب ہماری فوج نے ۱۹۶۵ء میں بہادری کی داستانیں رقم کیں تو عنایت صاحب نے بھی ان پر متعدد کُتب تحریر کیں اور خاص نمبر بھی شائع کیے۔ ۱۹۷۱ء کے بعد عنایت صاحب بہت دل گرفتہ ہوئے۔اس سلسلے میں مجھے ان کی ایک کہانی ''قسم اس لہو کی'' یاد آ رہی ہے۔اس سانحے کے بعد جب فوج ذہنی پڑ گئی تو عنایت صاحب نے مصور سے ماہ نامہ حکایت کا ایک سرِورق تیار کرایا۔فوجی بھائی سڑک کنارے اپنا جوتا ڈھیلا کر کے بیٹھا تھا۔اُس نے اپنی بندوق، گھڑی، ٹوپی اور پیٹی اُتار کے، فُٹ پاتھ پر ایک طرف رکھی ہوئی تھی۔وہ آرام سے تمباکو پی رہا تھا۔

عنایت صاحب کی فوج سے کوئی دُشمنی نہ تھی۔وہ تو خود سابق فوجی تھے۔عسکری حلقوں میں اُن کا نام اب بھی بڑی چاہت سے لیا جاتا ہے کہ ہمارا فوجی بہت بڑا لکھاڑی تھا۔اس کے باوجود انہوں نے دُرست کو دُرست اور غلط کو غلط کہا، حق بات میں فوجی یا جمہوری سرکار کے لیے ''لاتخسرو فی المیزان'' کی قرآنی نص سامنے رکھی۔اسی لیے ایک تحریک کی حمایت پر، حکومت نے اُنہیں دو سال جیل میں بھی بند رکھا۔ اُنہوں نے وہاں مجرموں کی عمیق نفسیات کا مطالعہ کیا۔

یہ بہت جرأتِ رندانہ کی باتیں ہے جو عنایت صاحب نے کہیں اور کیں۔یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ماہ نامہ حکایت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سرکاری سرپرستی سے محروم ہو گیا ہے۔مسلسل سرکاری اِشتہارات اور کاغذ وغیرہ اُن جرائد کو ملتا ہے، جو ناز برداری کرتے ہیں۔

قرآن امرِ حیات کے لیے حق بات کی توثیق کرتا ہے۔ظاہر ہے، جنت کوئی عوامی سیر گاہ تو نہیں کہ سب اس میں بے تکان گھس جائیں۔جنت کے امرِ سکون کی باقاعدہ قیمت ہے۔سورۃ العصر میں ارشاد ہے: ''قسم ہے زمانے کی (قسم ہے نمازِ عصر کی......بے شک انسان خسارے میں ہے۔مگر وہ لوگ نہیں، جو ایمان لائے اور نیک کام کیے اور حق بات پر قائم رہنے اور صبر کرنے کی تلقین کرتے رہے۔''

اسی طرح حدیث نبوی ہے: جابر سُلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنا بہترین جہاد ہے۔

مگر حق بات کا پرچار کبھی بھی، کسی بھی دور میں سہل نہیں رہا۔لاریب انبیاؑ بھی حق گوئی پر معتوب و مصلوب ہوئے۔حق دُشمنی میں بیٹے کنعان نے بھی حضرت نوحؑ کا ساتھ چھوڑا اور مارا گیا جب کہ اُن کا ساتھ دینے والے بیٹے سیلابِ بلا سے مامون رہے۔حضرت زکریاؑ کو آرے سے دو لخت کر دیا گیا تھا۔حضرت صالحؑ کے ساتھ قومِ ثمود نے کیا سلوک کیا

وہاں کی ایک فاحشہ نے اپنے آشنا سے کہا کہ اُن کی اونٹنی کو گھائل کر دے اور اُس نے ایسا ہی کیا۔ شام کے شہر سدوم میں حضرت لُوطؑ نے حق کا علَم بُلند کیا مگر ان کی بیوی نے اپنی بدکردار قوم کے لیے درد کھایا اور ماری گئی۔ حضرت ابراہیمؑ کو کلمۂ حق کے سبب، آگ کے الاؤ میں ڈال دیا گیا تھا۔

اس سے اگلے دور میں خاتم النبیین رسول اللہ ﷺ نے حق گوئی کے لیے ہی برس ہا اذیتیں برداشت کیں اور شعبِ ابی طالب میں اپنے ساتھیوں سمیت بھُوک پیاس اور حد بندی جھیلی۔ نبی پاک ﷺ کو کتنی بار غزوات میں سے گزرنا پڑا۔ اہالیانِ طائف نے بھی ان پر حملہ کیا۔ حضرت بلالؓ اگر اللہ کے ایک ہونے سے منحرف ہو جاتے تو کفار انہیں امن بخشتے مگر انہیں ہر طرح کی سخت تکالیف دی گئیں۔ وہ گرم ریت میں جھلستے رہے، کفار کے لونڈے لپاڑے انہیں گلے میں رسی باندھ کر گلیوں میں گھسیٹتے رہے۔ وہ دُرّے کھاتے رہے مگر احد، احد کہتے رہے۔ حضرت ابُو جندلؓ نے اِسلام قبول کیا تو ان کا رئیس باپ سہیل بن عمرو بھی ان کا سب سے بڑا دُشمن بنا۔ اُن کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر کئی سال قید کیا گیا۔

تواریخ کی زیادہ بڑی نہیں، محض مولانا مودودی کی ''خلافت و ملوکیت'' ہی پڑھ لیں تو پیروں تلے سے زمین نکل جاتی ہے۔ کیا اُموی خاندان اور کیا عباسی خاندان، تاریخ کے ہر پنّے پر حق پرور کا لہو ہی بہتا نظر آتا ہے۔ حجاج بن یُوسف جیسا درندہ عمائے خُون سے تر کرتا جا رہا تھا۔ عبداللہ بن زبیرؓ نے خارجیوں کا قلع قمع کیا تھا۔ جب عبداللہ بن زبیرؓ کے سامنے حجاج آیا تو اُن کا محاصرہ بہت طویل کر دیا گیا۔ وہ کم زور تھے، عاجز آ گئے۔ وہ اپنی والدہ محترمہ حضرت اسماءؓ کے سامنے حاضر ہوئے اور کہا، اب تو میرے بیٹے بھی میرا ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔ آپ کا مشورہ درکار ہے کہ کیا کروں؟

وہ جناب صدیقؓ کی بیٹی تھیں، بولیں، بیٹا! اگر تم حق کے لیے لڑتے ہو تو ابھی بھی لڑو، اگر دُنیا طلبی کے لیے لڑتے ہو تو تم سے زیادہ بُرا کون اللہ کا بندہ ہو گا۔

عبداللہ بن زبیرؓ نے ولولے سے شہادت پائی اور حجاج نے اُن کا جسدِ خاکی سرِ راہ بلندی پر لٹکا دیا۔ حضرت اسماءؓ تین دِن بعد وہاں سے گزریں تو کہا، یہ سوار ابھی اپنی سواری سے نہیں اُترا۔

اِمام ابُو حنیفہؒ کی فقہی دانست سے کون واقف نہیں۔ سُنّی ہی نہیں، شیعوں کا بھی ایک وسیع حلقہ اُن کا معترف ہے۔ بادشاہ اِمام ابُو حنیفہ کو قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز کر کے اُن سے اپنی حمایت کے فتاویٰ لکھوانا چاہتا تھا۔ انہوں نے یہ عہدہ لینے سے معذوری ظاہر کی کہ میں اس قابل کہاں۔ بادشاہ نے کہا، آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ اِمام صاحب نے کہا، آپ نے مجھے جھوٹا قرار دیا تو کسی جھوٹے کو اس عہدہ پہ ہرگز فائز نہ کریں۔ ایک روایت کے مطابق، بادشاہ نے اُن پر جلاد مقرر کر دیا جو روزانہ اُنہیں دس کوڑے مارتا تھا۔ دُوسری اور معروف روایت کے مطابق، بادشاہ نے اِمام صاحب کو زندان میں ڈال دیا۔ وہ وہاں بھی تدریس میں مصروف رہے تو اُنہیں زہر دے دیا گیا۔ اُن کی حالت خراب ہوئی تو وہ زہر خورانی کا راز پا گئے۔ اُنہوں نے سجدہ ریز ہو کر جان دے دی۔

شیخ احمد سرہندیؒ المعروف حضرت مجدد الف ثانی نے ہمیشہ جلال الدین اکبر کے آزاد خیال مذہب ''دینِ الٰہی'' کی مخالفت کی اور انہیں جہاں گیر کو سجدہ نہ کرنے پر، قلعہ گوالیار میں قید کیا گیا مگر انہوں نے وہاں بھی کئی غیر مسلمین کو مُشرف بہ اِسلام کیا۔

ع اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رُوباہی

حق پروری پر دُنیا کا وسیع حلقہ آپ کے خلاف ہو رہے گا۔ یہ ہمیشہ ذہن نشین رہے۔ اسلام کے متعلق فلم "فتنہ" پیش کی گئی تو کئی ممالک میں متشدد غیر مسلمین کا شدید ردِعمل ظاہر ہوا۔ فلمی تقسیم کار کو دھمکیاں دی گئیں اور سینیماز جلائے گئے۔ اکتوبر ۲۰۱۸ء میں اِستنبول کے سعودی قونصل خانے میں ایک حق گو عربی صحافی مارا گیا تھا اور اِلزام آلِ سعود پر رہا تھا۔ اگر فرداً فرداً اپنے صحافیوں کا ذِکر کیا جائے تو رسالے کے سارے صفحات بھر جائیں گے۔

عظیم معلم و فلسفی سقراط کو زہر کا پیالہ آخر اسی لیے پلایا گیا تھا کہ وہ دیوتاؤں کی نفی کا وجدان پا گیا تھا اور اس کا اظہار بھی کررہا تھا۔ جب کہ یُونان میں دیوتاؤں کی آڑ میں مالی، ذہنی اور جنسی بُرائیوں کا چلن تھا۔ وہ سقراط کو کیسے برداشت کر سکتے تھے؟ عالمی مصنف آسکر وائلڈ کو ایک بار جیل میں ڈال دیا گیا۔ آسکر نے لکھا، "ٹائم ڈزناٹ پاس اِن دا جیل بٹ ریولوز" کہ جیل میں وقت گزرتا نہیں بلکہ گول گھومتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی چوں کہ مساوات کا نعرہ بلند کرتے تھے تو پاکستانی حکومت میں موجود وڈیرے اور صنعت کار اُنہیں اپنے لیے خطرہ خیال کرتے تھے۔ تب اُنہیں پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت چھ ماہ کے لیے جیل میں قید کیا گیا۔ جب تسلی نہ ہوئی تو پھر اگلی بار دو سال کی قید دی گئی۔ مزدور افسانہ نگار قمر یورش نے اپنے اِنتقال سے چند ماہ پہلے مجھے بتایا تھا کہ اُنہیں دولت کی منصفانہ تقسیم کے مطالبے پر جیل میں رکھا گیا تھا اور مار مار کے اُن کا بازو توڑ دیا جو مستقل ٹیڑھا ہو رہا۔

خاتون اداکار صبا حمید کے والد حمید اختر تھے۔ اُنہیں پاکستان بنتے ہی باغی مصنف قرار دے کر دھرلیا گیا اور قید تنہائی میں رکھا گیا۔ شاعر ریاض الرحمان ساغر کو بھی حق بات پر قید کیا تو وہ لکھتے ہیں کہ رات کو جیل کے اہل کار چیخ چیخ کر ایک دوسرے کو "سب اچھا" کا روایتی کاشن دیتے۔ تب میرا دِل چاہتا کہ اُنہیں کہوں، سب اچھا بالکل بھی نہیں۔

اسی طرح حسرت موہانی کئی بار اپنے قلم کی بدولت جیل گئے، انگریز سرکار اُن کا نظریہ آزادیٔ ہند پسند نہ کرتی۔

ہے مشقِ سُخن جاری چکی کی مشقت بھی
اِک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

بے شک اشاعتِ حق روزِ اوّل سے ہی بہت مُشکل کام رہا ہے۔ اس میں سر قلم ہوتے ہیں، ہاتھ قلم ہوتے ہیں۔ بادشاہ نے محل کا دیدہ زیب نقشہ بنوایا اور ماہرِ تعمیرات کو ہیرے گہنے عنایت کرنے کے بعد اُس بے چارے کے ہاتھ بھی قلم کرادیے کہ یہ دُنیا میں میرے مقابل کسی اور محل کا نقشہ اس سے بڑھ کر، وضع نہ کردے۔

پتھر تراش کر نہ بنا تاج ایک نیا
فن کار کی زمانے میں کٹتی ہیں اُنگلیاں

اب تو قُوتِ اِظہار نے صرف کمائی کی صورت اختیار کرلی ہے اور کمائی کے راستے ہی برتی ہو گئے ہیں۔ خواتین کے مسالے دار رومانوی ناولوں نے ویب سائٹس کا رُوپ دھار لیا ہے۔ بعد ازاں یہ ناول یا ان سے مشابہ افسانے ٹی وی ڈراما بن جاتے ہیں، سراسر معاشقے اور ناجائز تعلقات ہی دِکھائے جارہے ہیں۔ ہیجان خیز مناظر اور بھڑکیلے مکالمات کا چٹخارا...... چست اور ننگا لباس عام دِکھایا جا رہا ہے۔ ایک لڑکی کے دو دو شوہر اور تین چار دوست ہیں...... سالی اپنے بہنوئی کو پھانس چکی ہے اور چچی نے بھتیجے پر زین کس رکھی ہے۔ کراچی کے ٹی وی سیکٹر سے کچے ذہن کی لڑکیوں کو یہ کیا اخلاق سِکھایا جا رہا ہے؟

کیا کسی شہ مات کا اِنتظار ہے؟

اسی طرح ٹک ٹاک ڈانسر سٹار ہر کلک پر پیسے کماتی ہے۔ بھارت چلے جائیں۔ وہاں ٹی وی پر، گانے بجانے اور ناچنے کے سویل مقابلے ہوتے ہیں، ان سے بھی ڈالر ملتے ہیں۔ پاکستان کی ایک خاتون اداکارہ نے ٹی وی شو بگ باس کے سیزن سے نہ جانے کتنا مال کمایا ہوگا۔ غیر ملکی معتبر اخبارات کے مطابق، طویل ڈیپ سیریز میں عریانی اور جرائم کی انتہا ہو چکی ہے۔ ہمارے ہاں نیز طرار افراد کلرفل ٹیک ٹائی لگا کر ہوٹل جاتے ہیں اور حضرت لقمانؑ، یونانی و یورپی فلاسفہ، ڈیل کارنیگی نیز واصف علی واصف کے اقوالِ زریں سُنا کر کامیابی، روزگار، تعلقاتِ عامہ اور مسرت کے موٹی ویشنل لیکچر سے لاکھوں روپے کماتے ہیں۔ کوئی بھی جماعت یا فرد دو ارب روپے دے اور ایک خبر یا ٹی وی چینل چار سالہ اندھی حمایت کے لیے خرید لے۔ تجارتی صحافت و معاملات میں تو کلمۂ حق کا تصور ہی کھوتا جا رہا ہے۔ صرف ایک آندھی ہے، جس میں کرنسی نوٹ آزو بازو اُڑتے پھرتے ہیں اور لوگ پاگلوں کی طرح ان پر لپک رہے ہیں۔ تاہم آندھی زیادہ سے زیادہ ایک پہر کی ہوتی ہے مگر ہوا ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ انسانیت کو آندھی نہیں، ہوا کی ضرورت رہی ہے اور رہے گی۔

یونس حسرت نے میری آٹو گراف بک پر لکھا تھا، زمانے کے دھارے کے مخالف تیرنے والوں کو لوگ جنونی کہتے ہیں مگر زمانے کا دھارا بدلنے والے ایسے ہی جنونی ہوتے ہیں۔ جو بھی سچ کا دامن تھامے گا، ظاہر ہے اسے دنیاوی نقصان کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔ میرزا غالب نے اسی لیے کہا ہے کہ بے خوف مردجنوں کی حکایتِ خونِ چکاں لکھتے رہتے ہیں۔ ہر

چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے۔

ایک مردِ حق کو جب بستی والوں نے آگ میں ڈالا تو ایک پرندہ چونچ بھر بھر کے آگ پر پانی ڈالنے لگا۔ کسی نے کہا کہ تیرے ان چند قطروں سے ایسی آگ نہ بجھے گی۔ پرندہ بولا، میں جانتا ہوں مگر میں مردِ حق کا ساتھ دے رہا ہوں۔ اسی طرح ایک نابینا بُوڑھے نے رات کو راستے میں لالٹین تھام رکھی تھی۔ کسی نے کہا، آپ تو روشنی سے بھی نہیں دیکھ سکتے۔ جواب ملا، بے شک میری آنکھیں بے نُور ہیں مگر میں دُوسروں کو راستہ دِکھاتا جا رہا ہوں۔

تاریخ گواہ ہے... ہر ظالم شخص، مُلک یا گروہ کو فطرت ایک مقام پر خُود ہی ہانکا کر کے شِکاری کی طرف لے آتی ہے۔ پس ہمارا فرض ہے، حق بات پر پہرا دینا اور اپنے حصے کا چراغ جلانا۔ رات کی ظلمت اپنی جگہ اور ہماری کاوش اپنی جگہ۔ اپنے حصے کا پانی آگ پر پھینکنا ہے اور دُوسروں کے لیے لالٹین بھی تھامنی ہے۔

اِمام عالی مقام حضرت حُسینؓ یہ جانتے تھے کہ وہ چند الفاظ کی بیعت سے دُنیاوی سکون پا سکتے ہیں مگر اُنھوں نے کلمۂ حق کی خاطر ایسا نہ کیا اور خانوادۂ رسولﷺ کی شہادت کے بعد، عین جنگ میں بھی نمازِ عصر کے لیے سر جھکا دیا اور چند روزہ دُنیاوی حشمت کے لیے اُن کا سر تن سے جُدا کر دیا گیا۔ ایک روایت کے مطابق، بعد از واقعہ کربلا، نوے سال تک اس موضوع پر تاریخ لکھنے سے سرکاری طور پر روک دیا گیا تھا کہ حق بات سامنے نہ آئے۔ لاریب تاریخ میں اس حق پروری کی مثال نہیں ملتی۔

ع نِکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری

❁❁❁

خطوط و خیال

یہ کالم قارئین کے خطوط اور آراء سے ترتیب دیا جاتا ہے اور ایڈیٹر کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ اب قارئین اپنی آراء بذریعہ SMS بھی بھجوا سکتے ہیں۔ (ادارہ)

لازوال کہانی

برادرم عارف محمود صاحب، السلام علیکم! جون کا شمارہ جولائی کے پہلے ہفتے موصول ہوا۔ کوئی بات نہیں حالات ہی ایسے ہیں لیکن دوسرے ڈائجسٹ پرچوں کی طرح آپ نے ٹائٹل پر مئی جون جولائی یا جون جولائی اکٹھا تو نہیں لکھا۔ ٹائٹل کے چناؤ نے بے حد متاثر کیا۔ اب بھائی محمد مشہود صاحب ٹائٹل مضمون کی کمی کو خوب پورا کر رہے ہیں۔ ان کا "بے یقینی کی بھول بھلیاں اور عوام" پر تجزیہ بھی شاندار ہے۔ اداریے دونوں کاٹ دار در حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔ دستگیر شہزاد صاحب اور شیخ مجاہد صاحب نے زبردست نشتر زنی کی ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

ڈاکٹر مبشر حسین ملک صاحب کی "جسموں پر جانیں" دردناک اور شرمناک حقائق پر مبنی ایک لازوال تحریر ہے۔ ان کی تحریر میں افسانے سے زیادہ حقیقت کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ منظر نگاری ان کی تحریر کی اضافی خوبی ہے۔ بامقصد اور سبق آموز تحریریں دے رہے ہیں۔ جذبات میں ہلچل مچانے پر ڈاکٹر صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں۔ میرے نیک جذبات قبول کریں۔

"شریف پورے کا پونگی" ایسا بھی ہوتا ہے، مقدر کا شاکی، خواب، جب ماں بیوہ ہوئی، موت کا بوسہ عمدہ ہی نہیں بہت عمدہ تحریریں ہیں۔

محترم ریاض عاقب کوہلر صاحب کے نئے سلسلہ وار ناول "لاڈورانی" کی پہلی قسط کی اٹھان، بنیاد اور تانا بانا انتہائی مضبوط ہے جبکہ ناول "بردہ" کی پندرہویں قسط بھی تہلکہ خیز ہے۔ سسپنس، تجسس میں مزید اضافہ ہوا۔ ملکہ قتیلہ اپنے عاشقوں اور دشمنوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہی ہے۔ بڑا زبردست کردار ہے۔ محمد رضوان قیوم صاحب کی پُراسرار کہانی، "ادھوری محبت" کے واقعات اور تسلسل عروج پر ہے۔ آگے کیا کچھ ہونے والا ہے کہانی کون سا موڑ مڑے گی کچھ پتہ نہیں چل رہا۔ آخری قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ خاصی دلچسپ تحریر ہے۔

طنز و مزاح کے موضوع پر لاہور سے ''جاتے جاتے'' اور ''مغرور باتونی'' ایسی تحریریں پریشانی اور ٹینشن کے ماحول میں ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دیتی ہیں۔ حکیم مختار احمد ناز صاحب کا تجزیہ ''منگائی، کل اور آج'' میں پنجابی کے ایک شاعر نے گزشتہ دور کا نقشہ کھینچا ''نکا جیا لاہورسی'' نے تو بے حد محظوظ کیا ہے۔ واہ بھئی واہ!

''سپنے اور سراب'' لمحہ فکر ہے۔ جبکہ ''کالی زبان'' مہمان نوازی کا معیار، جوگی سانپ اور منتر، صحرائی سانپ راہِ گم گشتہ مسافر (نظم) بے حد پسند آئیں اور کافی محظوظ ہوئے۔ ''سانحہ مشرقی پاکستان'' ایک اچھی کاوش ہے۔ کمپوزنگ کی غلطیاں نہ ہونے کے برابر ہیں سوائے فہرست مضامین میں ادھوری محبت کی بجائے دھوری کہانی لکھا گیا ہے۔ قاری جی (محمد افضل رحمانی) کتھے جے؟ ہون ''پیرازادہ'' مکمل کر دیو۔

آخر میں ''اظہارِ خیال'' میں بھائی اعجاز حسین ستھار صاحب نے چوہدری اصغر علی جیدی (مرحوم) کے بارے ایک لفظ تک لکھنا گوارہ نہ کیا۔ افسوس ہے! حالانکہ اسی کالم میں دونوں کی ادبی نوک جھونک جاری رہتی تھی۔ گل سمجھوں باہر اے!

''حکایت'' کی محفل کے تمام دوستوں کو سلام!

----------- محمد صدیق۔ جنڈ والا، چونیاں

ٹائٹل پر میری تصویر

محترم عارف محمود صاحب، السلام علیکم! شمارہ جون ملا۔ میں آپ سے ناراض ہوں ... یہ آپ نے ٹائٹل پر میری تصویر لگا دی ہے۔ یقین کریں آج کل جو ذہنی حالت ہماری ہو چکی ہے یہ ٹائٹل اس کے حسبِ حال ہے۔ 85 فیصد لوگوں کی ذہنی حالت یہی ہے کہ وہ موجودہ غیر یقینی حالات کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہے ہیں اور ان کو سمجھ نہیں آ رہی کہ جانا کدھر ہے؟ کرنا کیا ہے؟ ہمارا بنے گا کیا؟

''حکایت'' کا ٹائٹل نہایت بامقصد اور منفرد ہوتا ہے۔ اس کے لئے آپ اور معظم جاوید بخاری صاحب داد کے مستحق ہیں۔ ہماری دعائیں اور نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

----------- انوار اللہ علوی۔ فیصل آباد

پُرتکلف تحریر

پیارے عارف بھائی، السلام علیکم! ''حکایت'' مل گیا اگرچہ خاصا لیٹ ملا لیکن اس کی کوئی پروا نہیں، ملتا رہنا چاہئے بے شک لیٹ سہی۔ ان حالات میں جب ہر طرف بے یقینی کے سائے منڈلا رہے ہیں ''حکایت'' کا تسلسل سے ملنا بھی غنیمت ہے جبکہ کئی ڈائجسٹ پرچے ٹائٹل پر مئی/ جون/ جولائی لکھ کر ایک پرچے سے تین ماہ بھگتا رہے ہیں۔

''لاڈو رانی'' آئی اور چھا گئی۔ لگتا ہے ریاض عاقب صاحب ایک بار پھر ہمارے اعصاب کی مضبوطی کا امتحان لیں گے۔ ڈاکٹر مبشر حسن ملک صاحب کہانی اچھی لکھتے ہیں لیکن ان سے گزارش ہے کہ سادہ اور آسان الفاظ استعمال کیا کریں۔ پُرتکلف تحریر پڑھنے والے کو تھکا دیتی ہے اور ہم لوگوں کو حالات نے پہلے تھکا رکھا ہے۔ ٹائٹل موجودہ حالات کے حسبِ حال ہے۔ ٹائٹل پرچے کی جان ہوتا ہے۔

----------- محمد طفیل قیصر۔ بحریہ ٹاؤن، راولپنڈی

شمارہ جون۔ تفصیلی نظر

محترم بھائی عارف محمود صاحب، السلام علیکم! اگر مقامی ڈاک خانہ کی سستی، لاپروائی اور دھاندلی کو درمیان سے نکال دیا جائے تو حالات کے تناظر میں پرچہ جلد مل

ہے۔ ابھی تک لوگوں کی پریشانیاں، مشکلات اور خوف دور نہیں ہوا لیکن شاید اب حالات کے ساتھ جینا سیکھ رہے ہیں۔ اسی لئے حفاظتی احکامات کو نظرانداز کر کے چہل پہل میں اضافہ ہوا ہے لیکن حالات میں بے یقینی تو ہے جس میں عوام پھنسے ہوئے ہیں۔ اس معمہ کی بھول بھلیاں دنوں میں کھلنے سے رہیں اس لئے ہم اپنے معمولات کی طرف آتے ہیں۔

محفل میں ساتھی خوب حصہ لے رہے ہیں، خوش اخلاقی سے اپنا نقطۂ نظر بیان کر رہے ہیں، کئی نئی معلومات سامنے آ رہی ہیں۔ ایسا سلسلہ گوارا ہے تاکہ آپس میں ربط رہے اور خلوص و محبت کے رشتے قائم اور بڑھتے رہیں۔ پروفیسر فلک شیر لیل، محمد ادریس انور کھوٹ اور محمد صدیق جنڈوالہ ہمارا قیمتی اثاثہ ہیں جنہیں احتیاط سے برتنا اور سنبھال کر رکھنا ہوگا۔

''شریف پورے کا پونگی'' آوارہ، ہڈ حرام اور پرلے درجے کا غیر ذمہ دار جوان تھا لیکن رگوں میں غیرت مند خون دوڑ رہا تھا یہی وجہ ہے کہ مسلمان لڑکیوں کی عزت خطرے میں دیکھی تو جان کی پروا نہ کرتے ہوئے دل کی مان کر خطرے میں کود پڑا، حالات بالکل اس کے حق میں نہ تھے، موت صاف نظر آ رہی تھی لیکن اس نے بیس سال آوارگی کا بدلہ لمحوں میں چکا کر جنت میں گھر بنا لیا اور شہید کہلایا۔ اس کی کوئی نیکی اللہ کو ایسی پسند آئی کہ زیرو سے ہیرو بن گیا۔ کسی کے ظاہری حال پر نہ جایئے، بدحال، مست اور چیتھڑے لٹکائے گلی گلی پھرتے عام فقیروں میں اللہ کے برگزیدہ بندے بھی چھپے ہوتے ہیں جو تماشہ اہل کرم جانچ رہے ہوتے ہیں۔

''مہنگائی، کل اور آج'' میں پرانی روایات اور بھائی چارے نے مزہ دیا ہے لیکن آخر میں پنجابی نظم ''نکا جیا لاہورئیں'' میلہ لوٹ لے گئی ہے۔ ''ایسا بھی ہوتا ہے'' میں جیسے چوہدری عبرت کا نشان بنا ہے۔ پڑھنے، سننے اور دیکھنے والوں کے لئے کھلا سبق ہے لیکن ہم تماشے دیکھنے کے عادی ہیں۔ واقعہ کی صحت کے مطابق لطف لیتے، افسوس کرتے اور توبہ بھی کرتے ہیں پھر زندگی کے معمولات میں پڑ کر بھول جاتے ہیں۔ ہر صبح کی ابتدا نئے جوش، جذبے، خباثتوں اور منصوبہ بندی سے کرتے ہیں اور دولت کمانے کا ہر گُر آزماتے ہیں لیکن یہاں نعیم اور خاص طور پر بلقیس کے کردار، رویے اور دنیا سے نفرت نے حیرت سے آنکھیں کھول دی ہیں۔ سکون سے بڑھ کر کیا دولت ہو سکتی ہے، اپنی مرضی سونے، جاگنے میں کتنی لذت ہے جب دولت کی فراوانی ہو تو سو طرح کے بکھیڑے ذات سے چمٹ جاتے ہیں۔ اگر بوقت ضرورت نعمتوں کے حصول کو مطمع نظر بنایا جائے تو حقیقی خوشیاں دامن میں بھری رہتی ہیں اور موج ہی موج ہے۔ مرزا شبیر بیگ ساجد کیا آئینہ لائے ہیں، ظاہری خدوخال کے ساتھ عاقبت بھی سنواری جا سکتی ہے۔

''سپنے اور سراب'' میں سارا الزام حنیف پر دیا جائے گا، خوب لعن طعن ہوگی اور ظالم، ہوس پرست کا خطاب ملے گا لیکن دوسرا پہلو بھی دیکھئے کہ بانو نے کوٹھیوں میں برتن مانجھتی، میلے غلیظ کپڑے دھوتی اور واش روم کے فرش چمکاتی ماں کی مشقت کو دیکھا نہ بوڑھے باپ کے دفتر کی میزوں کو جھاڑتے پونچھتے، پسینہ بہاتے اور بڑے لوگوں کی خوشامد کرتے جھریوں زدہ چہرے کی لاج آئی اور حیدرآباد سے ان دیکھے خیالی محبوب کی خاطر کراچی جا پہنچی، آخر حیا، عزت، غیرت، انا اور نسوانیت بھی کسی چیز کا نام ہے۔ خود کو اتنا سستا کر لیا جائے کہ تو وجود کو جسموں کی جانچ پرکھ رکھنے والے بھوکے گدھ نوچ کر ہڈیاں ہی چھوڑیں گے۔ بھلا کون تھا جو پردیس میں اس کے دکھ درد بٹاتا، حوصلہ دیتا، آنسو پونچھ کر سیدھی راہ دکھاتا، جوانی، دیوانی نے جس راہ پر ڈال دیا تھا وہ خمار اترتا تو اردگرد کی خبر ملتی۔ آنکھوں پر

خوابوں کی پٹی بندھی تھی، دنیا کی حقیقتیں دیکھنے سے کھلتی ہیں وہ حنیف کے امیرانہ ٹھاٹ باٹ، محل نما کوٹھی، کاروبار اور ٹھنڈے دفتر کے خوابناک ماحول کے نشہ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ یہ تک نہ سوچا جو جوان ہر آسائش رکھتا ہے اسے کراچی میں لڑکیوں کی کیا کمی ہے۔ بس اسے اپنے بے وقت کے خود ساختہ خواب لے ڈوبے اور حنیف کے گناہوں کی فصل بھی پک کر تیار تھی، اسے گرفت میں آنا تھا یوں دونوں انجام کو پہنچ کر نمونہ عبرت بن گئے۔ بھائی ممتاز احمد تسلسل سے حاضری اور ہماری دل بستگی کا سامان کرنے پر شکریہ قبول کریں۔

''خواب'' میں انسان کی جن فطری کمزوریوں کو اجاگر کیا گیا ہے، پڑھ، سن کر سر شرم سے جھک جاتا ہے کہ ہم کیسے جبلی خواہشات میں جانوروں کو مات دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ دولت کب تک کام آئے گی؟ قانون کی گرفت میں نہ بھی آئیں تو سو طرح کی بیماریاں ہیں، حادثات کا شکار ہو سکتے ہیں پھر یہ ٹھاٹ کس کے کام آئے گا۔ الٹی لعنتیں بھیجنے والے زیادہ ہوں گے۔ ویران قبر پر کسی نے فاتحہ پڑھنے نہیں آنا بلکہ چند دنوں بعد لوگ بھول جائیں گے اور سرے سے ساری کہانی ختم ہو جائے گی لیکن یہ مناظر دنیا اور زمین سے اوپر کے ہیں۔ قبر میں یہ امتحان، حساب اور احتساب شروع ہوگا کہ دیکھنے والی آنکھ ہوتی تو جیتے جاگتے وجود ہوش کھو بیٹھتے۔ اب قبر کے مکین کی حالت کا اندازہ کر لیجئے کہ بھڑکتی آگ میں مرغن غذاؤں اور شوق سے پالے گوشت کے جلنے، پگھلنے اور کوئلہ بننے کا کیسا ہولناک منظر ہوگا۔ جب ہمیں احادیث، علماء کی تفاسیر، تقاریر اور قرآنی آیات میں تنبیہ کر دی گئی ہے، ہر بات انگلی پکڑ کر سمجھائی گئی ہے، ڈرایا، دھمکایا گیا ہے اور انسانیت کے تقاضے کھول کر بتائے گئے ہیں تو اسے سمجھنے میں ہماری عقل بانجھ کیوں ہو جاتی ہے۔ شاید ہمیں دکھنے والی لذتیں، سہولیات اور عیاشیاں چین سے بیٹھنے نہیں دیتیں۔ یوں ہم ادھر تو کامیاب ٹھہرتے ہیں لیکن آخرت کا عذاب گلے میں من پسند، خوبصورت اور قیمتی ہار کی طرح ڈال لیتے ہیں۔ ہمیں خود کو سمجھانا، سنوارنا ہوگا۔ کب تک فیصل ندیم جیسے سپوت ہمیں نجات دلاتے رہیں گے۔ دوسروں کی قربانیوں سے پہلے اپنی ذمہ داریاں محسوس کرنے کی ضرورت ہے یوں دوسروں کے ساتھ اپنا بھلا بھی یقینی ہے۔

سیدہ شاہدہ شاہ نے کمال ہنرمندی سے طویل بکھرے واقعات کو ایک لڑی میں پرو کر پوری انسانیت کو بھلائی کی ترغیب دی ہے۔ اللہ آپ کو اس نیک عمل کا اجر دے گا، بس دامن پھیلائے رکھئے۔

''لاڈورانی'' میں محمود برے پھنسے ہیں، دعا کا جیسا مزاج بن گیا ہے یہ انا، خودسری اور ہٹ دھرمی ایک نہیں کئی سانحات کو جنم دے سکتی ہے جس میں گھر اجڑ سکتے ہیں، دل ٹوٹنے کا حادثہ ہو سکتا ہے، خوابوں کی تعبیریں الٹ ہو کر پانی میں آگ لگا سکتی ہیں اور بڑی منتوں، مرادوں سے جڑے بندھن کانچ کی چوڑی کی طرح ٹوٹ کر جسم زخمی بھی کر سکتے ہیں۔ عمارہ، بریرہ شاید ہی شہر سدھار سکیں۔ دعا اب آکاس بیل کی صورت اختیار کر چکی ہے جو پھول، پھل اور سبز پتوں کو ایسے ہڑپ کرے گی کہ کسی دوسرے ذی نفس کے بسیرا کرنے کی گنجائش نہ نکلے گی۔ مجھے ابھی سے خطرے کی بو آ رہی ہے اور یہ بھی دور کی بات نہیں کہ کسی جذباتی حرکت کے نتیجہ میں آگے چل کر محمود اپنا مقام، مرتبہ، عزت اور وقار کھو بیٹھے اور نمک حرام کہلانے کے ساتھ پچھتاووں میں جلنا پڑے، جب کہانی کا سارا بوجھ دعا پر ڈال دیا گیا ہے تو لاڈورانی پٹاخہ کی صورت ضرور چونکا دے گی۔ ریاض عاقب کوہلر صاحب ماحول، کرداروں، رویے، ترجیحات، مزاج اور عادات کے علاوہ پورے وسیب کو ساتھ لے کر چلے ہیں۔ وہ ہلکے پھلکے انداز میں دھماکہ خیز نتائج کے حامل واقعات

بھی روشناس کراتے ہیں۔ ابھی طویل سفر ہے، دیکھنا ہے کتنی مشکلات رکاوٹ ہوں لیکن یہ بات طے ہے کہ خوب نبھے گی۔

''جوگی، سانپ اور منتر'' میں جوگیوں کے روایتی قصے، کمالات اور مہربان ہونے کے بدلے سوغات دینے کی پرانی باتیں ہیں ان میں کتنا سچ اور زیبِ داستاں کے لئے کیا کچھ شامل کیا گیا ہے۔ یہ سب سنانے کے لئے پرانے لوگ نہیں رہے لیکن خوف و دہشت کی علامت سانپ موجود ہیں۔ ہمارا علاقہ صحرائی ہے یہاں کھیتوں میں سانپ عام ہیں البتہ زہریلی نسل کم ہے۔ سال میں ایک آدھ بار جوگیوں کا پھیرا بھی ہو جاتا ہے لیکن لوگ ان کی کسی بات پر اعتبار کرتے ہیں نہ دوائی خریدتے ہیں۔ البتہ مہمان کی طرح چائے، پانی اور روٹی ضرور پیش کرتے اور پرانا وقت یاد کرتے ہیں لیکن وہ وقت لوٹ کر نہیں آئے گا بس آہیں بھری جا سکتی ہیں۔

''جسموں پر جانیں'' کاشی کی لازوال، طویل اور دکھی کر دینے والی روئیداد ہے۔ وہ کتنی سادہ، معصوم اور اپنے وسائل میں مطمئن رہنے والی لڑکی تھی۔ سوچیں محدود تھیں لیکن حسن پرست نگاہوں نے اُڑان بھرنے پر اکسایا تو نادانی میں وہ اَن دیکھے دیس کی سیر کو نکل کھڑی ہوئی لیکن یہاں سراہنے، داد دینے اور نظارے قید کرنے والوں کی بجائے پر نوچنے اور بال کھینچنے والوں سے سامنا ہوا جو ہر روز انڈے کا انتظار کرنے کی زحمت نہ اٹھانا چاہتے تھے بلکہ مرغی ذبح کرنے کے درپے تھے یوں اس کا تڑپنا، سسکنا اور پروں سے ماتم کرنا کسی کو دکھائی نہ دیا اور وجود ہوبہو ہو گیا۔ اگر اسے پُرخلوص لوگ ملے تو پہچان سکی نہ قدر کر سکی۔ اگر آنے والے دنوں کا لائحہ عمل ترتیب دیتی تو ڈھنگ سے نیا گھر بسا لیتی شاید مخلص ساتھیوں کی نہ رہی اور کٹی پتنگ کی طرح مختلف فضاؤں میں ڈولتی، بھٹکتی رہی۔ جس کی دسترس میں آئی محض لوٹ کے مال کا

حشر ہوا۔ ہر موقع محل پر مقدر نے شکست فاش دی بس ایک غلط قدم کیا اٹھا کہ منزل ہی کھوٹی ہو گئی۔ اب اس کے لوٹ آنے کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی، یہ دبی بلکہ بجھی چنگاریوں کو ہوا دینے والی بات ہے۔ کتنی باتیں، کہانیاں اور انکشافات نے ماحول کو گرمایا اور لواحقین کا سر جھکایا ہوگا۔ البتہ اس کی کہانی سے علاقہ کی لڑکی باغیانہ سوچیں ذہن سے نکال پھینکے تو جانئے نقصان کا احساس کم ہو جائے گا اور ڈاکٹر مبشر حسن ملک نے راتیں جاگ کر آنکھیں جلائی ہیں اس پر پیچھے مڑتے قدموں اور پچھتاوے میں بہتے آنسوؤں سے ٹھنڈی پھوار پڑ کر دل و ذہن میں طمانیت بھر دے گی۔

''جب ماں بیوہ ہوئی'' میں جو پڑوسی مرد ملے سب فرشتہ صفت تھے وگرنہ بیوہ عورت اور جوان بیٹیوں کو زندہ نگلنے کے لئے سب درندے کی شکل بدل لیتے ہیں پھر جب شباب کے ساتھ دنیاوی اسباب و مال بھی ہو تو درندگی اور ناانصافی عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ شاید یہاں کوئی نیکی کام آ گئی کہ قدرت نے ہر موقع پر عزت بچائی اور رسوا نہ ہونے دیا وگرنہ کئی شکاری مورچہ سنبھال کر کمزوری کی تلاش میں رہتے اور سالم نگلنے کی کوشش کرتے۔ جو معاون و مددگار رہے انہیں اللہ کی ذات صلہ دے گی۔ یہ خود بھی جب وقت ساتھ دے تو فرصت میں شکر کا سجدہ کرتی رہیں۔ محترم محمد ادریس انور کھوٹ ایک راستے پر چل نکلے ہیں۔ جذبات اور خیالات کاغذ پر بکھیر کر قارئین کی عدالت میں آ کر داد و تحسین سمیٹیں گے تو انہیں اطمینان ہوگا۔

''موت کا بوسہ'' انسانی عقل سے ماورا واقعات ہیں اسے معجزہ کہیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ جیسے ٹرالی کو عین وقت پر افراتفری میں پٹری سے ہٹانے کی کوشش کی گئی اس کی دماغ میں کوئی وضاحت ہے نہ توجیہ پیش کی جا سکتی ہے۔ بس کوئی ایسا ہاتھ اور طاقت تھی جس نے سارا کام

انجام دلا دیا اور پانچ انسانی جانیں بے گناہ لقمہ اجل بننے سے بچ گئیں۔ اس کھوج کو بے نتیجہ چھوڑ دینے میں ہی عافیت ہے لیکن یہاں نسیم سکینہ صدف کی کوشش اور انتخاب کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔

''صحرائی سانپ'' خطرناک پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ میرا کئی بار آبادی سے باہر سانپ سے سامنا ہوا ہے، سچی بات ہے وہ چھوٹا ہو یا کم زہریلا، محض چوہے نگلنے والا کسان دوست ہو لیکن قدموں میں جان رہتی ہے نہ دماغ کوئی فیصلہ کرنے یا رہنمائی کے قابل رہتا ہے۔ واقعات میں تسلسل اور دلچسپی کا وافر مواد موجود ہے۔ محمد نذیر ملک مختصر آئے لیکن خوب آئے اور ایک تاثر چھوڑ گئے ہیں۔

------------ اعجاز حسین سٹھار۔ نور پور تھل

سرِ ورق پسند نہیں آیا

السلام علیکم! امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔ 2 جولائی کو جب آپ کا میسج موصول ہوا کہ پرچہ 30 کو پوسٹ ہو چکا ہے، تو اسی وقت شدید گرمی میں بک سٹال کی طرف بھاگا۔ یہ خدشہ لاحق ہوا کہ لاہور سے روانہ شدہ رجسٹری بھی نہ ملے اور لوکل مارکیٹ سے ''حکایت'' ختم ہو جائے۔ وہی بات نہ ہو جائے

نہ خدا ملا نہ وصالِ صنم
نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

گھر آ کر جو پرچہ کھول کر دیکھا تو صفحہ 197 پر اپنے نام کا پوسٹ مارٹم دیکھ کر تلملا اٹھا۔ جی چاہا کچھ کر دوں مگر پھر اس خیال سے صبر کے پانچ سات گھونٹ پی کر شانت ہو گیا کہ بھائی اعجاز سٹھار اور صدیق بھائی تو شمشیر بے نیام لے کر مجھ پر چڑھ دوڑیں گے۔ کچھ نہ کر سکا۔ ''اور ہم چپ ہی رہے''۔

3 جولائی کو جی پی او والوں پر غصہ نکالنے کو بے نیام چڑھ دوڑا۔ اپنے حق کی خاطر جہاد فرض ہے۔ میں یہ فرض پورا کرنے بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی کے فارمولے کے تحت جی پی او پر حملہ آور ہو گیا۔ بیرونی گیٹ پر متعلقہ پوسٹ مین مسکراتا ہوا مل گیا اور اپنے بنڈل سے ''حکایت'' نکال کر مجھے تھما دیا۔ سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

عارف بھائی! اگر بُرا نہ مانیں تو عرض کروں (مجھے پتہ ہے آپ بے حد کول مائنڈڈ ہیں) اس مرتبہ سرِ ورق بالکل پسند نہیں آیا۔

(حالانکہ اس ماہ سرورق بہت پسند کیا گیا۔ مدیر)

میری تحریر ''داستانِ مرزا صاحباں'' پر اعجاز بھائی کی خاموشی حیران کن ہے۔

محترم بھائی! آپ کو میں نے آف دی ریکارڈ ایک پیشکش کی تھی مگر آپ نے نہ تو آف دی ریکارڈ اور نہ ہی آن دی ریکارڈ اس پیشکش کا جواب دیا۔ دلہن کی خاموشی رضامندی جبکہ مرد کی خاموشی انکار کے زمرے میں آتی ہے۔ ٹھیک ہے اگر آپ کو نہیں منظور تو آپ کی مرضی۔ جواب دینا تو اخلاقی فرض بنتا ہے۔

آئندہ سال کے لئے ''حکایت'' کا چندہ/ ہدیہ ارسالِ خدمت ہے، ملنے پر مطلع کیجئے گا۔

------------ محمد ادریس انور کھوٹ۔ چکوال

☆... ادریس بھائی! نام کا دھڑن تختہ کرنے پر کمپوزر صاحب کو الرٹ کر دیا گیا ہے کہ وہ کمپوزنگ کرتے وقت اونگھنا چھوڑ دیں ورنہ کوئی بڑا فساد بھی کھڑا ہو سکتا ہے۔ جہاں تک آپ کی پیشکش کا سوال ہے تو اس کے ایک ایک لفظ سے خلوص ٹپک رہا ہے۔ دراصل میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پا رہا تھا۔ بہرحال ''قبول ہے...... قبول ہے...... قبول ہے''۔ شکریہ! (مدیر)

دین ودنیا

صحابہؓ کا ایمان

اگر تم نے ان صحابہ ابوبکر، عمر، عثمان، علی و دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم، کا سا ایمان وطریقہ دین نہ اپنایا تو پھر تم اہلِ فسادِ ہو۔ تمہارا دعویٰ کہ ہم اصلاح پسند ہیں، سب بے بنیاد، زبانی جمع خرچ ودھوکا ہی دھوکا ہے۔

☆ استاد رازی

خیر پور سادات

"مشرق کی طرف منہ کرلینا یا مغرب کی طرف، یہ کوئی نیکی نہیں نہ اصل مقصد ہے۔
اصل مقصد، اللہ کی بات ماننا۔ یوم آخر پہ یقین۔ ملائکہ اور کتاب پہ عقیدہ کی اٹھان۔ نبیوں پہ ایقان اور اللہ کی محبت میں قرابت داروں، یتامیٰ، مساکین، مسافروں، سائلین اور گردنیں چھڑانے میں مال خرچ کرنا۔" (پارہ 2 آیت 177)

یہ ہے ترجمہ اور اللہ تعالیٰ کی رائے۔
بیت المقدس مسجد اقصیٰ کی نسبت، کعبہ مکرمہ مشرق کی طرف ہے، کعبہ مکرمہ کی نسبت، بیت المقدس مسجد اقصیٰ مغرب کی طرف ہے۔ پہلے نبیؐ مع اپنے صحابہؓ، بیت مقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد بحکم اللہ، کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے لگے۔
کعبہ کی طرف منہ کرلے واسے جا ہدایت قرار نے سے مومن، منافق اور کون رسولؐ کی تابعداری کرتا ہے، کون رسولؐ سے پھرتا ہے، قسم کے لوگوں کو ظاہر کرنا مقصد تھا لبعالم عَن يَتَّبِعِ الرسول من ينقلب علىٰ عقبيه کہ ہم رسولؐ کے تابعدار و رسول سے قرار والے ظاہر کریں، کہ آیا وہ اسے جا ہدایت قرار تے ہیں یا نہیں؟
جب نبیؐ نے کعبہ مکرمہ کو قبلہ و مرکز دین بنایا، تو بہت سے لوگ معترض ہوئے اور کعبہ کے مرکز دین ہونے، جا ہدایت ہونے کے انکاری ہو گئے۔ اعتراضات کا طوفان اٹھایا نبیؐ واصحاب نبیؐ پہ زبانِ طعن دراز کی، انہیں بے راہ آبا کا موہن کہا۔ جس گلی محلّہ وچوک میں بیٹھتے انہیں بے اعتذال غلط مال کہنے پہ مجلس گرم ہو جاتی کہ یہ پہلے قبلہ سے کیوں پھر گئے؟ شروع پارہ دو تا آیت 177 میں معترضین کے مختلف اعتراضات کا جواب درج ہے۔
محض مشرق یا مغرب مقصود نہیں، بلکہ اللہ کی ماننا اصل مقصد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کعبہ جا ہدایت ہے۔ تو اللہ کی یہ بات ماننی ہے اور اصول دینی یہاں والے

بنے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کعبہ جا برکت ہے۔ تو اللہ
ں یہ بات مانی ہے، تب بابرکت مقام کے عقیدہ کے
سول بابرکت ہیں قیامت تک۔ فرمایا: ھدیً لِلعالمین
عالمین، زمانے اور لوگ جب تک رہیں گے، یہاں
برکات و ہدایت والے صحیح عقائد اصول مروج رہیں
گے۔ اللہ کا وعدہ اور رائے بھی ذہن میں رکھ لیں، جب
یوم فتح مکہ نبیؐ نے ابراہیمؑ نبی، اسماعیلؑ نبی، عیسیٰؑ نبی ان
کی والدہ گرامی پاک بی بی مریمؑ اور لات منات بزرگان
کی شبیہیں تڑوا کر کعبہ سے نکال باہر کرائیں۔ اُن ٹکڑوں کا
آج تک پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔

اگر معلوم ہو جائے تو آج کے لوگ اُن ٹکڑوں کو
تبرک کے طور گھر لے آئیں گے۔

تب اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کی گارنٹی دے دی
انّما المشرکون نجس فلا بقره المسجد
الحرام بعد عامهم هٰذا بے شک مشرک پلید ہیں،
آج کے سال کے بعد (بعد فتح مکہ) مسجد الحرام کعبہ
مکرمہ کے قریب نہ آئیں گے۔ یعنی اب یہاں پر کوئی
بھی اپنی مشرکانہ رسم برپا نہ کر پائے گا۔

تب سے اب تک و اب سے قیامت تک اللہ کا
مرئی و غیر مرئی نظام حفاظت یہاں پہ جاری و ساری ہے
اور غیر مشرکانہ رسوم قائم ہیں۔ اس بابت مزید دو حدیثیں
سن لیں۔ فرمایا: ساری دنیا میں دین بدل جائے گا مگر دو
جگہوں مکہ، مدینہ میں وہی دین رہے گا جو چھوڑے جاتا
ہوں، او کما قال فرمایا: اے چابی بردار کعبہ، تجھے
یاد ہے میں نے تجھ سے کعبہ کی چابی مانگی تھی کہ اندر
عبادت کرلوں، اور تو نے انکار کردیا تھا۔ وہ بولا یا رسول
اللہ تب کی بات اور تھی۔ اب یہ لیں چابی۔ آپؐ نے اُس
سے چابی لے لی اور پھر واپس کرتے ہوئے فرمایا۔ ''یہ لو
چابی، اب قیامت تک یہ تیرے خاندان میں رہے گی''۔
او کما قال یہ ہیں اللہ تعالیٰ کے بیان اور نبی اکرمؐ کے
فرمان جن کو ماننا ہے کہ کعبہ مکرمہ مرکز دین و ایمان ہے۔
تب یہاں مشرک امام نہیں بن سکتا۔ مرکز دین و ایمان
سے متفاوت اصول دین و ایمان، محض منہ طرف مشرق یا
طرف مغرب ہوگا اور محض منہ نہ نیکی ہے نہ اصل مقصد۔
اے اصحاب بصیرت سبق پکڑیں۔

اگر صحابہؓ نبیؐ کا سا طریقہ دین و ایمان اختیار نہیں
کرتے تو پھر تم فسادی ہو۔

و اذا قیل لھم آمنو کما امن الناس، قالو
انؤمن کما امن السفھائط الا انھم السفھاء و
لکن لا یعلمون (سورۃ البقرہ:13)

اور جب ان کو کہا جاتا ہے کہ لوگو صحابہ (جب آیت
اتری تو ناس لوگ صحابہ ہی تھے) کی طرح ایمان لاؤ
طریقہ اپناؤ، تو جواب دیتے ہیں کہ ہم ایسا ایمان وطریقہ
اختیار کریں جیسا بے وقوفوں کا ہے۔

اس آیت پاک کے سیاق میں ذکر منافقوں اور
مشرکوں کا ہے جو اپنے تیار طریقہ کو مصلحانہ شمار تے تھے۔
اللہ نے فرمایا۔ تم فسادی ہو لیکن تم کو شعور نہیں کہ فساد کیا
ہے۔ اصلاح کیا ہے؟ فرمایا۔ ''پیمانہ یہ ہے کہ اس طرح
ایمان طریقہ دین کرو جیسا صحابہ کا ہے''۔ اگر تم نے ان
صحابہ ابوبکر، عمر، عثمان، علی و دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم، کا سا
ایمان وطریقہ دین نہ اپنایا تو پھر تم اہلِ فسادِ ہو۔ تمہارا
دعویٰ کہ ہم اصلاح پسند ہیں، سب بے بنیاد، زبانی جمع
خرچ و دھوکا ہی دھوکا ہے۔

مگر وہ منافقین صحابہؓ کا دین طریقہ اختیار کرنے
کے بجائے کٹ حجتیاں کرنے لگے، صحابہ کے کردار پہ
انگلیاں اٹھانے لگے، انہیں کم عقل، بے وقوف اور غلط
کردار کہا۔ ان منافقین مشرکین کو جہاں نبیؐ کے پیغام
توحید کہ اللہ کے سوا کسی کو نہ پکارو، سے چڑھی وہاں صحابہؓ
سے تو سخت نفرت تھی اور کہتے تھے کہ یہ صحابہ اگر تعاون نہ
کرتے تو محمدؐ اکیلے کیا کر لیتے؟

ابھی وہ اس آگ میں جل رہے تھے کہ نبیؐ نے مدینہ میں اذان شروع کرائی، جو قیامت تک رہے گی۔ مشرک تلملائے کہ یوں نہ ہو یوں نہ ہوا۔ یہ مشرکین مکہ و مدینہ اپنی اولادوں، رشتہ داروں، دوستوں کو تلقین کرتے کہ جس قدر ہو سکے اصحاب محمدؐ کی کردار کشی کرو ان کے کم عقل اور غلط کار ہونے کی ہر رنگ کی کہانیاں گھڑتے رہو۔ منافقین مشرکین کا صحابہؓ کو بے وقوف و غلط کار کہنا اللہ کو برداشت نہ ہوا، ان کے الفاظ ان پہ الٹ دیئے۔ فرمایا۔ الا انهم هم السفهاء و لكن لا يعلمون خبردار! یہ یقیناً بے شک خود بے وقوف ہیں لیکن جانتے نہیں۔

نبیؐ نے جب چوٹی فاراں پہاڑ پر اعلان لا الہ الا اللہ کا کیا، تو مشرکین سارے تلملا اٹھے کہ صرف اللہ کو پکاریں، عیسیٰ نبی و ان کی ماں بی بی مریم اللہ کی دیہ کو نہ پکاریں؟ ابولہب اصلی نام عبدالعزیٰ، نبی پاک کا سگا چچا، نے تو پتھر اٹھا لئے اور کہا "تباً لک یا محمد" اے محمد آپ کو خرابی و تباہی ہو۔ ابولہب کا پاک نبیؐ کو تباً کے الفاظ کہنا اللہ کو برداشت نہ ہوا، اس کے الفاظ اس پر الٹ دیئے۔ فرمایا: تبت يدا ابى لهب و تب اے ابولہب تجھے خرابی و تباہی ہو۔ نبیؐ و صحابہؓ بارے مشرکین منافقین کے بغض نہ معتہ ضانہ بنائی کہانیوں کے الفاظ اور اللہ کا ان کے کہے الفاظ ان پہ الٹنا، غصیلا ردعمل سبق ہے کہ یہ تو اللہ کے پیارے لوگ ہیں۔ ان کو جس نے جیسا کہا اللہ نے اس کو ویسا کہا۔ اچھا کہا تو اس کے لئے اچھے الفاظ، اچھا انجام۔ خراب کہا تو خراب الفاظ اور خراب انجام۔

سب سے سچے راوی اللہ نے اپنی کتاب روایت آیت قرآن میں تو صحابہؓ نبی کو سچا نقاش نبیؐ باور کرایا۔ تبھی تو اوروں کو بھی ان کا طریقہ دین و ایمان اختیار کرو، کہا۔ مگر مشرکین ان کو غلط کار کہتے تھے۔

ماہنامہ
لاہور
حکایت
ستمبر 2020ء کا شمارہ
سالگرہ نمبر
ہوگا۔
قیمت: 150 روپے
قارئین کرام اور ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں!
ماہنامہ حکایت 26-پٹیالہ گراؤنڈ لاہور

تاریخی ناول

قسط: 16

تاریخ کے گم گشتہ اوراق سے کشید کی ہوئی سحر انگیز داستان

یشدر نے تلوار کی نوک حیران کھڑی قتیلہ کی جانب تانی..... ''سردارزادی قتیلہ بنت جبلہ، میں صبح چلا جاؤں گا، اگر دل میں کوئی حسرت ہے تو تم پوری کر سکتی ہو۔''

(aqibkohlar@gmail.com)

عتیبہ تحقیر آمیز انداز میں مسکرائی۔ "دھیان سے رہنا محترمہ بہت خطرناک ہے۔ اُس کا غلام امریل بن خرشہ بھی بتا رہا تھا کہ اس نے آج تک اپنی مالکن جیسا ماہر لڑاکا نہیں دیکھا۔"

یشکر کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "غلام اپنی مالکن کی تعریف نہیں کرے گا تو کون کرے گا۔"

وہ تحقیر آمیز لہجے میں بولی۔ "تمھیں اُمّی بن ملیث بننے پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔" اس کا زخم کو مندمل ہوتا ہاتھ غیر محسوس انداز میں یشکر کی چھاتی پر رینگنے لگا۔

"[illegible] کا کسی حد تک اعتراض نہیں ہے۔"

"مجھے بھوک لگی ہے۔" عتیبہ اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔

"مجھے بھوک لگی ہے۔" یشکر نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔

تیز سانس لیتے ہوئے عتیبہ پیچھے ہٹی۔ "میں دودھ اور تمر (خشک کھجور) لاتی ہوں۔"

صبح صادق کے ساتھ انھوں نے سفر شروع کیا۔ طلوع آفتاب کے وقت وہ بنو طریف میں داخل ہو رہے تھے۔ ٹیلوں کے درمیان شمشیر زنی، نیزہ بازی اور تیر اندازی کی مشق کو دیکھ کر امریل گھوڑا دوڑاتے ہوئے اس طرف بڑھ گیا۔

ملکان بن عوف، رشاقہ بن زیاد اور قریب بن فلیح تینوں مل کر قتیلہ کو زیر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چاروں کے ہاتھوں میں دھات کی کند تلواریں تھیں جو شمشیر زنی کی مشق کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ قتیلہ چھلاوا بنی ان کی مرمت کر رہی تھی۔ قریب پہنچتے ہی امریل چھلانگ لگا کر گھوڑے سے اترا اور پیچھے پڑی ہوئی ایک کند تلوار اٹھا کر سرعت سے قتیلہ کی طرف بڑھا۔ قتیلہ کی نظر بھی اس پر پڑ چکی تھی۔ ملکان کی چھاتی میں زوردار لات رسید کرتے ہوئے اس نے چمڑے کی ڈھال قریب بن فلیح کے سر پہ دے ماری اور پھر ایک دم وہی ڈھال امریل کی تلوار کے سامنے پکڑ لی۔ وار رک جانے کے بعد امریل رکا نہیں تھا بلکہ اس نے حملے مسلسل جاری رکھے اور قتیلہ اچھل اچھل کر اس کے وار خطا کرنے لگی۔ ملکان بن عوف اور رشاقہ پیچھے ہٹ گئے تھے۔ تینوں کے چڑھے ہوئے سانس ظاہر کر رہے تھے کہ وہ کافی دیر سے مشق کر رہے تھے۔ قتیلہ کا سانس اب بھی ہموار تھا۔ البتہ پسینہ موتیوں کے قطروں کی طرح اس کے ملیح چہرے پر بہہ رہا تھا۔

دونوں کی تلواریں مسلسل ٹکرانے لگیں۔ امریل تازہ دم تھا لیکن سامنے قتیلہ تھی۔ لڑائی طول کھینچنے لگی۔ اب تک کوئی بھی ایسا وار مقابل کے جسم پر نہیں کر سکا تھا کہ مخالف ہارا ہوا تصور کیا جاتا۔

اچانک امریل کی زوردار لات قتیلہ کے پیٹ کی طرف بڑھی۔ پہلو بچاتے ہوئے قتیلہ نے اس کا

وار خطا گیا اور اس کی جوابی ٹھوکر امریل کی دوسری ٹانگ پر لگی وہ کولہوں کے بل نیچے گر گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی قتیلہ کی تلوار اس کی گردن سے لگ گئی تھی۔

اس لڑائی کے دوران تمام افراد مشق چھوڑ کر دائرہ بنا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ امریل کے ہارتے ہی زوردار نعرہ بلند ہوا تھا۔ ''ملکہ قتیلہ زندہ باد......''

منقر بن انیج کے ساتھ کھڑے ضحاک بن عتیک نے کہا۔ ''کاش یہ اتنی اچھی لڑاکا نہ ہوتی۔''

منقر نے اسے کڑی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''ضحاک احتیاط سے وہ ہماری سردار ہے۔''

ضحاک جلدی سے بولا۔ ''ہاں میں بھی اسے ملکہ ہی سمجھتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ دل ہی دل میں بولا۔ ''اس سے شکست کھانے کا غم بھلانا ذرا مشکل لگ رہا ہے۔''

اسی وقت امریل نے قتیلہ کی تلوار کو ہاتھ سے ایک طرف دھکیلا اور اچھل کر کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔ ''دوبارہ۔''

ایک بار پھر گھمسان کا رن پڑا۔ دونوں کا پسینہ دھاروں کی صورت میں پورے جسم کو بھگو رہا تھا۔ اور پھر امریل کی تلوار کی نوک قتیلہ کے سینے کی طرف اتنی سرعت سے بڑھی تھی کہ دیکھنے والوں کو یقین ہو گیا تھا کہ امریل نے مقابلہ برابر کر دیا ہے لیکن بالکل آخری لمحے قتیلہ لچکدار شاخ کی طرح پیچھے کو جھک گئی تھی۔ قتیلہ کا گھٹنوں سے بالائی جسم زمین کے متوازی ہوا، امریل اپنی جھونک میں آگے کی طرف بڑھا تھا۔ قتیلہ نے اپنی تلوار کا پیپلا نیچے ٹیک کر جسم کو وہیں روکا، ساتھ ہی اس کے پاؤں کی زوردار ٹھوکر امریل کے تلوار والے ہاتھ پر پڑی۔ اس کی تلوار اڑتی ہوئی دور جا گری تھی۔ اپنی تلوار کے دستے پر زور دیتے ہوئے وہ کمان کی تانت کے طرح سیدھی ہوئی اور اس کے سر کی بھرپور ٹکر امریل کی چھاتی میں لگی تھی۔ کولہوں کے بل نیچے گرتے ہوئے وہ چاروں شانے چت ہو گیا تھا۔ قتیلہ نے تلوار کی نوک اس کی چھاتی پر ٹکا کر واپس کھینچی اور ڈھال کندھے سے لٹکا کر اس نے اپنا ہاتھ سہارے کے لیے امریل کی طرف بڑھا دیا۔

قتیلہ نام کے نعروں سے فضا گونج اٹھی تھی۔

اس کا ہاتھ تھام کر امریل اٹھا اور پھر وہی ہاتھ دونوں آنکھوں سے لگا کر چومتے ہوئے بولا۔

''مجھے ملکہ قتیلہ کا خصوصی غلام ہونے پر فخر ہے۔''

وہ متبسم ہوئی۔ ''ملکہ قتیلہ تیسری بار مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہے۔''

وہ عقیدت سے بولا۔ ''اگر جیتنے کی امید ہوتی تو کوشش کر لیتا۔''

''تو پہلے جیتنے کی امید پر لڑے تھے۔''

''نہیں۔'' امریل نے نفی میں سر ہلایا۔ ''سیکھنے کے لیے، اگر جیتنے کی خواہش ہوتی تو اس سے لڑتا۔'' اس نے سرخ رُو رشاقہ کی جانب اشارہ کیا۔

''میں تو جیسے موم کی گڑیا ہوں نا؟'' رشاقہ نے دانت پیستے ہوئے تلوار سونتی۔

''نہیں رشاقہ۔'' قُتیلہ نے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔ ''تمھیں مزید تربیت کی ضرورت ہے۔''

''آپ دیکھیں تو سہی۔'' رشاقہ نے اطمینان بھرے انداز میں کہتے ہوئے بجلی کی سی سرعت سے امریل پر حملہ کر دیا تھا۔

امریل نے اس کے دو تین وار روک کر چڑھائی شروع کر دی۔ وہ مقابلہ جلد ہی ختم ہو گیا تھا۔ امریل کی زوردار لات پیٹ میں کھا کر رشاقہ دور جا پڑی تھی۔ امریل نے اس کی گردن پر تلوار کی نوک چبھوئی۔

''اب بتاؤ سفید لومڑی۔''

رشاقہ نے تلوار کو ہاتھ مار کر گردن سے دور کیا اور اٹھتے ہوئے بولی۔ ''کالے ریچھ، میں جلد ہی اصلی تلوار سے تمھارا سر اتاروں گی۔''

تمام کھل کھلا کر ہنس پڑے تھے۔ وہ بے پروائی سے چلتے ہوئے قُتیلہ کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

یشکر نے وہ مقابلے اونٹ پر بیٹھے ہوئے دیکھے تھے۔ قُتیلہ کی شمشیر زنی سے زیادہ وہ اس کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ وہ بادیہ جیسی تھی لیکن بادیہ نہیں تھی۔ کڑی مشقت سے اس کا چہرہ سنولایا ہوا لگ رہا تھا۔ رشاقہ کے شکست کھانے کے بعد خلیسہ نے کھنکارتے ہوئے یشکر کو مخاطب کیا تھا۔

''کیسی لگی؟''

وہ مسکرایا۔ ''کون؟''

''دونوں۔'' خلیسہ بھی کھل کھلا دی تھی۔

اس نے دوبارہ قُتیلہ کے چہرے پر نظریں مرکوز کیں۔ ''بادیہ سامنے ہوتی ہے تو میں کسی اور پر توجہ مرکوز نہیں کر سکتا اور یہ بادیہ جیسی ہی ہے۔''

اس وقت امریل، قُتیلہ کو راستے میں پیش آنے والے واقعے کی تفصیل بتا رہا تھا۔ اس سے باتیں کرتے ہوئے وہ انھی کی طرف بڑھنے لگی۔ خلیسہ نے اونٹنی کی مہار کو مخصوص انداز میں جھٹکا دے کر نیچے بٹھایا اور زمین پر اتر گئی۔ یشکر کجاوے میں رضائی سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔

مرعوب سے کھڑے سائب بن شراحیل اور بجرہ بن ودقہ پر گہری نظر ڈال کر اس نے یشکر اور

ضبیعہ کو دیکھا۔

"ملکہ قُتیلہ تمھیں بنوطریف میں خوش آمدید کہتی ہے۔ آج سے تم ہمارا حصہ ہو۔ تمھارا اور بنوطریف کا فائدہ اور نقصان سانجھا ہے۔"

سائب بن شراحیل اور بجرہ بن ودقہ نے عقیدت بھرے انداز میں سر جھکاتے ہوئے کہا۔ "ہم ملکہ قُتیلہ کے شکر گزار ہیں۔"

وہ بنو یمامہ کے آدمیوں کے گھوڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "ان میں سے اپنے لیے گھوڑے پسند کر لو۔" اور پھر ملکان کی طرف متوجہ ہوئی۔ "انھیں ایک ایک خیمہ اور تلوار دے دو۔ اور کل سے دونوں کی تربیت شروع کرا دو۔"

"جی ملکہ۔" ملکان نے مؤدبانہ انداز میں سر جھکا دیا تھا۔

وہ ضبیعہ کو مخاطب ہوئی۔ "تمھارے پاس تو کافی سامان موجود ہے، اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتاؤ۔"

"ضرورت کی ہر چیز موجود ہے ملکہ قُتیلہ۔"

"اگر سواری کے لیے گھوڑا پسند ہو تو یہ اونٹ واپس کرنے پڑیں گے۔" قُتیلہ نے حابس اور غیاث کے اونٹوں کی طرف اشارہ کیا۔

ضبیعہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے اونٹ پسند ہیں ملکہ۔"

"ٹھیک ہے کسی مناسب جگہ پر خیمہ لگا لو، امریل تمھاری مدد کرے گا۔"

امریل خوش دلی سے سر ہلاتا ہوا ان کے ساتھ ہو لیا۔ اس دوران یشکر بے پروائی سے بیٹھا رہا نہ تو قُتیلہ نے اسے مخاطب کرنے کی ضرورت محسوس کی تھی اور نہ اس نے ہی یہ زحمت کی تھی۔

☆☆☆

رات کو منذر بن اسحم اجازت مانگ کر قُتیلہ کے خیمے میں داخل ہوا۔

"بیٹھو منذر۔" قُتیلہ نے نیچے بچھی چٹائی کی جانب اشارہ کیا۔

"میں کچھ کہنے کو حاضر ہوا تھا۔" وہ مضطرب سا نیچے بیٹھ گیا تھا۔

قُتیلہ نے صراحی سے شراب کا پیالہ بھر کے اس کی جانب بڑھایا۔

"شکریہ ملکہ۔" دونوں ہاتھوں سے پیالہ تھام کر اس نے ایک گھونٹ لیا۔

"کہو۔" قُتیلہ نے اپنے لیے بھی اک پیالہ بھرا اور اس کی جانب متوجہ ہوئی۔

منذر نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "مجھے لگتا ہے کچھ لوگوں کے دل میں کینہ ہے۔"

وہ بولی۔ ''کچھ لوگوں سے مراد اگر ضحاک بن عتیک ہے تو ملکہ قُتیلہ جانتی ہے۔''

''اس کے بارے ملکہ کو مناسب قدم اٹھانا ہوگا۔'' منقر قُتیلہ کی فراست کا پہلے سے معترف تھا۔ اسی لیے اظہارِ حیرانی کرنے کے بجائے مشورہ دینے لگا۔

''اس کی کسی غلط حرکت سے پہلے اگر ملکہ قُتیلہ نے انتہائی قدم اٹھایا تو بنوطرید کے باسیوں کے دل میں ملکہ قُتیلہ کے لیے بدگمانی پیدا ہو جائے گی۔ اس لیے انتظار بہتر ہے۔ ہوسکتا ہے سُدھر جائے، نہیں تو اس جیسے دس بھی ملکہ قُتیلہ کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔''

منقر نے خالی پیالہ نیچے رکھا۔ ''ایک اور عرض بھی کرنا تھی۔''

''بولو۔'' قُتیلہ نے دوبارہ پیالہ بھرنے کے لیے صراحی اس کی جانب بڑھائی۔

مودب انداز میں صراحی تھام کر اس نے اپنا پیالہ بھرا اور پھر اٹھ کر قُتیلہ کے ہاتھ میں تھامے ہوئے ادھ بھرے پیالے میں مزید شراب انڈیلنے لگا۔

صراحی کو قُتیلہ کے قریب رکھ کر وہ بیٹھا اور جھجکتے ہوئے بولا۔ ''اگر میری بات ملکہ کو بری لگے تو معافی کی گنجایش موجود ہونا چاہیے۔''

قُتیلہ کے ہونٹوں پر غیر محسوس تبسم رینگا۔ ''قیروان بن اخلد اچھا جوان تھا۔ بس محبوبہ کے انتخاب میں غلطی کر بیٹھا۔''[1]

منقر محجوب سا ہوتا ہوا بولا۔ ''ملکہ قُتیلہ میرے لیے میری بیٹی کی پشت کی طرح ہے۔''[2]

''بولو منقر چچا!'' اس مرتبہ قُتیلہ کے لہجے میں نرمی تھی۔

''میں جانتا ہوں کہ بنوطرید میں شامل ہونے والے تمام لوگوں کو ملکہ قُتیلہ نے سختی سے منع کیا ہوا ہے کہ کوئی سابقہ قبیلے کی روایات، رسوم اور فخر و مباہات کا اظہار نہیں کرے گا۔''

''تو....''

''بنوعقرب کے لوگ چاند کی حالت بدر[3] میں جشن منانے کے عادی تھے۔ اگر ملکہ کی اجازت ہو تو ہم اس رسم کو جاری رکھنا چاہتے ہیں۔''

قُتیلہ نے چند لمحے سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد کہا۔ ''ملکہ قُتیلہ کو بہ ظاہر کوئی قباحت نظر نہیں آرہی۔ البتہ کسی کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ جشنِ اہلِ بنوعقرب کی منشا پر منعقد کیا جارہا ہے۔ اس رسم

---

[1] گویا اس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں قُتیلہ سے اظہارِ محبت کرنے والوں کے انجام سے آگاہ کیا تھا۔

[2] مطلب، تمھیں بیٹی کی طرح خود پر حرام سمجھتا ہوں۔

[3] چودھویں کا چاند۔

کا اعلان ملکہ قتیلہ خود کردے گی۔ آج کے بعد بدر کی رات بنو فرید والے جشن منایا کریں گے۔"

"ملکہ قتیلہ کا اقبال بلند ہو۔" مقرر اختتامی کلمات کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ظاہر ہونے والی خوشی بتا رہی تھی کہ وہ مطمئن ہو کر جا رہا ہے۔

قتیلہ نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

☆☆☆

بنو نوفل کے سواروں کی آمد کی خبر شریم پر بجلی بن کر گری تھی۔ تین دن پہلے ہی اس کی بیٹیاں، بیوی اور اس کا ہونے والا داماد ملکان بن عسکر بنو اسد سے واپس لوٹے تھے۔ اور آج دوپہر ڈھلے یہ مصیبت نازل ہو گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ دھڑکتے دل سے ان کے سامنے کھڑا تھا۔

"سرداری مبارک ہو شریم بن ثمامہ۔" چھوٹے قد اور مضبوط جسم کے مالک قرضم بن جدان نے اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کی۔

"میرا خیال ہے بنو جساسہ بہت بڑا نقصان برداشت کر چکا ہے۔" شریم نے ان کی آمد کا مقصد جاننا چاہا۔

قرضم بن جدان نخوت سے بولا "بنو نوفل سے ٹکرانے والوں کی نسلیں مٹ جایا کرتی ہیں۔"

شریم خاموش کھڑا رہا۔ بات بڑھا کر وہ بنو جساسہ کے رہے سہے افراد کو لقمۂ اجل نہیں بنا سکتا تھا۔ بادیہ کی وہاں موجودی کو بھی انھوں نے بہت زیادہ خفیہ رکھا ہوا تھا اور اس کی سوچوں کو یہی اندیشے جکڑے ہوئے تھے۔

شریم کو خاموش پا کر قرضم نے بات بڑھائی۔ "بہرحال، ہم نے سنا ہے اس دفعہ تمھارے تجارتی قافلے کو کافی منافع ہوا ہے، بنو نوفل کا سردار حلیف اور دوست قبائل کی دعوت کر رہا ہے۔ اس کے لیے چند مٹکے حیرہ کی عمدہ شراب کے درکار تھے۔ یقیناً اس بنو جساسہ تعاون کریں گے۔"

گہرا سانس لیتے ہوئے شریم نے اپنے اندیشوں کو غلط ثابت ہوتا دیکھ کر دل ہی دل میں شکر کیا تھا۔ "ہمارا قافلہ اتنی زیادہ شراب تو نہیں لا سکا تھا، پھر بھی تمھیں دس مٹکے مل جائیں گے۔"

"کم از کم بیس مٹکے ورنہ ہمیں جائزہ لینے کے لیے خود تمھارے ٹوٹے پھوٹے گھروں کو کھنگالنا پڑے گا۔" قرضم کے لہجے میں شامل غرور نے شریم کو سرتاپا سلگا دیا تھا۔

شریم بے بس سا اپنے بھتیجے مالک کی جانب متوجہ ہوا جو غصے سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ "مطلوبہ مقدار میں شراب کے مٹکے ان کے حوالے کر دو۔"

قرثعہ زہشتائی سے بولا۔ "اور ہاں شراب لے جانے کے لیے اونٹوں کی ضرورت بھی پڑے گی، شراب کے مٹکے ہم گھوڑوں کی پیٹھ پر تو نہیں لاد سکتے۔ یوں بھی بنو جساسہ نے سردار زادے ہزیل کا خون بہا ادا نہیں کیا تھا۔"

"آپ ہمارے ہزاروں مویشی ہانک کر لے گئے تھے۔" شریم نے بڑی مشکل سے اپنے غصے پر قابو پایا تھا۔

قرثعہ بے پروائی سے بولا۔ "وہ مویشی غنیمت کے طور پر ہمارے ہاتھ آئے تھے۔"

غصے کے اظہار کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ شریم نے سر جھٹک کر دس اونٹ تیار کرنے کا حکم دیا۔ تھوڑی دیر بعد بنو نوفل کے چند سوار دس اونٹوں پر عمدہ شراب کے بیس مٹکے لادے واپس روانہ ہو گئے تھے۔ بنو جساسہ والے سوائے کڑھنے کے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

☆☆☆

چاند نے سر شام مشرق سے سر ابھارا۔ بنو طرید کے باسی جشن کی تیاریاں مکمل کر چکے تھے۔ غروب آفتاب کے ساتھ ہی آگ پر سالم بھنے ہوئے اونٹ، دنبے اور بکروں کے گوشت کے ساتھ انصاف کیا جانے لگا۔ خلیسہ یشکر کو سہارا دے کر باہر لے آئی تھی۔ خلیسہ کی بہترین دیکھ بھال سے اس کے زخموں میں روز بروز بہتری آ رہی تھی۔

قتیلہ کے خیمے کے سامنے ایک اونچا چبوترا بنا دیا گیا تھا۔ جس پر لکڑی کا تخت رکھا تھا۔ قتیلہ اسی پر بیٹھی تھی۔ رشاقہ ایک بڑی رکابی میں اس کے لیے بھنا ہوا گوشت لے گئی تھی۔ قتیلہ نے اسے اپنے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ رشاقہ مودب انداز میں بیٹھ گئی تھی۔ پچھلے جشن کی طرح اس بار بھی رشاقہ نے اسے تیار کیا تھا۔ سرخ رنگ کی فرجی[1] جس پر خوب صورت بیل بوٹے کڑھے تھے۔ قتیلہ نے ٹخنوں تک آتی فرجی اپنے لباس کے اوپر پہن لی تھی۔ اس کے سر پہ بندھی قساوا کھول کر رشاقہ نے خوبصورت موتیوں کا ہار اس کے کھلے بالوں پر لٹکا دیا تھا۔ سرخ و سفید موتیوں کا ہار، تاج کی طرح اس کے سر پر خوب سج رہا تھا۔

جشن کی شب کے لیے تمام کے لیے شراب اور کھانے کا انتظام قبیلے کی سردار یعنی قتیلہ کی جانب سے تھا۔

چودھویں کے چاند کی رومان پرور روشنی اور پھر چار کونوں میں بھڑکتے آلاؤ کی سحر انگیز روشنی نے دلوں میں عجیب قسم کی ترنگ اور ولولہ پیدا کر دیا تھا۔ لبوں سے خود بہ خود قہقہے برآمد ہو رہے تھے۔ غموں و دکھوں کے لیے عارضی طور پر بنو طرید کی حدود میں آنے پر پابندی لگ چکی تھی لیکن ایک ایسا شخص وہاں

---

[1] یہ چغہ جو سامنے سے کھلا ہو۔

موجود تھا جو اس ماحول میں بھی غمگین تھا۔ اپنی سردار زادی کو یاد کرتے ہوئے یشکر کی نگاہیں بار بار تخت پر بیٹھی قُتیلہ کی جانب اٹھ جاتیں جو رشاقہ کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ مگر اس کی ہنسی بادیہ سے مختلف تھی۔ بادیہ شرمیلی تھی اور یہ بے باک۔ وہ ہنستے ہوئے سر جھکا لیتی تھی اور قتیلہ کا چہرہ ہنستے ہوئے اوپر کو اٹھ جاتا تھا۔ بادیہ اس کی بیوی ہونے کے باوجود عموماً اسے کن اکھیوں سے دیکھا کرتی، جبکہ قُتیلہ مردوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتی تھی۔ بلاشبہ بادیہ ہراساں اور معصوم ہرنی جیسی تھی اور قُتیلہ زخمی شیرنی کی طرح خوں خوار اور بھڑکیلی تھی۔

کھانے پینے کے بعد محفلِ موسیقی اور رقص کی شروعات ہوگئی۔ طبلہ اور مکان کی آوازیں جادو جگانے لگیں۔ اس وقت قُتیلہ کا چہرہ خصوصی طور پر دو افراد کے لیے مرکزِ نگاہ بنا ہوا تھا۔ ایک کی نگاہوں میں خوشگوار دلچسپی جبکہ دوسرے کی نگاہوں میں ہوس ابل رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی نگاہوں کے سامنے تمام پردے ہٹے ہوئے ہیں۔

محفل عروج پر پہنچی، رشاقہ نے مستی سے جھومتے ہوئے قُتیلہ کو کھینچا، شراب کے نشے میں مخمور قتیلہ ہنستے ہوئے کھڑی ہوئی اور خوب صورت سازوں پر تھرکنے لگی۔ اسے ناچنا نہیں آتا تھا۔ وہ میدان جنگ میں جس خوب صورتی اور مہارت سے لہراتی بل کھاتی تھی اس انداز میں وہ رقص کرنے سے عاجز تھی۔ وہ بس پینترے بدلنے کے انداز میں اچھل کود کر رہی تھی۔ تماشائیوں نے اس کے نام کے نعرے لگاتے ہوئے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ وہ اس سے متاثر تھے، ڈرتے تھے، عقیدت رکھتے تھے اور اسے انوکھا خیال کرتے تھے۔ اس کا یوں بے تکلفی سے رقص کرنا انھیں از حد محظوظ کر رہا تھا۔

ہوس بھری آنکھوں کی حسرت کچھ مزید بڑھ گئی تھی۔ وہ اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے یوں کاٹ رہا تھا جیسے اس کے اپنے ہونٹوں کے بجائے قُتیلہ کے شہابی لب ہوں اور وہ ضحاک بن عتیک تھا۔

☆☆☆

بادیہ عریسہ کی گود میں سر چھپائے لیٹی تھی۔ وتینہ، سلمٰی اور ان کی ماں نائلہ بھی وہیں موجود تھیں۔ یشکر کے بعد وہ ہر لمحے خود کو غیر محفوظ سا محسوس کرتی۔ جبکہ اس کی موجودگی میں وہ خود کو نڈر و بے خوف محسوس کیا کرتی تھی۔ ابتداء میں وہ یشکر کو اپنے بھائیوں کی دھمکی دیا کرتی تھی۔ اور اس وقت تینوں بھائی بنو جساسہ میں موجود تھے لیکن ان کی موجودگی سے اسے تحفظ کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔

یشکر کی موت کا سن کر وتینہ بہت روئی تھی۔ سلمی سے لپٹ کر اس نے سسکتے ہوئے کہا تھا۔ ”بھائی ہماری قسمت ہی میں نہیں ہے۔“

شریم حجرے میں داخل ہوا۔ ”دفع ہو گئے ہیں۔“ بنو نوفل کے سواروں کی واپسی کا بتاتے ہوئے اس

سے تنگ دی۔

تمام نے اطمینان بھرا سانس لیا تھا۔ وتینہ پوچھنے لگی۔ ''ابوجان، ان کی آمد کا مقصد کیا تھا۔''

''اپنی طاقت کا اظہار کرنے آئے تھے۔ یہ باور کرانے آئے تھے کہ انھیں بنو جساسہ کے خلاف ہر قسم کی من مانی کی کھلی چھوٹ ہے۔'' شریم دکھ کے اظہار سے خود کو نہیں روک سکا تھا۔

سلمی وتینہ کی ماں نائلہ بولی۔ ''ہمیں یہاں سے کوچ کر کے کسی اور قبیلے میں ضم ہونا پڑے گا۔ بنو دیل، بنو جمل یا بنو لخم اس کے لیے بہترین چناؤ ثابت ہوں گے۔''

شریم تلخی سے بولا۔ ''تم چاہتی ہو بنو جساسہ کا نام و نشان بھی مٹ جائے۔''

''میرا مطلب یہ نہیں تھا۔'' نائلہ گھبرائی تھی۔

شریم طنزیہ انداز میں بولا۔ ''بنو جساسہ کی زمین زرخیز ہے، یہاں نہ خشک ہونے والے پانی کے کنویں موجود ہیں، رہائش کے لیے مضبوط حویلیاں بنی ہیں اور یہ سب چھوڑ کر ہم کسی اور قبیلے میں ذیلی بن کر جا بیٹھیں۔ وہ بھی صرف اس لیے کہ بنو نوفل والے ہمیں تنگ کر رہے ہیں۔''

نائلہ نے ندامت سے سر جھکا لیا تھا۔

''ہم حلیف قبائل میں اپنے مردوں کی شادیاں کریں گے، بنو جساسہ کے ان مرد و زن کو تلاش کر کے آزاد کرانے کی کوشش کریں گے جنھیں غلام بنا کر بیچا گیا ہے۔ اور مجھے یقین ہے ہماری اگلی نسل بنو نوفل سے ان تمام زیادتیوں کا بدلہ لے گی۔''

''معافی چاہتی ہوں سردار، آپ کو میری گفتگو سے تکلیف پہنچی۔'' نائلہ نے معذرت کرنے میں عافیت جانی تھی۔

اسی شام شریم اپنے بھتیجے کو کہہ رہا تھا۔ ''وتینہ جوان ہو گئی ہے مالک!.... اور میں چاہتا ہوں سلمی اور اس کو ایک ساتھ رخصت کیا جائے۔''

مالک بن شیبہ پُرمسرت لہجے میں بولا۔ ''چچا جان!...... یہ رشتا میرے لیے اعزاز سے کم نہیں ہے۔''

شریم اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔ ''پرسوں تمھارا نکاح ہوگا۔ تیاری کے لیے دو دن یقیناً کافی ہوں گے۔''

''جی چچا جان۔'' مالک نے سعادت مندی سے سر ہلا دیا تھا۔

☆☆☆

یشکر خیمے سے کم ہی نکلتا تھا۔ کیوں کہ وہ قتیلہ کو نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے بادیہ کی یاد

بڑی شدت سے حملہ آور ہوتی تھی۔ اس کے زخم اب بتدریج ٹھیک ہو رہے تھے۔ خلیسہ نے ایک اونٹ دے کر بدلے میں دس بکرے حاصل کیے تھے۔ ہر تیسرے چوتھے روز وہ ایک بکرا ذبح کرتی اور اس کا گوشت اکٹھا بھون کر رکھ لیتی۔ جب وہ ختم ہو جاتا تو ایک اور بکرا ذبح کر لیتی۔ یشکر کی تواضع میں اس نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔

اب وہ اپنی پسند کا بھی کھل کر اظہار کرنے لگی تھی۔ مگر یشکر کے لیے اس کی خوب صورتی کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ بادیہ کے بدلے اسے قُتیلہ بھی قبول نہیں تھی اس کی کیا دال گلتی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت تھی کہ اس کی نظر میں بادیہ مر چکی تھی اور مرے ہوئے آدمی کی جگہ زیادہ عرصہ تک خالی نہیں رہتی جلد ہی پُر ہو جاتی ہے۔ اور وہ جس معاشرے میں سانس لے رہا تھا وہاں یوں بھی ایک مرد کئی کئی عورتوں کو اپنے نکاح [1] میں رکھ سکتا تھا۔

اسے بنو طرید میں آئے دو ماہ ہونے کو تھے۔ اور اب اس کے زخم کا کھرنڈ بھی اتر چکا تھا۔ وہ ذہنی طور وہاں سے جانے کے بارے سوچنے لگ گیا۔ بادیہ رہی نہیں تھی، بنو جساسہ تباہ ہو چکا تھا اور اب اسے فارس کے علاوہ کوئی جائے پناہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس دن وہ صبح سویرے خیمے سے باہر نکلا۔ ٹیلوں کے درمیان تمام جوان مشق کر رہے تھے۔ وہ ٹہلنے کے انداز میں ان کے قریب پہنچا۔ پاگل دل قُتیلہ کو دیکھنے کے لیے مچل اٹھا تھا۔

قُتیلہ، رشاقہ کی تربیت میں مصروف تھی۔ لڑکیاں لکڑی کے ستونوں پر لگے قِرطاس [2] پر جُماح [3] کی بارش کیے ہوئے تھیں۔ امرئیل اور ملکان ایک دوسرے کو زیر کرنے کی کوشش میں تھے۔ تین بار ہارنے کے بعد چوتھی دفعہ جیت ملکان کے حصے میں آئی تھی۔

یشکر ایک جانب کھڑا ہو کر انھیں اشتیاق سے دیکھنے لگا۔ مگر وہ زیادہ دیر قُتیلہ کی دید سے محظوظ نہیں ہو سکتا تھا کیوں اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کی وارفتگی دیکھ کر وہ الٹی کھوپڑی کی لڑکی کچھ بھی کر سکتی تھی۔ وہ اس سے رخ موڑ کر شمشیر زنی کرنے والے دو ناریوں کو دیکھنے لگا۔ اور پھر اسے معلوم ہی نہ ہوا

---

[1] اسلام سے پہلے عربوں میں رواج تھا کہ ایک مرد جتنی چاہتا عورتوں کو بیاہ کر اپنے پاس رکھ لیتا۔ اسلام کی آمد کے بعد صرف چار عورتیں رکھنے کی اجازت دی گئی۔ جب یہ حکم نازل ہوا اس وقت کافی صحابہ کرامؓ ایسے تھے جن کے نکاح میں چار سے زیادہ بیویاں تھیں۔ یہاں تک کہ سیدنا فاروق اعظمؓ کے نکاح میں بھی اس وقت چار سے زیادہ بیویاں تھیں۔ ایسے تمام صحابہ کرامؓ نے فوراً ہی چار سے زائد بیویوں کو طلاق دے دی تھی۔

[2] تیر اندازوں کا ہدف۔

[3] بغیر نوک کے تیر۔

اسی وقت وہ قریب آگئی تھی۔

"جوان! تمھیں اب بستر چھوڑ دینا چاہیے۔"

یشکر چونکتے ہوئے متوجہ ہوا۔ دنبالہ آنکھیں اس کے چہرے پر گڑی تھیں۔ یشکر کی سوچوں میں بادیہ کی آنکھیں در آئی تھیں۔ بڑی مشکل سے اس کے چہرے سے نظر ہٹا کر اس نے رشاقہ کی طرف دیکھا جس کے سرخ و سفید چہرے پر پسینے کے قطرے آبگینوں کی طرح لگ رہے تھے۔ وہ اشتیاق آمیز نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔ اسے خاموش پا کر وہ بولی۔

"ملکہ قُتیلہ تم سے مخاطب ہے اخی بن ملکیت۔"

وہ بے پروائی سے بولا۔ "بستر چھوڑنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔"

قُتیلہ دوبارہ بولی۔ "اتنے جسیم جوان کو مردِ میدان ہونا چاہیے۔"

"ہونہہ۔" اس نے طنزیہ ہنکارا بھرا۔ "اگر جنگ جسامت سے لڑی جاتی تو ابوالحارث کو اونٹ کا لقمہ بننا پڑتا۔"

قُتیلہ کے ہونٹوں پر تبسم نمودار ہوا۔ "کبھی تلوار بھی پکڑی ہے یا فقط باتیں کرنا سیکھی ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ہاتھ میں پکڑی تلوار یشکر کے سامنے پھینکی۔ امریل اور ملکان بھی ان کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

یشکر نے ایک نظر پاؤں میں پڑی تلوار کی طرف دیکھا۔ اور پھر آہستگی سے جھکتے ہوئے اس کا ہاتھ تلوار کی طرف بڑھا۔ اسی وقت دماغ میں سکندر کی آواز ابھری۔

"یاد رکھنا بیٹا، ایک اچھا شمشیر زن ہمیشہ تلوار کو دستے سے پکڑتا ہے۔ اس کے علاوہ تلوار کو کسی بھی جگہ سے نہیں تھاما جاتا۔ اور دستے کو پکڑتے وقت ہاتھ کی گرفت مضبوط تو ہونی چاہیے، سخت نہ ہو۔ چاروں انگلیاں یوں لپٹی ہوں۔" سکندر نے اپنا ہاتھ دستے پر جما کر دکھایا۔ "اور انگوٹھا اس جگہ پر رکھا ہو۔"

اس کے لبوں پر مسکراہٹ ابھری، ہونٹ بھینچتے ہوئے اس نے مسکراہٹ کو دور کیا اور تلوار کو درمیان سے پکڑ کر اوپر اٹھا لیا۔

ملکان، رشاقہ اور امریل قہقہہ لگا کر ہنس دیے تھے۔ قُتیلہ بھی متبسم ہوئی۔

یشکر نے تلوار امریل کی جانب بڑھا دی۔ کیوں کہ وہ ان چاروں میں سب سے زیادہ امریل سے مانوس تھا۔ امریل روزانہ ایک مرتبہ ان کے خیمے میں ضرور آتا تھا۔ اور اس کی آمد کی غرض و غایت یشکر کو اچھی طرح معلوم تھی۔ گو اس نے کبھی اظہار نہیں کیا تھا لیکن یشکر اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ خلیسہ سے محبت کرتا تھا۔ یہ بات خلیسہ کو بھی معلوم تھی، مگر جان بوجھ کر نظر انداز کیے رکھتی کہ وہ خود یشکر کے پیچھے

پڑی تھی۔

"ملکہ قتیلہ کا خیال ہے اس ناکارہ لاش کے بجائے غلیسہ پر محنت کی جائے تو کم از کم وہ تلوار تو پکڑنا تو سیکھ جائے گی۔"

رشاقہ اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔"اگر ملکہ کی اجازت ہو تو میں اسے تربیت دینا پسند کروں گی۔"

قتیلہ طنزیہ لہجے میں بولی۔"تم شاید وقت ضایع کرنے کی زیادہ شوقین ہو۔"

رشاقہ مصر ہوئی۔"مجھے لگتا ہے یہ سیکھ جائے گا۔"اس کی نظریں مسلسل یشکر پر گڑی تھیں۔

قتیلہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔"کیا خیال ہے جوان، تلوار پکڑنا سیکھنا چاہو گے۔"

"خود سیکھنے والی مجھے کیا سکھائے گی۔میرا مطلب یہ خود اب تک آپ سے تربیت لے رہی ہے۔"

قتیلہ استہزائی انداز میں ہنسی۔"تو کیا ملکہ قتیلہ کا شاگرد بننا ہے۔"

یشکر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔سحر بھری دنبالہ آنکھوں نے اس کے دل کی دھڑکن بڑھا دی تھی۔اپنی غیر ہوتی حالت پر قابو پاتے ہوئے وہ بے پروائی سے بولا۔"مجھے نہیں لگتا کہ آپ کے پاس کوئی ایسا پینترہ ہے جسے سیکھنے کی مجھے ضرورت ہو۔"

ملکان،امریل اور رشاقہ نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا۔قتیلہ کے ملیح چہرے پر ہلکی سی سرخی جھلکی، دنبالہ آنکھوں میں غصے کی جھلک ابھری،لیکن جب بولی تو لہجے میں تندی نہیں تھی۔

"جسے تلوار تھامنے کا پتا نہ ہو اس کے ہونٹوں پر ایسی بڑھکیں نہیں سجتیں۔"

یشکر اس کی بات کا جواب دیے بغیر بولا۔"اگر سردارن کی اجازت ہو تو میں اپنے خیمے میں واپس جانا چاہوں گا۔"

"ملکہ قتیلہ کو لوگ ملکہ قتیلہ کہتے ہیں۔"

"کہتے ہیں یا کہلواتی ہو۔"یشکر کا لہجہ تو نہیں البتہ الفاظ استہزائی تھے۔

قتیلہ کے لہجے میں غصہ شامل ہونے لگا تھا۔"اس سے فرق نہیں پڑتا۔"

یشکر نے کندھے اچکائے۔"حالانکہ شیر کی پہچان نام سے نہیں کام سے ہوتی ہے۔"

"ملکہ قتیلہ فلسفے سننے کی عادی نہیں ہے۔"قتیلہ کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔

"اگر ملکہ کی اجازت ہو تو میں واپس خیمے میں جانا چاہوں گا۔"یشکر نے مزید اصرار مناسب نہیں سمجھا تھا۔نہ وہ لڑنا چاہتا تھا اور نہ لڑنے کی حالت میں تھا۔

وہ زہر خند لہجے میں بولی۔"کوشش کرنا کہ ملکہ قتیلہ ایک بزدل،کاہل اور ناپسندیدہ شخص کی دید

سے محروم رہے۔اور یہ درخواست نہیں ہے۔''[1]

بشنر کے ہونٹ کچھ کہنے کو لرزے مگر پھر وہ خاموشی سے خیمے کی طرف بڑھ گیا۔

''ملکہ قتیلہ نہیں جانتی تھی کہ وہ ایک گھٹیا شخص کو بنوطریہ میں خوش آمدید کہہ رہی ہے۔''اس کے جانے کے بعد بھی قتیلہ کا غصہ نہیں اترا تھا۔

''درگزر کریں ملکہ، ہم اپنی مشق کرتے ہیں۔''رشاقہ نے ہاتھ تھام کر اس کا غصہ کم کرنے کی کوشش کی۔

''تم لوگ کرو۔'' قتیلہ کی برہمی کم نہیں ہوئی تھی۔سردار بننے کے بعد وہ بتدریج اپنے غصے کو قابو کرنے کی کوشش کر رہی تھی ورنہ پہلے کسی نے اس انداز میں بات کی ہوتی تو وہ اپنی تلوار کو نہ روکتی۔مگر اب وہ بنوطریہ کی تعداد میں اضافہ چاہتی تھی۔چھوٹی چھوٹی باتوں پر غصہ ہو کر اگر وہ لوگوں کے سر اتارنا شروع کر دیتی تو لوگ وہاں سے غائب ہونا شروع ہو جاتے۔اس کا باپ کہا کرتا تھا ''جو اپنے غصے پر قابو نہیں رکھ سکتا وہ سرداری کا اہل نہیں ہے۔''اور وہ نااہل سردار نہیں کہلانا چاہتی تھی۔

ریت کے ٹیلے پر بیٹھ کر وہ اپنے آدمیوں کو تربیت کرتا دیکھنے لگی۔رشاقہ نے اس کے عقب میں بیٹھ کر قصاوا (ماتھے پر باندھی پٹی) کھول کر اس کے سبھی گھنے بالوں کو آزاد کر دیا تھا۔

''ملکہ قتیلہ کی برہمی میری سمجھ سے باہر ہے۔'' وہ اس کے بالوں کی مینڈھیاں بنانے لگی۔

''تو نفرت پہ بات ہوئے بولی۔ ''ملکہ قتیلہ کو بزدلوں سے نفرت ہے۔''

''ملکہ تو یہ کیسے پتا ہے؟''رشاقہ نے اس کی دماغی رو عریسہ کی جانب موڑی۔

بیٹا اپنی قتیلہ کی ناگواری ایک دم کافور ہوئی تھی۔وہ خوش دلی سے مسکرائی۔''ملکہ قتیلہ کا خیال ہے مزید دیر کرنا مناسب نہ ہوگا۔''

''پھر کب؟''رشاقہ نے دو لفظوں میں پورا سوال دہرایا تھا۔

''اگر رب نے چاہا تو ملکہ قتیلہ کل کا سورج رستے میں طلوع ہوتا دیکھے گی۔''

رات کو کھانے کے بعد اس نے منقر بن اسیح، اصرم بن خسار اور قریب بن فصیح کو بلا کر قبیلے کا دھیان رکھنے کی ہدایات دیں اور امریل اور مکان کو صبح صادق کے وقت تیار رہنے کا حکم دے دیا۔

☆☆☆

''آپ غصے میں لگ رہے ہیں۔''خلیسہ اس کا چہرہ دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی کہ وہ برہم ہے۔

وہ بے پروائی سے بولا۔''غصے کی وجہ کم از کم آپ نہیں ہیں۔''

---

[1] مطلب، حکم ہے۔

"یہ میرے لیے خوشی کی بات ہے۔" گود میں اٹھائے بچے کو بستر پر لٹاتے ہوئے وہ اس کے قریب ہوئی۔ "مگر پھر بھی آپ کو برہم نہیں دیکھ سکتی۔"

"یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔" اس نے خلیسہ کو دور ہٹانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

وہ شاکی ہوئی۔ "مجھے اکیلا چھوڑ دو گے۔"

"خلیسہ، مجھے فارس جانا ہے۔ اب یہاں میرا گزارا نہیں ہوسکتا۔"

وہ ملتجی ہوئی۔ "مجھے بھی ساتھ لے جاؤ۔"

وہ ملائمت سے بولا۔ "بہت طویل سفر ہے۔ اور میرے دشمنوں کی تعداد بھی کافی زیادہ ہے۔ میں اپنی عزیز ترین ہستی کی حفاظت نہ کر سکا تمھیں کیا تحفظ دوں گا۔ بہتر یہی ہوگا کہ کسی ایسے کا پلو تھام لو جو تمھاری قدر کرنا جانتا ہو۔"

وہ بے نیازی سے بولی۔ "مگر مجھے آپ اچھے لگتے ہیں۔"

"جانتا ہوں، مگر تمھارے لیے وہ بہتر رہے گا جسے تم اچھی لگتی ہو۔"

خلیسہ نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "امریل نے آپ سے کچھ کہا ہے۔"

"نہیں، مگر میں جانتا ہوں وہ تمھیں بہت خوش رکھے گا۔ اس کی آنکھوں میں تمھارے لیے ہوس نہیں، محبت ہے۔"

وہ بجھے دل سے بولی۔ "کب جاؤ گے؟"

یشکر ہنسا۔ "دو تین دن تمھارے ساتھ ہوں۔"

اس کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے خلیسہ لجاجت سے بولی۔ "کم از کم پندرہ دن۔"

یشکر نے اس کی ٹھوڑی کو انگلی سے اوپر اٹھاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "وعدہ کرو، اس کے بعد نہیں روکو گی۔"

"وعدہ خلافی کرانا چاہتے ہو۔" خلیسہ کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی ابھری تھی۔

"ہمی والی تلوار مجھے پکڑاؤ تھوڑی مشق کرلوں، مسلسل آرام سے جسم خراب ہونے لگا ہے۔" اسے جذباتی ہوتا دیکھ کر یشکر کھڑا ہو گیا تھا۔

"اتنی گرمی میں۔" خلیسہ نے حیرانی ظاہر کی۔ "سورج کافی اوپر آ گیا ہے۔"

"ابو جان فرمایا کرتے تھے، موسم کے اثرات کو نہ جھیل سکنے والے جنگجو کی جیت میں سب سے بڑی رکاوٹ موسم ہی ڈالتا ہے۔"

خلیسہ نے خیمے کے کونے میں رکھے لکڑی کے صندوق سے میان میں بند ہمی والی تلوار نکالی اور

اس کی جانب بڑھاتے ہوئے اشتیاق سے پوچھنے لگی۔ ''ملکہ قتیلہ سے مقابلہ کرلو گے؟''

''جلد ہی یہ لمحات آنے والے ہیں خود دیکھ لینا'' معنی خیز لہجے میں کہتے ہوئے اس نے تلوار پکڑی اور خیمے سے باہر آ گیا۔ سورج کافی اوپر آ گیا تھا۔ مشق کرنے والے آرام کی نیت سے خیموں اور درختوں کی چھاؤں کے نیچے سمٹ گئے تھے۔ وہ اطمینان بھرے انداز میں چلتا ہوا تربیتی میدان سے گزر کر ٹیلوں کے عقب میں پہنچا۔ وہاں وہ لوگوں کی نظر سے اوجھل تھا۔

دھوپ نے اس کے جسم کے سارے مسام کھول دیے تھے پسینہ دھاروں کی صورت میں اس کے جسم پر بہنے لگا تھا۔ مگر وہ تپتی ریت اور آگ برساتا سورج اس کے لیے نئی چیز نہیں تھی۔ سکندر نے دوران تربیت اسے موسم کی سختیوں کا عادی بنانے کا خوب اہتمام کیا تھا۔ اب موسم کی ٹھنڈک و تمازت اس کے لیے ثانوی حیثیت رکھتی تھیں۔

دور نظر آنے والے درختوں کے جھنڈ کو نگاہ میں رکھ کر وہ درمیانی رفتار سے دوڑنے لگا۔ کوس بھر کا فاصلہ طے کر کے وہ وہاں پہنچا۔ کافی دنوں سے مشق نہ کرنے کی وجہ سے اس کا سانس چڑھ گیا تھا۔ درختوں کے جھنڈ میں جا کر وہ خیالی دشمن کے خلاف تلوار گھمانے لگا۔ ہتھیاروں میں سب سے پسند اسے تلوار تھی۔ اور اس نے ہمیشہ ہر ہتھیار پر تلوار کو ترجیح دی تھی۔ تربیت کے آخری دنوں میں بھی سکندر دوسرے ہتھیاروں کے استعمال میں تو اس کی کوئی نہ کوئی خامی ڈھونڈ لیتا تھا مگر تلوار بازی میں برملا کہتا تھا کہ اس میدان میں یشفر اس سے بھی بہتر ہے۔

سورج کا جھکاؤ مغرب کی جانب واضح ہو گیا تھا جب تلوار میان میں ڈال کر اس نے مشق ختم کی۔ اسے شدت کی پیاس لگی تھی مگر بقول سکندر پیاس برداشت کرنا بھی تربیت کا حصہ تھا۔

وہ درمیانی رفتار سے دوڑتے ہوئے بنو طریف کی طرف بڑھنے لگا۔ قبیلے کی حدود میں داخل ہوتے ہی اس نے دوڑنا بند کیا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا اپنے خیمے کی طرف بڑھ گیا۔ لوگ اب تک خیموں اور درختوں کی چھاؤں میں آرام کر رہے تھے۔

☆☆☆

''وتینہ اور سلمٰی کے ساتھ میں تمھاری ذمہ داری سے بھی سبک دوش ہونا چاہتا ہوں'' رات کے کھانے کے بعد شریم نے بادیہ کو حجرے میں طلب کر کے بغیر کسی تمہید کے اپنا منشا واضح کیا۔

وہ سر جھکاتے ہوئے بولی۔ ''میں تیار نہیں ہوں چچا جان۔''

شریم مصر ہوا۔ ''بہتر یہی ہو گا کہ قبیلے کے کسی جوان کا ہاتھ تھام لو۔ کسی دوسرے قبیلے کے سردارزادے کی تلاش میں اندیشہ ہے کہ بنو نوفل والے تمھاری موجودگی سے باخبر ہو جائیں گے۔''

وہ صاف گوئی سے بولی۔ ''مجھے نہ کسی اعلا نسب شخص کی تمنا ہے اور نہ ادنیٰ سے رشتا جوڑ کر حالات سے فرار کی خواہش ہے۔ یشکر کی جگہ میں کسی کو نہیں دے سکتی۔''

''یشکر کی جگہ تمھارے دل میں ہے۔ ضروری نہیں کہ اپنے شوہر کو تم دل میں بھی جگہ دو، لیکن زندگی گزارنے کے لیے کسی ساتھی کی ضرورت تو پڑے گی نا؟''

بادیہ نے دلیل دی۔ ''عریسہ چچی نے بھی تو ساری زندگی شوہر کے بغیر بتائی ہے۔''

شریم ترکی بہ ترکی بولا۔ ''مگر اب شادی کر لی ہے نا۔''

''مجھے بھی جب ضروری لگے گا آپ کو بتا دوں گی، مگر فی الحال نہیں۔ یشکر نے کہا تھا جو میاں بیوی، اہورمزدا کو مانتے ہیں وہ مرنے کے بعد بہشت میں اکٹھے ہوں گے۔ اور میں نہیں چاہتی کہ کسی دوسرے سے تعلق رکھنے کے بعد یشکر مجھے بہشت میں بھی نہ ملے۔''

اسی وقت عریسہ حجرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔ ''سردار! اسے تھوڑی مہلت دو، بیٹی اتنی جلدی شادی کے لیے تیار نہیں ہوسکتی۔'' شاید اس نے باہر کھڑے ہو کر ان کی گفتگو سنی تھی۔

بادیہ فوراً ہی اس سے لپٹ کر سسکیاں بھرنے لگی۔

''ٹھیک ہے، جو مرضی آئے کرو مگر رونا بند کرو۔'' شریم نے شفقت بھرے انداز میں اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر حجرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

دھوپ کے تیز ہوتے ہی انھوں نے مناسب جگہ پر گھوڑے روک دیے تھے۔ گھوڑوں سے زینیں اتار کر امریل نے ایک درخت کے نیچے باندھے اور توبڑوں میں جو گیلے کر کے توبڑے گھوڑوں کے منہ پر چڑھا دیے۔ ملکان نے قتیلہ کے لیٹنے کی جگہ پر چادر بچھائی، زین سر کے نیچے رکھ کر وہ لیٹ گئی تھی۔

گھوڑوں کو سنبھال کے امریل واپس آیا اور درخت کی شاخوں سے کپڑا باندھ کر قتیلہ کے لیے ہوا کا بندوبست کرنے لگا۔

''امریل میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔'' قتیلہ نے اسے روکنے کی واجبی سی کوشش کی لیکن اتنا تو اسے بھی معلوم تھا کہ امریل اس کی یہ بات نہیں سنے گا۔

وہ بے پروائی سے بولا۔ ''آپ آرام کریں مالکن، مجھے نیند آئے گی تو سو جاؤں گا۔''

ملکان معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''اب اس بے چارے کو نیند کہاں آئے گی ملکہ۔''

''کیوں؟'' قتیلہ حیران ہو کر ملکان کی طرف متوجہ ہوئی۔

''ملکان، بکواس کی ضرورت نہیں ہے۔'' امریل نے جھینپتے ہوئے اسے منع کرنا چاہا۔

ملکان اسے نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ’’اسے محبت ہوگئی ہے ملکہ۔‘‘
’’کیا...‘‘ قُتیلہ حیرانی سے اٹھ بیٹھی۔ ’’کون ہے وہ؟‘‘
ملکان نے قہقہہ لگایا۔ ’’ہے ایک سنہرانہ۔‘‘
قُتیلہ نے سوالیہ انداز میں کہا۔ ’’خلیسہ ......؟‘‘ ملکان کے اثبات میں سر ہلانے پر وہ بولی۔ ’’مگر وہ تو شادی شدہ ہے۔‘‘
’’ہاں ناں۔‘‘ ملکان نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ ’’اور اس کا شوہر ملکہ قُتیلہ کو خاطر میں نہیں لاتا امریل کو خاک گھاس ڈالے گا۔‘‘
قُتیلہ کھل کھلا کر ہنسی۔ ’’امریل، یہ سچ کہہ رہا ہے؟‘‘
امریل نے ندامت سے سر جھکا لیا تھا۔
وہ شرارتی لہجے میں بولی۔ ’’آسان سا حل ہے، اعمٰی بن مکیث کی گردن اتار دو، ملکہ قُتیلہ سنہرانہ کو تمھاری زوجیت میں دے دے گی۔‘‘
’’اعمٰی کی گردن اتارنا مشکل نہیں ہے، مگر اس طرح وہ خفا ہوجائے گی اور میں اس کی ناراضی برداشت نہیں کر سکتا۔‘‘ امریل سنجیدہ تھا۔
’’پھر اسے اعمٰی سے طلاق لینے پر راضی کرو باقی ملکہ قُتیلہ سنبھال لے گی۔‘‘
امریل دکھی ہوتا ہوا بولا۔ ’’مجھے نہیں لگتا وہ ایک حبشی غلام کے لیے اعمٰی جیسے خوب صورت جوان سے طلاق لینے پر راضی ہوگی۔‘‘
قُتیلہ نفرت سے بولی۔ ’’ملکہ قُتیلہ ایک لڑکی ہونے کی حیثیت سے کہتی ہے کہ ایک خوب صورت بزدل سے بہادر حبشی ہزار گنا بہتر ہے۔ باقی تم حلماً غلام نہیں آزاد ہو۔‘‘
ملکان نے شرارتی انداز میں کہا۔ ’’اگر امریل، رشاقہ کی منت کرے تو وہ اعمٰی کو اپنا اسیر بنا کر اسے سنہرانہ کو طلاق دینے پر مجبور کر سکتی ہے۔ ویسے بھی مجھے محسوس ہو رہا ہے وہ اعمٰی کی ذات میں دلچسپی رکھتی ہے۔‘‘
امریل سرعت سے بولا۔ ’’اس سفید لومڑی کی منت کرنے سے بہتر ہے میں خودکشی کرلوں۔‘‘
قُتیلہ کی نقرئی ہنسی بلند ہوئی۔ وہ امریل کی حالت سے محظوظ ہو رہی تھی۔ ’’ویسے ملکان کا مشورہ ملکہ قُتیلہ کے بھی دل کو لگ رہا ہے۔‘‘
ملکان، امریل کو چھیڑتا ہوا بولا۔ ’’اصل میں اس کا عشق ناقص ہے ملکہ، ورنہ ملکان نے طبقہ کو پانے کے لیے اس کے تین شوہروں کی گردنیں کاٹی ہیں۔‘‘

قُتیلہ نے مزاحیہ انداز میں تصحیح کی۔ ''دو کی، تیسرے کا خاتمہ ملکہ قُتیلہ کے ہاتھوں ہوا تھا۔''
ملکان جلدی سے بولا۔ ''ایک ہی بات ہے اگر ملکہ قُتیلہ پہل نہ کرتی تو میں اسے مار دیتا۔''
وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔ ''لگتا ہے اب بھی ملکہ قُتیلہ ہی کو پہل کرنا پڑے گی۔''
ملکان نے لقمہ دیا۔ ''ہاں اس طرح امریل کی سنہرانہ بھی اس سے خفا نہیں ہوگی۔''
''کیا خیال ہے امریل؟'' قُتیلہ نے اس کی رائے جاننا چاہی۔
امریل دھیرے سے بولا۔ ''ملکہ قُتیلہ بہت اچھی ہے۔''
قُتیلہ ہنسی۔ ''سنہرانہ سے بھی۔''
امریل بولا۔ ''وہ محبت ہے، آپ عقیدت ہیں۔''
وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔ ''یہ نہ ہو کل ملکہ قُتیلہ محبت بن جائے۔''
امریل معصومانہ لہجے میں بولا۔ ''امریل کی گردن کے لیے بہترین جگہ اس کے شانے ہیں، اور اگر ایک دفعہ یہ یہاں سے ہٹا دی گئی تو دوبارہ جوڑی نہیں جا سکے گی۔''
ملکان اور قُتیلہ نے زوردار قہقہہ لگایا تھا۔ قُتیلہ سخاوت سے بولی۔ ''تم ملکہ قُتیلہ کے خصوصی غلام ہو امریل، اور ملکہ قُتیلہ تمھیں سوچنے کا ایک موقع ضرور دے گی۔''
امریل مزاحیہ انداز میں بولا۔ ''غصے کے وقت عموماً وعدے بھول جایا کرتے ہیں۔ اور یہ بھی سنا ہے کہ جب گردن دھڑ سے علاحدہ ہو جائے تو انسان بات چیت کے قابل نہیں رہتا۔ ایسی حالت میں ملکہ قُتیلہ کو کیسے اس کے وعدے یاد دلاؤں گا۔ ناں جی ناں امریل کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں۔''
قُتیلہ مصنوعی ناراضی سے بولی۔ ''یاد کرو امریل، ملکہ قُتیلہ نے تمھاری جسارت کے باوجود تمھیں معاف کر دیا تھا۔''
امریل عقیدت سے بولا۔ ''کیوں کہ ملکہ قُتیلہ بہت اچھی ہے۔''
''ملکہ قُتیلہ کو نیند آ رہی ہے۔'' آنکھیں بند کرتے ہوئے اس نے بحث ختم کرنے کا اعلان کیا۔
امریل خاموشی سے کپڑا اجھنے لگا۔

☆☆☆

قُتیلہ، ملکان اور امریل کے قبیلے سے نکلنے کے تھوڑی دیر بعد ایک اور گھڑ سوار بنوطرید سے باہر نکلا۔ وہ ضحاک بن عتیک تھا۔ قُتیلہ کی ٹولی کا رخ شمال مشرق کی جانب تھا جبکہ اس نے شمال کا رخ کیا تھا۔ بنوطرید کی حدود تک وہ گھوڑے کی لگام تھام کر گیا تھا۔ ذرا سا دور آتے ہی وہ سوار ہوا اور گھوڑے کو سرپٹ دوڑا دیا۔ دھوپ تیز ہونے کے بعد بھی اس کا سفر جاری رہا تھا۔ نصف النہار کے وقت اس نے

ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ کر دو تین گھڑیاں آرام کیا اور پھر چل پڑا۔ رات کو بھی اس نے بہت کم آرام کیا تھا۔ یقیناً وہ جلد از جلد بنوطرید سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔

بھاگنے کے لیے اس نے جان بوجھ کر ایسے وقت کا چناؤ کیا تھا جب قُتیلہ قبیلے میں حاضر نہیں تھی۔ کیوں کہ وہ ذرا سا خطرہ بھی مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ قُتیلہ کی پیشکش نہ ماننے والے بنوعقرب کے دونوں آدمیوں، حابس اور غیاث کے انجام کے بارے اسے منقر بن اسقح اور رشاقہ سے سن گن مل چکی تھی۔

اگلے دو دن بھی سفر میں گزار کر، تیسرے دن کے آغاز کے ساتھ وہ بنواحمر کی حدود میں داخل ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بنواحمر کے سردار نجار بن ثابت کے سامنے بیٹھا اپنی آمد کی غرض و غایت پر روشنی ڈال رہا تھا۔ قبیلے کے چند معززین کے علاوہ سردار کا دست راست قدامہ بن شیبان بھی وہاں موجود تھا۔ قدامہ اس کا چچیرا بھائی تھا۔

ضحاک کی بات ختم ہوتے ہی نجار بن ثابت نے منھ بناتے ہوئے کہا۔ ''قُتیلہ کو تمھارے حوالے کرنے کی شرط پر اس کا پتا معلوم کرنے میں میرا کیا فائدہ ہے جوان۔ میں بس اسے اپنی لونڈی دیکھنا چاہتا ہوں اور بنواحمر کے سردار کی لونڈی میں کوئی غیر کیسے شریک ہوسکتا ہے۔''

ضحاک امید بھرے لہجے میں بولا۔ ''سردار اپنا بدلہ لینے کے بعد اسے میرے حوالے کرسکتا ہے، تاکہ میں اس کے غرور کو پاؤں تلے روند سکوں۔''

''ناممکن۔'' نجار بن ثابت نے نفی میں سرہلایا۔ ''وہ ایسی دوشیزہ نہیں ہے جس سے جلد سیر ہوا جائے۔''

ضحاک نے قُتیلہ کے حصول سے مایوس ہوکر اگلا مطالبہ پیش کیا۔ ''پھر بنواحمر کی کسی خوب صورت دوشیزہ سے میری شادی کی جائے۔ اس کے علاوہ دس آدمیوں[1] کے خون بہا کے بہ قدر اونٹ اور بنواحمر کی شہریت عنایت کی جائے۔''

بنواحمر کا ایک معمر معزز بولا۔ ''ایک دوشیزہ اتنی مہنگی نہیں ہوسکتی۔''

ضحاک مکاری سے بولا۔ ''محترم، وہ صرف دوشیزہ نہیں ایک اعلا نسب سردار زادی ہے۔ صورت کے لحاظ سے صحرائے اعظم کی دوشیزاؤں میں سرفہرست ہے بنوطرید کی سردارن ہے، اور بنواحمر کے دو سرداروں کی قاتل ہے۔ اس کا آزاد گھومتے رہنا قبایل عرب میں بنواحمر کی عزت کو خاک میں ملا دے گا۔'' عامر بن اسود سے گپ شپ کرتے ہوئے اسے قُتیلہ کی ساری کہانی معلوم ہوئی تھی اور اب اسی کو بنیاد بنا کر وہ بنواحمر کے معززین پر دھونس جما رہا تھا۔

---

[1] مطلب سو اونٹ۔

سردار کا دست راست قدامہ بن شیبان بولا۔ ''اونٹ نو یا موخر الذکر دو شرائط پوری کراؤ۔''
ضحاک حتمی لہجے میں بولا۔ ''اچھا اونٹوں کی تعداد نصف کردو اور یہ آخری پیشکش ہے۔ اگر منظور نہیں ہے تو سردارزادی قُتیلہ کے طلب گار کافی ہیں میں کسی اور سے رابطہ کرلوں گا۔''
نجار بن ثابت بے صبری سے بولا۔ ''منظور ہے۔ اب تم جلدی سے اس کے چھپنے کی جگہ کے بارے بتاؤ میں کل تک اسے اپنے بستر پر دیکھنا چاہتا ہوں۔''
ضحاک معنی خیز لہجے میں پوچھا۔ ''کتنے جنگجو قتل کرانا برداشت کرلو گے؟''
نجار نے فخریہ لہجے میں کہا۔ ''میں پانچ سو جنگجو میدان میں لا سکتا ہوں۔''
ضحاک نے کہا۔ ''سردار، میرا سوال کچھ اور تھا۔ میں نے پوچھا ہے قُتیلہ کے حصول کے لیے کتنے جنگجو قتل کرا سکتے ہو۔''
''کیا مطلب؟'' قدامہ بن شیبان نے حیرانی ظاہر کی۔
''سردارزادی آج کل ملکہ قُتیلہ کہلاتی ہے، اس کے لشکر میں کم از کم پچاس، ساٹھ سے زیادہ جنگجو ہیں۔ ان کے علاوہ دو تین درجن مراہق لڑکوں ولڑکیوں کو اس نے تیر اندازی کی تربیت دے رکھی ہے۔ وہ تمام اپنی سردارن کو بچانے کے لیے بے جگری سے مقابلہ کریں گے۔ دو درجن بندوں کو تو سردارزادی اور اس کا حبشی غلام امریل ہی ذبح کر دیں گے۔ اور یہ بھی دھیان میں رہے اپنے قبیلے میں اس نے پہرے داری کا عمدہ انتظام کر رکھا ہے۔ صبح سے شام اور پھر صبح تک دیدبان کسی بھی لمحے اپنی ذمہ داریوں سے غافل نہیں ہوتے۔ میرے اندازے میں آپ ایک تہائی لشکر کو تباہ کروا کر ہی اس پر قابو پا سکیں گے، بلکہ ایسی حالت وہ زندہ گرفتار ہونے کے بجائے موت کو گلے لگانا پسند کرے گی۔''
''امریل بن خرشہ اس کا غلام ہے؟'' نجار نے ساری تفصیلات سن کر صرف ایک بات پر حیرانی کا اظہار کیا تھا۔
''وفادار ترین غلام ہے۔ یوں کہ وہ لیٹی ہوتی ہے اور امریل اس پر کپڑا جھل رہا ہوتا ہے۔''
''امریل جیسے جنگجو سے مجھے یہ امید نہیں تھی۔'' نجار کے لہجے میں افسوس بھرا تھا۔
ضحاک قُتیلہ کی تعریف میں رطب اللسان ہوا اور بولتا چلا گیا۔ ''امریل جیسا جنگجو اس کی شمشیر زنی کے سامنے زیادہ دیر نہیں ٹک سکتا۔ پتا نہیں وہ چھلاوہ ہے، چڑیل ہے یا بھتنی ہے۔ تلوار اس کے ہاتھوں میں بجلی کی طرح لہرا رہی ہوتی ہے۔ اس کا جسم بگولے کی رفتار سے حرکت کرتا ہے۔ اس کا وار بجلی کے

[illegible]

کوندے کی طرح مخالف کی طرف لپکتا ہے۔ رِھار[1] کی طرح تھکنے میں نہیں آتی۔ مقابل کا ہر وار وہ اس خوب صورتی سے خطا کرتی ہے کہ ماہر شمشیر زن بھی اناڑی معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اس کا جسم دیکھنے میں روئی کے گولے، مکھن کے پیڑے اور بالائی جیسا ملائم لگتا ہے مگر حقیقت میں اس کے اعضاء غضاء کی لکڑی کی طرح سخت اور مضبوط ہیں۔ اس کے پُرکشش جسم میں اتنی طاقت چھپی ہے کہ لات مار کر امریل جیسے شہ زور کو یوں زمین بوس کرتی ہے جیسے اناڑی سوار کو اڑیل گھوڑا نیچے گراتا ہے۔ اس کی ڈھال صرف وار روکنے کے کام نہیں آتی وہ اس کو مقابل کے خلاف بہ طور ہتھیار بھی استعمال کرتی ہے۔ وہ سچ میں ملکہ قُتیلہ ہے۔''

بنو احمر کے ایک معزّز نے منھ بنایا۔ ''تم ہمیں مرعوب کرنے کی ناکام کوشش کر رہے ہو جوان۔''

''نہیں۔'' ضحاک نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میری نظر میں صحرائے اعظم کا بہترین جنگجو میرا استاد زیاد بن تابوت تھا۔ لیکن سردار زادی کی شمشیر زنی دیکھ کر میں اپنے رائے پر قائم نہ رہ سکا۔ یقین کرو اگر آج زیاد بن تابوت زندہ ہوتا تو اس چھوکری کی شاگردی کرنے میں دلچسپی ظاہر کرتا۔''

قدامہ پُرخیال لہجے میں بولا۔ ''اس کا مطلب ہے غراب بن ارصاد ٹھیک کہہ رہا تھا کہ قُتیلہ نے مکے مار مار کر امریل کو بے ہوش کر دیا تھا۔''

''میرے پاس ایک اور پیشکش ہے۔'' قُتیلہ کی حقیقت ان کے سامنے کھول کر بیان کرنے کے بعد ضحاک نے پہلے سے سوچے منصوبے کی طرف ایک اور قدم بڑھایا۔

''بتاؤ۔'' گہری سوچ میں ڈوبے نجار نے بددلی سے کہا۔

''ایک ایسی تجویز ہے جس پر عمل کر کے ہم بغیر کوئی نقصان اٹھائے نہ صرف سردار زادی کو قابو میں کر سکتے ہیں بلکہ پورے بنو طرید پر قبض ہو سکتے ہیں۔''

''ہم سننا چاہیں گے۔'' سردار نجار بن ثابت نے دلچسپی ظاہر کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

وہ چالاکی سے بولا۔ ''میرا ایک مطالبہ پورا کرنا پڑے گا۔''

قدامہ تلخی سے بولا۔ ''تم پہلے ہی تین مطالبے پیش کر چکے ہو۔''

''ٹھیک ہے، میں بنو احمر کے اونٹوں کے مطالبے سے دست بردار ہونے پر تیار ہوں۔ اب میرا مطالبہ یہ ہے کہ بنو طرید پر قبضے کے بعد جتنے اونٹ ہاتھ آئیں گے وہ تمام میرے ہوں گے۔ اس کے علاوہ قُتیلہ کی خاص ہم جولی رشاقہ بنت زیاد بن تابوت بھی میری ہوگی۔ اور میں ایک ایسی تجویز بتاؤں گا جس سے آپ بغیر خون خرابہ کیے بنو طرید پر آسانی سے قبضہ کر لیں گے۔''

---

[1] سرخ یا سفید رنگ کے اعلا نسل کے اونٹ جو سفری صعوبتیں برداشت کرنے میں بہت عمدہ ہوتے ہیں۔

نجار نے حجت پیش کی۔ ''ایک قبیلے کے تمام اونٹوں کا ایک ہی شخص کے قبضے میں جانا اسے سردارِ قبیلہ سے بھی امیر کر دے گا۔''

ضحاک مکاری سے بولا۔ ''سو سے زیادہ لونڈیاں و غلام، سو کے قریب عمدہ نسل کے گھوڑے، اتنے ہی خیمے، بیش بہا اسلحہ، ہزار کے قریب بھیڑ بکریاں، بیسیوں گدھے، درجنوں خچر اور صحرائے اعظم کی انوکھی حسینہ سرِدارزادی ملکہ قُتیلہ بنت جبلہ۔ یہ سب پا کر بھی اگر بنو احمر کا سردار سمجھتا ہے کہ وہ گھاٹے کا سودا کر رہا ہے تو یقیناً اس کی سوچ عدل کے منافی ہے۔''

''منظور ہے۔'' اس مرتبہ سردار نجار نے سوچنے میں لمحہ بھی ضایع نہیں کیا تھا۔

ضحاک کے ہونٹوں پر اطمینان بھری مسکراہٹ ابھری۔ ''ٹھیک ہے، مجھے سردار کی زبان پر مکمل بھروسہ ہے ......'' لمحہ بھر رک کر وہ کہنے لگا۔ ''ہمیں زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو درجن جنگجوؤں کی ضرورت پڑے گی۔ کرنا کچھ یوں ہے کہ ....'' وہ انھیں اپنے منصوبے کے بارے تفصیل سے بتانے لگا۔ تمام دلچسپی سے سننے لگے۔ اس کی بات کے اختتام پر نجار بن ثابت کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔

''قدامہ! .....'' نجار اپنے دست راست کو مخاطب ہوا۔ ''ضحاک بن عتیک کی اچھی طرح خدمت کرو۔ آج سے یہ بنو احمر کا باسی ہے۔ اور قبیلے کے بہترین شہسوار ریاب بن مجمع کی بہن حسیبہ بنت مجمع کے ساتھ آج رات کو اس کا نکاح پڑھایا جائے گا۔''

ضحاک کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔ اس نے قُتیلہ سے بدلہ لینے کے منصوبے کی طرف پہلا قدم بڑھا دیا تھا۔ گو وہ اس کے حصول میں تو ناکام رہا تھا لیکن نجار بن ثابت کی لونڈی کے روپ میں وہ اس کا جھکا ہوا سرِ ضرور دیکھ سکتا تھا۔ یقیناً اس فخّارا[1] کو اس کی حیثیت یاد دلانا ضحاک کا خواب تھا۔ اور یہ خواب جلد ہی پورا ہونے والا تھا۔

☆☆☆

''غلام کو ساتھ چلنے کی اجازت دی جائے۔'' وہ بنونسر کی آبادی کے قریب ایک اونچے ٹیلے پر موجود تھے۔ قُتیلہ کی انھیں وہیں رکنے کی ہدایت پر امریل لجاجت سے بولا تھا۔

''امریل! فیصلوں میں ترمیم کمزور ارادوں کی مظہر ہے۔ اس لیے ملکہ قُتیلہ سوچ کر فیصلہ کرتی ہے، فیصلہ کر کے نہیں سوچتی۔ اگر ضرورت ہوتی تو تمھیں ساتھ چلنے کا بتا دیا ہوتا۔''

''جی مالکن۔'' امریل نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

اپنا گھوڑا وہیں چھوڑ کر وہ بنونسر کے بے ترتیب لگے ہوئے خیموں کی طرف بڑھ گئی۔ اطمینان

---

[1] بہت زیادہ ناز کرنے، نخرے کرنے والی۔

بھرے انداز میں چلتے ہوئے وہ گھڑی بھر میں عریسہ کے خیمے کے سامنے کھڑی تھی۔اس کے لبوں پر خوب صورت مسکراہٹ ابھری اور وہ خیمے کے پردے کو بے دھڑک کھول کر اندر داخل ہوئی۔خیمے میں چراغ جل رہا تھا لیکن اس کی لو نہایت نیچی تھی۔البتہ وہ اندھیرے میں چل کر آئی تھی وہ ملگجی روشنی بھی اس کے لیے کافی تھی۔

لکڑی کے تخت پر دو جسم دیکھتے ہی وہ چونک گئی تھی۔یقیناً عریسہ کے ساتھ اس کا باپ جبلہ لیٹا تھا۔اس کے چہرے پر بدمزگی پھیل گئی تھی،باپ کی موجودگی میں وہ عریسہ سے نہیں مل سکتی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ سوچتی جبلہ کی کرخت آواز ابھری۔''مجھے معلوم تھا تم یہاں ضرور آؤ گی۔''یہ کہتے ہی وہ بستر پر اٹھ بیٹھا تھا۔درخت کے کٹے ہوئے گول تنے پر رکھے چراغ کی لو کو تیز کر کے وہ طنزیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔اسی وقت اس کے پہلو میں لیٹے وجود میں حرکت پیدا ہوئی۔اپنی سگی ماں جندلہ کو دیکھتے ہوئے قُتیلہ کا دل ناخوشگوار انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔

''ماں جی کدھر ہیں؟''اس نے سرسراتی آواز میں دریافت کیا۔

''شاید عریسہ نے تمھیں یہ نہیں بتایا کہ بنو نسر کا سردار تمھیں عاق کر چکا ہے۔''جبلہ نے طنزیہ انداز میں جتایا۔

وہ تڑخ کر بولی۔''بنو نسر کا سردار اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتا ہے۔''

جبلہ غصے سے سرخ ہوتا ہوا بولا۔''تم فوراً یہاں سے دفع ہو جاؤ ورنہ تمھاری گردن اتارنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔''

وہ منھ بگاڑ کر بولی۔''شکر ہے یہ نہیں کہا،بنو اتمر کے سردار کے حوالے کر دوں گا۔''

جبلہ دھاڑا۔''بکواس بند کرو۔''

''بنو نسر کے سردار کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ حقیقت ہے اور پورے قبائل جانتے ہیں کہ اپنی بیٹی کو نکاح میں بٹھا کر صلح کی بھیک مانگنے والا کتنا کچھ بہادر ہے۔''وہ قُتیلہ تھی اور باپ پر پوری طرح تپی ہوئی تھی۔

''قُتیلہ تم حد سے بڑھ رہی ہو۔''جندلہ نے اسے سخت لہجے میں ڈانٹا۔

''ملکہ قُتیلہ کو اس کی ماں جی کے بارے حقیقت بتائی جائے۔اگر کسی کی وجہ سے انھیں خراش بھی آئی ہوئی تو ذمہ دار کی گردن ملکہ قُتیلہ کی تلوار کا مزہ ضرور چکھے گی۔''

''تمھاری یہ جرأت کہ سردار کے خیمے میں کھڑے ہو کر دھمکیاں دو۔''غصیلے لہجے میں کہتے ہوئے جبلہ نے لکڑی کے تخت کے ساتھ کھڑا حربہ(چھوٹا نیزہ)اٹھا کر اس کی طرف پھینکا۔یہ اس کا خصوصی

ہتھیار اور داؤ تھا۔

اس کے ہاتھ کو حرکت کرتا دیکھتے ہی قتیلہ سنبھل گئی تھی۔ وہ باپ سے دس بارہ قدم دور کھڑی تھی اور اتنا مختصر فاصلہ ہونے کے باوجود اپنے سینے کی طرف بڑھتی برچھی کو اس نے ہلکا سا عقبی جانب جھک کر خطا کر دیا تھا۔

"بوڑھے سردار کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس کے سامنے ملکہ قتیلہ کھڑی ہے۔" کبھی یہ فقرہ وہ شرارت سے کہا کرتی تھی اور جبلہ اس پر بہت محظوظ ہوا کرتا تھا۔ آج قتیلہ کا لہجہ طنزیہ تھا۔ جبلہ بھڑک اٹھا تھا۔ تلوار، میان سے نکال کر وہ دھاڑتے ہوئے قتیلہ کی جانب بڑھا۔ اس کی آواز پر قریبی خیموں کے مکین جاگ گئے تھے۔

اس کا پہلا وار قتیلہ نے اچھل کر پیچھے ہٹتے ہوئے خطا کیا، ساتھ ہی اس نے کندھے سے لٹکی ڈھال اتار کر ہاتھ میں تھام لی تھی۔ جبلہ کے اگلے تین وار اس نے ڈھال پر سہارے۔ اور پھر تلوار بے نیام کر لی۔ مگر اس نے تلوار بھی صرف دفاع ہی کے لیے استعمال کی تھی۔

پے در پے حملے خطا ہوتے دیکھ کر جبلہ کا غصہ سوا ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھوں سے سیکھنے والی لڑکی آج اس کے لیے ہوا بنی ہوئی تھی۔ غصے میں وہ ہوش کھونے لگا تھا۔ اور تبھی تیزی میں درستی بھول گیا تھا۔ قتیلہ کی گردن پر زوردار وار کرنے کے لیے اس نے پوری قوت سے تلوار گھمائی۔ وہ تلوار کے سامنے اپنی ڈھال یا تلوار پکڑنے کے بجائے گھٹنوں میں ذرا سا خم ڈالتے ہوئے نیچے جھکی، جبلہ کی تلوار اس کے سر کے اوپر سے گزر گئی تھی۔ جبلہ نے اتنی زور سے وار کیا تھا کہ وہ گھوم گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مڑ پاتا، قتیلہ کی ڈھال پوری قوت سے اس کے تلوار والے ہاتھ سے ٹکرائی۔ تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر خیمے کے کونے میں جا گری تھی۔ اس کے ساتھ ہی قتیلہ نے تلوار کی نوک اس کے نرخرے پر رکھ دی تھی۔

جبلہ کا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں قہر برسا رہی تھیں۔

"رک کیوں گئیں بدنسل لڑکی، اپنا کام پورا کرو۔" دانت پیستے ہوئے اس نے طیش بھرے لہجے میں کہا تھا۔

اسی وقت ہکا بکا بیٹھی جندلہ چیختے ہوئے قتیلہ کی جانب بڑھی۔

"بے شرم، بے حیا، تمھیں باپ پر تلوار تانتے ہوئے غیرت نہیں آئی۔" اس نے قتیلہ کے چہرے پر تھپڑوں کی بارش کر دی تھی۔ قتیلہ کا ملیح چہرہ مسلسل تھپڑ پڑنے سے سرخ ہو گیا تھا مگر اس نے ماں کا ہاتھ روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ہونہہ... سے چار پانچ جوان تلواریں سونتے ہوئے خیمے میں داخل ہوئے۔ تمام نے دوسرے ہاتھ

میں مشعل تھامی ہوئی تھی۔قُتیلہ کو دیکھتے ہی ان کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تھے۔
جندلہ،قُتیلہ کے گریبان کو پکڑ کر جھٹکے دیتے ہوئے اسے کوس رہی تھی۔قُتیلہ نے کڑی نظروں سے باپ کو گھورتے ہوئے کہا۔''بہتر ہوگا ملکہ قُتیلہ کو ماں جی کے بارے حقیقت بتا دی جائے۔''
''بھول گیا ہے تمھیں کس نے جنم دیا ہے اور کون تمھاری ماں ہے۔''جندلہ نے ایک بار پھر اس کے چہرے کو نشانہ بنانے کے لیے ہاتھ اٹھایا،مگر تھپڑ مارنے کے بجائے مٹھی بھینچ کر پہلو میں گرا لیا تھا۔
وہ بے پروائی سے بولی۔''ملکہ قُتیلہ کی ماں عریسہ بنت منظر ہے۔''
''وہ یہاں سے دفع ہو گئی ہے۔جا کر کہیں اور ڈھونڈو سمجھیں۔''جندلہ نے اسے زور سے دروازے کی جانب دھکا دیا۔
''کہاں گئی ہیں۔''عریسہ کی زندگی کے بارے سن کر اس کے دل میں جلتے الاؤ پر پانی پڑ گیا تھا۔
''اپنی قُشلا[1] بیٹی کو ڈھونڈ رہی ہے۔ہمیں کیا پتا کہاں گئی ہے۔''جندلہ غصے سے کھول رہی تھی۔
''جس دن ملکہ قُتیلہ کو بوڑھے سردار کی موت کے بارے پتا چلا،ملکہ قُتیلہ اپنا حق لینے ضرور لوٹے گی۔بنونسر کے اس وقت کے سردار کے پاس ملکہ قُتیلہ کی اطاعت یا موت کے علاوہ کوئی تیسرا رستا نہیں ہوگا۔''بدتمیزی سے کہتے ہوئے وہ باہر نکل گئی تھی۔
جبلہ کے ہونٹوں سے دکھ بھرے انداز میں عربی ادب کا ایک مشہور شعر نکلا......
''میں ہر روز اسے تیر اندازی کا فن سکھایا کرتا تھا
جب اس کی کلائی زور پکڑ گئی تو اس نے مجھی کو نشانہ بنا دیا''[2]
ایک جوان نے پوچھا۔''اگر سردار کا حکم ہو تو اسے روکا جائے۔''
جبلہ نے نفی میں سر ہلایا''باپ پر تلوار سونتنے والی تمھیں قتل کرنے سے بھی نہیں چوکے گی۔اور مجھے امید نہیں ہے کہ تم اسے روکنے میں کامیاب ہو پاؤ گے۔''

☆☆☆

قُتیلہ غصے میں کھولتے ہوئے واپس پہنچی تھی۔امریل اور ماکان سخت مضطرب دکھائی دے رہے تھے۔چند آدمیوں کا مشعلیں تھام کر حرکت کرنا اور زور زور سے بولنے کی آوازیں سن کر انھیں کسی گڑبڑ کا

---

[1] بدچلن،بے حیا

[2] مالک بن فہم الازدی حیرہ وانبار کے عربوں کا پہلا بادشاہ تصور کیا جاتا ہے۔کہتے ہیں کہ اس کے بیٹے سُلیمہ نے رات کی تاریکی میں غلطی سے اسے تیر کا نشانہ بنا دیا۔جب اسے معلوم ہوا کہ اس کا قاتل اپنا ہی بیٹا ہے تو اس نے چند اشعار کہے جن میں سے یہ شعر بہت مشہور ہے۔عربوں میں خون کے رشتوں کی بے وفائی پر یہ شعر ضرب المثل کی طرح مشہور تھا۔

احساس ہو گیا تھا۔امریل تو فوراً ادھر کا رخ کرنا چاہ رہا تھا، ملکان نے بڑی مشکل سے اسے قابو کیا تھا۔اس کا خیال تھا کہ اگر قُتیلہ پکڑی جا چکی تھی تو بعد میں اسے رہا کرانا زیادہ آسان ثابت ہو سکتا تھا۔ ورنہ اسی وقت وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ وہ خود بھی پھنس سکتے تھے۔ کیوں کہ بات چند آدمیوں کی نہیں پورے قبیلے کی تھی۔ سب سے بڑھ کر قُتیلہ نے انھیں وہاں آنے سے سختی سے منع کیا تھا۔

قُتیلہ کو واپس آتا دیکھ کر انھیں اطمینان ہوا تھا۔

ان سے بات چیت کیے بغیر وہ گھوڑے پر سوار ہوئی، ایک نظر تاروں بھرے آسمان پر ڈال کر اس نے سمت کا تعین کیا اور گھوڑا دوڑا دیا۔

امریل اور ملکان خاموشی سے اس کے پیچھے بڑھ گئے تھے۔ بنونسر سے کوس بھر کے فاصلے پر آتے ہوئے اس کی غم و غصے سے لبریز آواز ابھری۔ ''اگر جبلہ بن کنانہ، ملکہ قُتیلہ کا باپ نہ ہوتا تو آج بنونسر کے باسی اپنے سردار کی موت کا سوگ منا رہے ہوتے۔''

ملکان کی آواز ابھری۔ ''ملکہ قُتیلہ نے باپ پر وار نہ کر کے عقل مندی اور حوصلے کا ثبوت دیا ہے۔''

امریل نے پوچھا۔ ''کیا انھوں نے مالکن کی ماں کو ساتھ آنے سے روک دیا؟''

''اگر ملکہ قُتیلہ کی ماں جی موجود ہوتیں تو انھیں دنیا کی کوئی طاقت ملکہ قُتیلہ کے ساتھ آنے سے نہ روک سکتی۔''

ملکان نے حیرانی کا اظہار کیا۔ ''پھر وہ کیوں نہیں آئیں؟''

وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولی۔ ''جہاں تک ملکہ قُتیلہ کا اندازہ ہے انھیں قبیلے سے بے دخل کیا گیا ہے۔اور ایسا کرنے والا ملکہ قُتیلہ کا باپ ہے۔ بہ ہر حال وہ زندہ ہیں۔اور ملکہ قُتیلہ جلد ہی انھیں ڈھونڈ نے گی۔'' اس نے غصے پر قابو پا لیا تھا۔اور اب اس کا دماغ عریسہ کو ڈھونڈنے کے بارے کوئی منصوبہ سوچ رہا تھا۔

چاند حالتِ ہلال میں تھا اور اول شب میں غروب ہو گیا تھا۔ وہ رات کا تیسرا پہر تھا اس لیے ہر جانب گھپ اندھیرا چھایا تھا۔ وہ ستاروں کی مدد سے بنوطرید کی سمت کا تعین کیے تیز رفتاری سے گھوڑا دوڑا رہی تھی۔ ملکان اور امریل کے گھوڑے اس کے دائیں بائیں تھے۔

☆☆☆

واپس پہنچتے ہی قُتیلہ کو ضحاک کے بھاگ جانے کی بابت معلوم ہوا تھا۔ یہ سن کر اسے تھوڑی بہت پریشانی ضرور ہوئی، کیوں کہ ضحاک کے بھاگ جانے کی غرض و غایت اسے معلوم نہیں تھی۔ حفاظتی تدبیر کے طور پر اس نے رات اور دن کو پہرہ دینے والوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا تھا۔ اور سونے والوں کو بھی

سختی سے تاکید کی تھی کہ کسی بھی وقت حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ اپنے ہتھیار وغیرہ بستر کے قریب ہی رکھا کریں۔ ایک بار تو اس کے جی میں یہ بھی آیا تھا کہ وہ اس جگہ سے بنوطریدکو کہیں اور منتقل کردے، مگر پھر بنوطرید کے عمدہ محل و وقوع کو چھوڑ کر جانا اسے مناسب معلوم نہ ہوا۔ ضحاک اکیلا بنوطرید کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ البتہ ایک خدشہ اس کے دماغ میں بنواحمر کے بارے ضرور چھپا تھا۔ اگر ضحاک وہاں پہنچ جاتا تو بنوطرید کی سلامتی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ اسے یہ غلط فہمی بھی تھی کہ ضحاک کو بنواحمر اور قتیلہ کی دشمنی کے بارے کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ عامر بن اسود نے ایک شب شراب کے نشے میں دھت ہوکر ملکہ قتیلہ کی ساری کہانی ضحاک کے سامنے بیان کر دی تھی۔ گو عامر بن اسود کا مقصد ضحاک کے سامنے قتیلہ کی بہادری کا اظہار تھا لیکن ضحاک نے اس کہانی سے اپنا مطلب نکالنے کا سوچا تھا۔

چار پانچ دن وہ اسی پریشانی میں رہی۔ اور پھر ایک دن وہ منقر بن انقع اور رشاقہ سے ضحاک کے فرار کے بارے گفتگو کر رہی تھی مگر وہ دونوں اس کے عزائم کی وضاحت نہیں کر پائے تھے۔

رشاقہ بولی۔ ''میرا خیال ہے وہ ایک عورت کی برتری برداشت نہیں کرسکتا تھا۔''

منقر نے لقمہ دیا۔ ''میرے سامنے وہ بھی ملکہ قتیلہ سے شکست کھانے کی ذلت کے متعلق کافی دفعہ بکواس کر چکا تھا۔''

قتیلہ نے پوچھا۔ ''کچھ اندازہ ہے کہاں گیا ہوگا؟''

رشاقہ نے خیال ظاہر کیا۔ ''اس کی منزل بابل یا حیرہ ہوسکتا ہے۔''

منقر نے کہا۔ ''اسے اصفہان دیکھنے کا شوق تھا۔''

دونوں کے متضاد خیالات سن کر قتیلہ منھ بناتے ہوئے بولی۔ ''تم دونوں بنوعقرب کے باقی افراد سے سن گن لو ہوسکتا ہے کسی کو اس کے ارادے کے بارے معلوم ہو۔ خاص کر اس کی بیوی کو کریدو، ملکہ قتیلہ نہیں چاہتی کہ خطرے کی تلوار بنوطرید کے سر پر ہمیشہ لٹکتی رہے۔''

منقر یا رشاقہ کے کچھ کہنے سے پہلے خیمے سے باہر اجازت مانگنے کی آواز ابھری۔

''آجاؤ۔'' قتیلہ نے سائل کو اندر بلایا۔

ایک پہریدار اندر داخل ہوا۔ ''ملکہ قتیلہ، تین جوان لڑکیاں اور ایک مرد یہاں پہنچے ہیں۔ ان کے پاس چار اونٹنیاں اور ضرورت کا سامان موجود ہے۔ وہ حضرموت جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اور آج کی شب بنوطرید میں گزارنے کے متمنی ہیں۔''

وہ دلچسپی سے بولی۔ ''انھیں ملکہ قتیلہ کے پاس لے آؤ۔''

پہرے دار سر جھکاتے ہوئے باہر نکل گیا۔ چند لمحوں بعد ایک مضبوط جسم کا جوان تین لڑکیوں کے ہمراہ خیمے میں داخل ہوا۔ ان میں سے دو لڑکیاں قبول صورت جبکہ تیسری اچھی خاصی خوب صورت تھی۔

''ملکہ قُتیلہ کی دوپہر سلامتی والی ہو۔'' نوجوان نے مودّبانہ لہجے میں کہا۔ یقیناً پہرے دار نے قتیلہ کے نام اور مزاج کے بارے اس کی تھوڑی بہت رہنمائی کر دی تھی۔

قُتیلہ نے ہاتھ کے اشارے سے انھیں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کہاں سے آئے ہو جوان؟''

''خوب صورت ملکہ، میرا نام قرص بن خطامہ ہے ہمارا تعلق بنو ناجیہ سے ہے۔ دو چاند[1] پہلے بنو عبدالقیس میں اونٹوں کی دوڑ ہوئی جس میں میری عضباء نامی اونٹنی اوّل آئی، بنو ناجیہ کے سردار کو وہ پسند آگئی اور اس نے عضباء کو خریدنے کی خواہش کی مگر مجھے عضباء سے بہت زیادہ محبت ہے اس لیے انکار کر دیا۔ اس کے بعد سردار حیلے بہانوں سے مجھے تنگ کرنے لگا۔ چند روز پہلے اس کی ایما پر اس کے ایک مصاحب نے رات کے وقت اپنی تلوار میرے صحن میں گاڑ کر مجھ پر چوری کا الزام تھوپ دیا۔ یہ تو میری خوش قسمتی تھی کہ آخر شب کو میری منجھلی بیوی فطری تقاضا پوری کرنے اٹھی اور اس نے چاند کی مدہم روشنی میں ایک سائے کو صحن کے بیچوں بیچ بیٹھے دیکھ لیا۔ پہلے اسے لگا وہ میں ہوں۔ مگر جب وہ دیوار کی طرف بڑھا اور دیوار پھلانگ کے دوسری جانب کود گیا، تب اسے گڑبڑ کا احساس ہوا۔ وہ میرے حجرے میں پہنچی اور سارا ماجرا کہہ سنایا۔ پس ہم نے صحن میں مذکورہ جگہ کھود کر دیکھا تو وہاں ایک تلوار زمین میں گڑی پڑی تھی۔ میں نے تلوار وہاں سے نکال کر ایک اور جگہ چھپا دی۔ میرے اندازے کے مطابق اگلے دن ہی مجھ پر چوری کا الزام تھوپا گیا۔ لیکن دیوتاؤں کے کرم سے وہ ثابت نہ کر سکے۔ میں الزام سے تو بری ہو گیا مگر اتنا ضرور جانتا تھا کہ سردار، عضباء کے حصول کے لیے کسی حد تک بھی گر سکتا ہے۔ تبھی میں نے اپنی تینوں بیویوں سے مشورہ کر کے بنو ناجیہ کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس سے پہلے میرے چچا کو بھی حالیہ سردار کے باپ نے قبیلے سے عاق کیا تھا۔ وہ بنو ناجیہ چھوڑ کر دور دراز کا سفر کر کے حضرموت میں جا بسا۔ اور اب میں انھی کے پاس جا رہا ہوں۔'' قرص بن خطامہ نے تفصیل سے سارا ماجرا کہہ سنایا۔

قُتیلہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا حضرموت جانا ضروری ہے تم کسی اور قبیلے میں بھی پناہ لے سکتے ہو۔''

قرص مودّبانہ لہجے میں بولا۔ ''ایسا ممکن ہے ملکہ، مگر حضرموت میں میرے سگے چچا کافی عرصے سے رہ رہے ہیں۔ امید ہے وہاں مجھے خوش آمدید کہا جائے گا۔ یوں بھی ایک اچھے جنگجو کے لیے قبائل اپنا

---

[1] دو ماہ۔

دامن وسیع رکھتے ہیں۔''

''تو تم بہترین لڑاکے ہو۔'' دُنبالہ آنکھوں میں دلچسپی کی چمک لہرائی۔

قرص انکساری سے بولا۔''لوگ ایسا ہی کہتے ہیں۔''

''ملکہ قُتیلہ سے مقابلہ کرنا پسند کرو گے۔''اس کے ہونٹوں پر شرارتی ہنسی ابھری۔

قرص نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔''ملکہ کا ادب کیا جاتا ہے اس سے مقابلہ نہیں کیا جاتا۔''

''اگر پسند کرو تو ملکہ قُتیلہ تمھیں بنوطرید میں خوش آمدید کہہ سکتی ہے۔ہمیں اچھے جنگجوؤں کی ضرورت ہے اور یہاں کسی کو دخیل بھی نہیں سمجھا جاتا۔''

''کیا...... ؟''قرص کے لہجے میں خوشگوار حیرانی تھی۔''کیا ملکہ قُتیلہ ایک اجنبی کو بغیر کسی مطلب کے بنوطرید میں رہنے کی اجازت دے دے گی۔''

وہ منھ بناتے ہوئے بولی۔''ملکہ قُتیلہ بات دہرانا پسند نہیں کرتی۔''

''اگر کوئی مجھ سے عضباء چھیننے کی کوشش نہ کرے تو میں بنوطرید میں رہنا اعزاز سمجھوں گا۔'' قرص نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

وہ اطمینان سے بولی۔''ملکہ قُتیلہ کے ہوتے ہوئے بنوطرید میں ناانصافی کا گزر نہیں ہوسکتا۔''

قرص نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔''میں ملکہ قُتیلہ کا ممنون و احسان مند ہوں۔''

قُتیلہ،منقر بن اشجع کی جانب متوجہ ہوئی۔''قرص بن خطامہ کی خیمہ لگانے میں مدد کرو،آج سے یہ بنوطرید کا معزز باسی ہے۔''

☆☆☆

اگلے دن قرص نے تربیت میں حصہ لیا تھا۔وہ امریل اور ملکان سے ہار تو گیا تھا لیکن اس نے مقابلہ بھرپور انداز میں کیا تھا۔

اسی دوپہر اور پھر رات کو اس کی بیویاں بھی قُتیلہ کے خیمے میں آئی تھیں۔تینوں نہایت ہنس مکھ، باتونی اور خدمت گزار تھیں۔پہلے ہی دن وہ قُتیلہ کے ساتھ کافی بے تکلف ہوگئی تھیں۔رشاقہ کے ساتھ بھی انھوں نے اچھا تعلق بنا لیا تھا۔قُتیلہ کو محسوس ہوا قرص بن خطامہ اور اس کی بیویاں بنوطرید میں اچھا اضافہ تھا۔

دو تین دن بعد وہ عریسہ کی تلاش میں نکلنے کے بارے منقر،رشاقہ اور ملکان سے مشورہ کررہی تھی۔

''دو روز بعد چاند کامل ہوجائے گا۔''منقر نے اس کی توجہ چاند کی چودھویں کو منعقد ہونے والے

جشن کی طرف مبذول کرائی۔

وہ متبسم ہوئی۔ ”کیا جشن میں ملکہ قُتیلہ کی شمولیت لازمی ہے۔“

منقر نے کہا۔ ”قبیلے کی سردارن کی غیر موجودی میں جشن کی خوشیاں ادھوری رہ جاتی ہیں۔“

”ٹھیک ہے، ملکہ قُتیلہ جشن کے بعد ماں جی تلاش میں نکلے گی، ملکان اور امریل اس کے ہمراہ جائیں گے۔“

رشاقہ لجاجت سے بولی۔ ”ملکہ قُتیلہ کی سہیلی بھی ساتھ جانے کی خواہش مند ہے۔“

”ملکہ قُتیلہ کی غیر موجودی میں تمھارا یہاں رہنا زیادہ مناسب ہے۔ منقر بن اسقع اور قریب بن فلیح اکیلے معاملات کو نہیں سنبھال سکیں گے۔ ملکہ قُتیلہ، ملکان کو یہاں چھوڑ جاتی، مگر اس کی سفر میں زیادہ ضرورت ہے۔“

”میں کالے ریچھ سے اچھی شمشیر زن ہوں۔“ رشاقہ شاکی ہوئی۔

قُتیلہ نے قہقہہ لگایا۔ ”یہ تو تمھیں بھی معلوم ہے کہ تم جھوٹ بول رہی ہو۔“ ملکان اور منقر بھی ہنس دیئے تھے۔

رشاقہ کے چہرے پر کھسیانی مسکراہٹ ابھری۔ ”ملکہ قُتیلہ، اصل تلواروں سے مقابلہ کرا کر جانچ سکتی ہیں۔“

”امریل نے زندگی میں صرف ملکہ قُتیلہ سے شکست کھائی ہے۔ ورنہ ملکہ قُتیلہ کو یقین ہے وہ صحرائے اعظم کا بہترین لڑاکا ہے۔“

رشاقہ نے منھ بسورا۔ ”ملکہ قُتیلہ نے میری تعریف تو کبھی نہیں کی۔“

قُتیلہ اسے چھیڑتے ہوئے بولی۔ ”تم خوب صورت ہو، دلیر ہو، مخلص ہو، جذباتی ہو اور ایک بزدل شخص کو پسند کرتی ہو۔“

رشاقہ نے بھرپور انداز میں احتجاج کیا۔ ”میں بالکل بھی اعلیٰ بن مکیث کو پسند نہیں کرتی۔“

”اعلیٰ بن مکیث کا نام تو ملکہ قُتیلہ نے نہیں لیا پھر تمھیں کیسے معلوم ہوا ملکہ قُتیلہ کا اشارہ اس کی جانب ہے۔“

”وہ......آپ......اس کو بزدل سمجھتی ہیں ناں اس لیے کہا ہے۔“ رشاقہ گڑبڑا گئی تھی۔

”وہ روزانہ، دوپہر کو قبیلے کے مضافات میں موجود نخلہ میں جا کر شمشیر زنی کی مشق کرتا ہے اور دوپہر ڈھلے لوٹ آتا ہے۔“ منقر نے انکشاف کیا۔

”کیا......؟“ قُتیلہ کے چہرے پر حیرت نمودار ہوئی۔ ”تلوار پکڑنا جانتا نہیں اور شمشیر زنی کی مشق

کرتا ہے۔''

''اسے باقاعدگی سے دوپہر کے وقت، اس طرف جاتا دیکھ کر میں مشکوک ہوا اور ایک دو دن اس کے تعاقب میں بندے بھیجے۔تب پتا چلا کہ وہ وہاں مشق کر رہا ہے۔''منقر نے اپنی فرض شناسی سے پردہ اٹھایا۔

رشاقہ بولی۔''اسے چاہیے کہ ہمارے ساتھ مشق کیا کرے۔میں اس کی بہترین تربیت کر سکتی ہوں۔''

ملکان نے خیال ظاہر کیا۔''شاید شرما رہا ہے۔''

''نہیں۔''قُتیلہ نے نفی میں سر ہلایا۔''ملکہ قُتیلہ نے اسے حکم دیا تھا کہ اپنا منحوس چہرہ ملکہ قُتیلہ کو نہیں دکھائے گا۔اور اتنا تو وہ جانتا ہے کہ ملکہ قُتیلہ کی حکم عدولی پر اسے کیا سزا مل سکتی ہے۔''

رشاقہ ملتجی ہوئی۔''اب وہ شرمندہ ہے اور اس نے تلوار بھی تھام لی ہے تو ملکہ قُتیلہ کو اسے معاف کر دینے کے بارے سوچنا چاہیے۔''

قُتیلہ معنی خیز لہجے میں بولی۔''جب تمھیں وہ پسند ہی نہیں تو سفارشیں کیسی۔''

''ن.....نہیں ملکہ، میرا مطلب تھا آخر وہ بنو طرید کا باسی ہے۔''رشاقہ گڑبڑا گئی تھی۔

قُتیلہ بے پروائی سے بولی۔''جس روز وہ خود آ کر اپنی بدتمیزی کی معافی مانگے گا، ملکہ قُتیلہ اسے معافی دینے کا سوچے گی۔''

منقر نے رشاقہ کے سر پر شفقت بھری چپت مارتے ہوئے کہا۔''اب یہ نہ ہو تم اسے یہ بات بتانے چلی جاؤ۔''

''مجھے کیا ضرورت ہے۔''رشاقہ نے نفی میں سر ہلایا۔اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوتا ہلکا تبسم دیکھ کر قُتیلہ کو اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ ضرور اعمٰی کے پاس جائے گی۔مگر قُتیلہ نے اسے باور کرانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

☆☆☆

وہ جونھی مشق سے واپس لوٹا، خلیسہ نے نبیذ سے بھرا کٹورا اس کی جانب بڑھا دیا۔

وہ مزے سے نبیذ پینے لگا۔اچانک کسی نسوانی آواز نے اندر آنے کی اجازت مانگی۔

خلیسہ کے ''آجاؤ'' کہنے پر رشاقہ اندر داخل ہوئی۔قُتیلہ کی چہیتی کو دیکھ کر یشکر حیران رہ گیا تھا۔

''آؤ رشاقہ، بیٹھو''خلیسہ نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا۔خلیسہ سے گلے مل کر رشاقہ چٹائی پر بیٹھ گئی تھی۔

یشکر نبیذ کا کٹورا خالی کر کے کھڑا ہو گیا۔اسے باہر جانے پر آمادہ دیکھ کر رشاقہ جلدی سے بولی۔

''اعمیٰ بن مکیث میں تمھیں ملنے آئی تھی۔''

یشکر کی آنکھوں میں حیرانی نمودار ہوئی۔ایک نظر رشاقہ کے سرخ و سفید چہرے پر ڈال کر وہ بے اعتنائی سے بولا۔''جی۔''

رشاقہ نے منہ بناتے ہوئے پوچھا۔''کیا بیٹھ کر بات کرنے سے کسی نے منع کیا ہوا ہے۔''

''اپنے خیمے میں بیٹھنے کے لیے مجھے کم از کم تمھاری اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔''یشکر کے لہجے میں ہلکی سی تلخی موجود تھی۔

''میں لڑائی کرنے نہیں آئی۔''رشاقہ نے اسے نادم کرنا چاہا۔

یشکر بے زاری سے بولا۔''محترمہ مطلب کی بات کرو۔''

بحث ترک کرتے ہوئے وہ مطلب کی بات پر آئی۔''تم روزانہ دوپہر کو شمشیر زنی کی مشق کرنے بنو طریدسے باہر نکل جاتے ہو،حالانکہ ہم صبح کے وقت باقاعدگی سے مشق کرتے ہیں تم ہمارے ساتھ شامل کیوں نہیں ہو جاتے۔''

یشکر اطمینان سے بولا۔''کیوں کہ میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔''

وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔''اعمیٰ میں جانتی ہوں تمھیں ملکہ قُتیلہ نے اپنے سامنے آنے سے منع کیا ہوا ہے،لیکن وہ حکم انھوں نے غصے کے زیر اثر دیا تھا۔اگر تم ایک باران کے پاس جا کر معذرت کر لو تو وہ بہت وسیع ظرف ہیں۔اور بنو طرید کے جوانوں سے محبت کرتی ہیں،یقیناً تمھیں معاف کرنے میں بخل نہیں کریں گی۔''

یشکر نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔''اور یہ غلط فہمی تمھیں کیوں کر ہوئی کہ میں شرمندگی یا قُتیلہ کے کسی حکم کی وجہ سے تم لوگوں کے ساتھ مشق نہیں کرتا؟''

''اکیلی میں نہیں،سبھی یہ بات جانتے ہیں۔کہ اس دن ملکہ قُتیلہ سے بدتمیزی سے بات کرنے کی وجہ سے تم شرمندہ ہو۔اس لیے آج جا کر ملکہ قُتیلہ سے معذرت کرو اور کل سے ہمارے ساتھ مشق کیا کرنا۔میں تمھیں تربیت دوں گی۔''

یشکر بے ساختہ امڈ پڑنے والی ہنسی نہیں روک سکا تھا۔''جب خود سیکھ جانا،تب مجھے بھی سکھا دینا۔''

''یقین کرو میں تمھیں بہت اچھے سے سکھا سکتی ہوں۔تمھاری جسامت ایسی موزوں ہے کہ تم ایک بہترین لڑاکے بن سکتے ہو۔''رشاقہ نے اس کی ہنسی کو نظر انداز کر دیا تھا۔اسی وقت خلیسہ نے مہمان نوازی کے تقاضے پورے کرتے ہوئے نبیذ کا بھرا ہوا آب خورہ رشاقہ کو پکڑا دیا تھا۔اس نے دونوں کی گفتگو میں

دخل انداز ہونے کی بالکل کوشش نہیں کی تھی۔
"محترمہ ایک بات بہت اچھے سے جان لو کہ میں نہ تمھاری ملکہ سے ڈرتا ہوں اور نہ اپنے کسی فعل پر شرمندہ ہوں۔"
"وہ تمھاری بھی ملکہ ہے۔" اس کے انداز پر رشاقہ کو غصہ آ گیا تھا۔
ایک لحظہ سوچ کر یشکر نے اثبات میں سر ہلایا۔ "جب تک میں بنوطرید میں ہوں تمھاری بات سے اختلاف نہیں کر سکتا۔"
یشکر کا اعتراف سن کر رشاقہ دوبارہ نرم پڑ گئی تھی۔ "دیکھو اُمی، وہ بہت اچھی ہیں، بہت زیادہ نفیس، وسیع ظرف اور اپنے قبیلے سے محبت کرنے والی۔ ان کی عمر کو نہ دیکھو، ان پر دیوتاؤں کا خصوصی کرم ہے۔"
وہ بے پروائی سے بولا۔ "تو میں کیا کروں۔"
"کہا تو ہے معافی مانگ لو، تاکہ تمھیں ہمارے ساتھ مشق کرنے کی اجازت مل جائے۔ میں جلد از جلد تمھیں اچھے لڑاکے کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہوں۔" رشاقہ نے ہاتھ میں تھاما خالی آب خورہ واپس خلیسہ کو پکڑوا دیا تھا۔
"اگر تمھاری بات ختم ہو گئی ہو تو تم جا سکتی ہو۔" یشکر خود جانے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے دوبارہ بیٹھ گیا تھا۔
رشاقہ کے چہرے کی سرخی بڑھی۔ وہ ایک ایک لفظ چباتے ہوئے بولی۔ "تمھیں شاید معلوم نہیں کہ کس کے ساتھ بات کر رہے ہو۔"
یشکر استہزائی لہجے میں بولا۔ "تمھیں تعارف کرانے کے لیے اپنا قیمتی وقت ضایع کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، کیوں کہ میں اچھی طرح جانتا ہوں تم کون ہو۔ البتہ تم یقیناً نہیں جانتیں کہ کس سے مخاطب ہو۔"
وہ بپھر کر بولی۔ "میں اچھی طرح جانتی ہوں تم کون ہو۔"
یشکر اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اگر جانتی ہو کہ کون ہوں، تو میرا وقت ضائع نہ کرو۔"
خلیسہ نے زور سے گلا کھنکار کر گویا یشکر کو خاموش رہنے کی تاکید کی تھی۔
رشاقہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "میں نے تمھاری بہتری کا سوچا تھا لیکن تم اس لائق نہیں ہو۔ ملکہ قُتیلہ تمھارے بارے ٹھیک کہتی ہیں، ایک بزدل شخص کی سوچ اتنی ہی محدود ہو سکتی ہے۔"
اس کی بات کا جواب دیے بغیر یشکر نے تکیے پر سر رکھ کر ٹانگ پر ٹانگ چڑھائی تھی۔
رشاقہ اسے قہر آلود نظروں سے دیکھتی ہوئی باہر نکل گئی۔

رشاقہ کے باہر نکلتے ہی خلیسہ نے اس کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''آپ کو احتیاط سے کام لینا چاہیے۔''

وہ بے پروائی سے بولا۔ ''دو تین دنوں بعد میں نے یوں بھی چلے جانا ہے۔''

''اپنے فیصلے پر قائم ہو۔'' خلیسہ نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہتے ہوئے اس کے سینے پر سر رکھ دیا تھا۔

''تم نے نئے چاند کے طلوع کے ساتھ پندرہ دن رکنے کا کہا تھا۔ اس لحاظ سے دو دن بقایا ہیں۔''

خلیسہ حسرت سے بولی۔ ''کتنے جلدی گزر گئے ہیں یہ دن۔''

یشکر نے پوچھا۔ ''ایک بات مانو گی۔''

وہ جتلانے والے انداز میں بولی۔ ''ہمیشہ اپنی ہی منواتے آرہے ہو۔''

یشکر نے اس کی طلائی قرط کو پکڑ کر آہستہ سے ہلایا۔ ''امریل تمھارا بہت زیادہ خیال رکھے گا۔ وہ ایسا شخص ہے جو تمھاری اچھی طرح حفاظت کرسکتا ہے، قبیلے کی سردارن کا بھی منظورِ نظر ہے یقین کرو بہت فائدے میں رہو گی۔''

''صحیح کہہ رہے ہیں۔ آپ کے جانے کے بعد مجھے کسی سہارے کی ضرورت تو پڑے گی۔''

''تم بہت سمجھ دار ہو۔'' یشکر نے اس کے سنہرے بالوں سے بندھا مُباف[1] کھول کر اس کے گھنے بال بکھیر دیے تھے۔

☆☆☆

''آپ ٹھیک کہتی تھیں ملکہ، وہ ایک بدتہذیب، بزدل اور احمق شخص ہے۔'' اگلے دن قُتیلہ کے گھنے بالوں میں کنگھی پھیرتے ہوئے رشاقہ نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

''کون؟'' قُتیلہ جان بوجھ کر انجان بن گئی تھی۔

رشاقہ ندامت سے بولی۔ ''اعمیٰ بن ملکیث کی بات کر رہی ہوں۔''

قُتیلہ نے خیال ظاہر کیا۔ ''شاید تم اس کے پاس گئی تھیں۔''

''ہاں۔'' رشاقہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

قُتیلہ متبسم ہوئی۔ ''جبکہ تم نے منقر بن ارقح سے وعدہ کیا تھا کہ اس کے پاس نہیں جاؤ گی۔''

''غلطی ہوگئی۔'' رشاقہ نے اعتراف کرنے میں سستی نہیں کی تھی۔

قُتیلہ نے اشتیاق سے پوچھا۔ ''کیا باتیں ہوئیں؟''

---

[1] کپڑے کی دھجی جو عورت سر کے بال باندھنے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔

''میں نے ملکہ قُتیلہ سے معذرت کرنے کا کہا تاکہ اس کے بعد میں اسے تربیت دے سکوں۔ اور وہ بدتمیزی پر اتر آیا۔''

''کیا کہہ رہا تھا۔'' قُتیلہ کی دلچسپی یشکر کے الفاظ سننے میں تھی۔

رشاقہ تفصیل سے ساری بات دہرانے لگی۔ آخر میں وہ کہہ رہی تھی ...... ''مجھے لگتا ہے جلد ہی یہ بنو طرید سے چلا جائے گا۔''

قُتیلہ خاموشی سے ساری باتیں سنتی رہی۔ اس کے خاموش ہوتے ہی بولی۔ ''اگر ملکہ قُتیلہ اس کے سرکو جسم کا حصہ نہ رہنے دے۔ تمھیں اعتراض تو نہیں ہوگا۔''

رشاقہ جلدی سے بولی۔ ''وہ اس قابل نہیں ہے کہ ملکہ قُتیلہ کی تلوار اس کے خون سے گندی ہو۔''

قُتیلہ کھل کھلا کر ہنسی۔ ''بے چاری رشاقہ......''

''آپ میری بات کو غلط رخ دے رہی ہیں۔'' رشاقہ جلدی سے وضاحت کرنے لگی۔ ''میرے کہنے کا مطلب تھا اس کے لیے آپ کی سہیلی یا کسی ادنا شخص کی تلوار کافی رہے گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' قُتیلہ نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ ''جس دن وہ ملکہ قُتیلہ کے سامنے آیا، تمھیں اس کا سر قلم کرنے کی اجازت ہوگی۔ ملکہ دیکھے گی کہ رشاقہ بنت زیاد بن تابوت کی تلوار کی کاٹ کیسی ہے۔''

''شام کو کون سا لباس پہنیں گی؟'' رشاقہ نے صفائی سے موضوع تبدیل کیا۔

قُتیلہ منھ بناتے ہوئے بولی۔ ''ملکہ قُتیلہ کو فُرجی[1]، عباء، جُبے وغیرہ سے کوفت ہوتی ہے۔ بس درع[2]، قباء اور فرّوج[3] پسند ہیں۔''

رشاقہ چاہت سے بولی۔ ''مگر سرخ رنگ کی عباء پہن کر ملکہ قُتیلہ کا حسن مزید نکھر آتا ہے۔''

''ملکہ قُتیلہ کو سجنے سنورنے کا شوق نہیں ہے رشاقہ۔ عورتیں مردوں کو لبھانے کے لیے سجتی سنورتی ہیں، ملکہ قُتیلہ کس کے لیے سنگھار کرے۔''

اس نے بھول پن سے پوچھا۔ ''تو کیا ملکہ قُتیلہ کبھی شادی نہیں کرے گی؟''

قُتیلہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''کیا تمھیں کوئی ایسا مرد نظر آتا ہے جسے ملکہ قُتیلہ اپنا آپ سونپ سکے۔''

رشاقہ شرارت سے ہنسی۔ ''اگر اعمیٰ بن مکیث کالے ریچھ کی طرح ماہر شمشیر زن ہوتا تو میرا جواب اثبات میں ہوتا۔''

---

[1] ایسا چغہ جو سامنے سے کھلا ہو۔

[2] قمیص۔

[3] چیکنے والا لباس جو پیچھے سے چاک ہوتا تھا اور جنگ یا سفر وغیرہ میں پہنا جاتا تھا۔

قُتیلہ نے پیچھے مڑ کر رشاقہ کے کان سے پکڑ کر پیار سے کھینچا۔ ''تم بکواس بند کرو اور جاؤ، ملکہ قُتیلہ تھوڑی دیر سونا چاہتی ہے۔ رات کو جشن کے ہنگامے میں دیر تک جاگنا پڑے گا۔''

''آپ نے میرے جواب پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔'' رشاقہ شریر انداز میں کہتے ہوئے کھڑی ہوئی۔

اس نے منھ بناتے ہوئے تکیے پر سر ٹیکا۔ ''اگر اعمیٰ بن مکیث دنیا کا آخری مرد بھی ہوتا تو ملکہ قُتیلہ کو قبول نہیں تھا۔''

رشاقہ ہنستے ہوئے باہر نکل گئی تھی۔

☆☆☆

بنوطرید کے باسیوں نے سرِ شام ہی آگ کے الاؤ بھڑکا دیے تھے۔ بھنے ہوئے سالم اونٹ، بکرے اور دنبے وغیرہ تیار ہو چکے تھے۔ گوشت بھننے کی اشتہا آمیز خوشبو ہر طرف پھیلی تھی۔ تمام کو قُتیلہ کی آمد کا انتظار تھا۔

قُتیلہ کے بیٹھنے کے لیے دو مردوں نے تخت اس کے خیمے سے نکال کر چبوترے پر رکھا۔ دو تین لمحوں بعد وہ رشاقہ کو ساتھ لیے برآمد ہوئی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے رشاقہ کی ضد پر سرخ رنگ کا لبادہ اوڑھنا پڑا تھا۔ البتہ اس کے نیچے اس نے اپنا روزمرہ کا لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔

چبوترے پر چڑھتے ہی وہ کچھ کہنے کے لیے لب ہلانے ہی لگی تھی کہ اس کی نظر سامنے کھڑے یشکر پر پڑی۔ اس کے دماغ میں دوپہر کو رشاقہ کے ساتھ ہونے والی گفتگو تازہ ہوئی اور اس کے منھ میں کڑواہٹ گھل گئی تھی۔ کوشش کے باوجود وہ اپنے غصے پر قابو نہیں پا سکی تھی۔

''اعمیٰ بن مکیث جب تمھیں ملکہ قُتیلہ نے حکم دیا ہوا ہے کہ اپنا منحوس چہرہ نہیں دکھاؤ گے تو تمھیں کوئی شک نہیں ہونا چاہیے۔''

وہ بے نیازی سے بولا۔ ''آسان حل ہے، میری طرف دیکھتے ہوئے اگر آپ آنکھیں بند کر لیں گی تو یقیناً میں نظر نہیں آؤں گا۔''

اس کے دماغ میں جیسے دھماکا سا ہوا تھا۔ وہ حلق کے بل چلائی۔ ''احمق انسان شاید تمھیں زندگی پیاری نہیں ہے۔''

وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔ ''میری زندگی آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔ میں ویسے بھی ایک دو دن کا مہمان ہوں۔ آپ اپنا غصہ بنوطرید کے باسیوں کے لیے بچا کر رکھیں۔''

''تمھاری یہ جرأت کہ مالکن سے بدتمیزی کرو......'' امریل تلوار بے نیام کر کے غصے میں دھاڑتا ہوا اس کی جانب بڑھا۔ قُتیلہ نے چیخ کر اسے رکنے کو کہا مگر امریل نے اَن سنا کر دیا تھا۔ اس کی تلوار بجلی کے کوندے کی طرح یشکر کی جانب لپکی، ہدف یشکر کی گردن تھی۔

وہیں کھڑے کھڑے یشکر کا بالائی بدن عقبی جانب جھکا، امریل کی تلوار دو تین انگل کے فاصلے سے اس کے چہرے کے سامنے سے گزر گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی یشکر کی داہنی ٹانگ پوری قوت سے امریل کے ہاتھ پر لگی، تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی تھی۔

امریل منھ سے جھاگ اڑاتا خالی ہاتھ اس کی جانب بڑھا، وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ سکندر کے خصوصی شاگرد سے پنگا لے بیٹھا تھا۔ سکندر نے ہتھیاروں کے استعمال کے ساتھ اسے کشتی اور خالی ہاتھ لڑنے کے داؤ پیچ میں بھی طاق کر دیا تھا۔ امریل کو بگولے کی طرح اپنے قریب آتے دیکھ کر وہ ایک دم زانو حالت میں نیچے جھکا اگلے ہی لمحے امریل اس کے سر سے ہوتا ہوا پیچھے جا گرا تھا۔ امریل جیسے قوی الجثہ مرد کو یوں آسانی سے دونوں ہاتھوں پر اٹھانا یقیناً بہت زیادہ قوت کا متقاضی تھا۔ اور یشکر میں اتنی طاقت موجود تھی۔

اسے پھینکتے ہی یشکر نے لپک کر تلوار اٹھائی، اس دوران امریل کھڑا ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ حرکت کر پاتا، یشکر نے تلوار کی نوک اس کی گردن سے لگا دی تھی۔

''میں تمھیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' امریل زور سے دھاڑا۔

''حالاں کہ میں نے خلیسہ کو تمھارے لیے چھوڑنے کا ارادہ کر لیا ہے۔'' یشکر نے نہایت مدہم آواز میں کہا تھا۔

امریل کے غیض و غضب سے بگڑے چہرے پر حیرانی ابھری۔

''صحیح کہہ رہا ہوں۔'' یشکر کی مدہم آواز صرف امریل ہی سن پا رہا تھا، قُتیلہ کے پلے کچھ نہیں پڑا تھا۔ ''کل میں چلا جاؤں گا اور اسے تمھارا ساتھ قبول ہے۔ تم اپنی سنہرانہ کے ساتھ رہنا چاہو گے یا مجھ سے گردن کٹوانا پسند کرو گے۔''

گہرے سانس لیتے ہوئے امریل نے اپنی حالت پر قابو پایا۔ ''تم سچ کہہ رہے ہو۔'' اس نے امید بھرے لہجے میں تصدیق چاہی۔

''ہاں ..... کیوں کہ وہ بھی تمھیں پسند کرتی ہے۔ لیکن یاد رہے یہ تلوار واپس نہیں ملے گی۔'' یشکر اس کی عمدہ تلوار پر قبضہ جمانے کا موقع ہاتھ سے نہیں کھو سکتا تھا۔

''اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو امریل کی جان بھی لے سکتے ہو یہ تو گھٹیا سی تلوار ہے۔'' یہ کہتے ہوئے امریل پیچھے ہٹ گیا تھا۔

یشکر نے تلوار کی نوک حیران کھڑی قُتیلہ کی جانب تانی...... ''سردارزادی قُتیلہ بنت جبلہ، میں صبح چلا جاؤں گا، اگر دل میں کوئی حسرت ہے تو تم پوری کر سکتی ہو۔''

(باقی ان شاء اللہ اگلے ماہ)

ناقابلِ فراموش

باباکے جنّات

یہ دونوں بچے کوہ قاف کی مخلوق کی نظروں میں آ گئے ہیں۔ ان کی شادی جس کسی کے ساتھ بھی ہوگی، وہ جنوں کے غضب کا نشانہ بن جائے گا۔ یا تو ان کی آپس میں شادی کردو یا پھر انہیں ساری زندگی کنوارہ رکھنا''۔

☆ راجہ مظہر علی

یہ اُن دنوں کی کہانی ہے جب لوگوں کو قدرتی کھاد کی کاشت کردہ گندم اور ملاوٹ سے پاک گھی اور دودھ مل جاتا تھا جس کی وجہ سے لوگوں کی صحت اچھی تھی اور ان کے جذبات بھی ہر قسم کی ملاوٹ اور آلائش سے پاک تھے۔ پاکستان کی عمر دس سال ہو چکی تھی لیکن لوگ ابھی میکسی پاک اور مغربی کلچر سے ناآشنا تھے۔ اسی وجہ سے ان کے اندر غیرت اور بے غرضی کے جذبات پائے جاتے تھے۔

میں جو کہانی آپ کو سنا رہا ہوں، یہ میں نے اپنے بزرگوں سے سنی تھی۔ ہوا یوں کہ میرے ماموں نے مجھے یہ کہانی سنائی اور میرے والد صاحب نے اس کی تصدیق کی تھی۔ اس لحاظ سے یہ ایک سچی کہانی ہے جو اس کہانی کے کرداروں کے لئے ناقابلِ فراموش ہے۔ اس کہانی کے کرداروں نے مجھے اجازت دی ہے کہ میں یہ کہانی لکھ سکتا ہوں اور ان کا اصلی نام بھی استعمال کر سکتا ہوں۔ میرا بھی جی چاہتا ہے کہ میں اُن کے اصلی نام استعمال کروں لیکن آپ کے پرچے کی پالیسی کی وجہ سے میں اُن کے نام تبدیل کر رہا ہوں۔

وہ گرمیوں کے آغاز کی ایک تپتی دوپہر تھی۔ احمد خان نامی ایک کسان کچہری سے اپنی تاریخ بھگت کر آ رہا تھا۔ اُس نے راستے میں ستانے اور کھانا کھانے کے لئے برگد کے ایک درخت کے نیچے گھوڑی روکی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایک عورت بھی جو غالباً سفر میں تھی، اسی درخت کی چھاؤں میں ستا رہی تھی۔ اپنے لباس اور شکل وصورت سے وہ اچھے معزز خاندان کی عورت لگتی تھی۔ اُس کی عمر بھی چالیس کے لگ بھگ تھی۔ احمد خان اس چیز پر حیران ہو رہا تھا کہ یہ عورت اس دوپہر میں تنہا تھی۔ رواج کے مطابق اُس کے پاس کوئی سواری اور اُس کے ہمراہ کوئی نوکر وغیرہ ہونا چاہئے تھا۔

احمد خان نے اُس عورت سے خیر خیریت پوچھی تو معلوم ہوا کہ وہ واقعی کسی کھاتے پیتے گھرانے کی عورت تھی اور اس کا گاؤں احمد خان کے گاؤں سے ایک آدھ میل کے فاصلے پر تھا۔ اس عورت کا نام زینب تھا اور اس کا سسر گاؤں کا نمبردار تھا جسے احمد خان بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ احمد خان نے اُسے کھانا پیش کیا تو اُس نے دیہات کے رواج کے مطابق انکار کر دیا۔ احمد خان دیکھ رہا تھا کہ عورت خاصی تھکی ہوئی تھی اور اُس کا سفر ابھی باقی تھی۔

''بہن تکلف نہ کرو''۔ احمد خان نے کہا۔ ''کھانا میرے پاس بہت ہے۔''

اُس عورت نے کہا کہ وہ پانی پینا چاہتی ہے۔ احمد خان اٹھا اور نزدیک کے ایک گاؤں میں پانی لینے چلا گیا۔ اتفاق سے اُس گاؤں میں اُس کی واقفیت تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اُس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔ اُس عورت نے زینب سے اصرار کیا کہ وہ اُس کے گھر چل کر آرام سے بیٹھ کر کھانا کھائے اور پھر بعد میں جب جی چاہے چلی جائے۔ پہلے تو زینب نے انکار کیا لیکن اُس عورت کے اصرار سے مجبور ہو کر وہ اس کے ساتھ چل پڑی۔ وہ عورت احمد خان کے ایک جاننے والے کی بیوی تھی۔

''بھائی احمد خان نے بتایا کہ میری بہن بھی ساتھ ہے تو میرا خاوند اُس سے بہت ناراض ہوا۔'' اس عورت نے زینب کو بتایا۔ ''احمد خان کی بہن ہماری اپنی بہن ہے اور ہمارے گھر کے ہوتے ہوئے وہ درخت کے نیچے نہیں بیٹھ سکتی''۔

زینب احمد خان کے رویے سے بہت متاثر ہوئی۔ احمد خان نے یہ بات کہہ کر اُس کے دل میں گھر کر لیا تھا۔ وہ زمانہ آج کے زمانے سے بہت مختلف تھا۔ اُس زمانے میں اگر کوئی مرد کسی عورت کو بہن کہہ دیتا تو دل

سے اُسے بہن سمجھتا تھا اور بالکل سگی بہنوں کی طرح اُس کا خیال رکھتا تھا۔ زینب نے اس عورت کو یہ بتانا ضروری نہ سمجھا کہ وہ احمد خان کی سگی بہن نہیں بلکہ ان کی ملاقات تھوڑی دیر پہلے ہوئی ہے۔

دھوپ کی تپش ذرا سی کم ہوئی تو وہ اور احمد خان وہاں سے نکلے۔ احمد خان نے اُسے گھوڑی پر بٹھا لیا اور اُسے پوچھا کہ وہ اتنی سخت گرمی میں اکیلی کہاں سے آ رہی ہے۔

''کیا بتاؤں بھائیا!'' زینب نے کہا۔ ''تقدیر کے چکر نے پاؤں میں چکر ڈال دیا ہے۔''

''تمہارا سسر اتنا بڑا نمبردار اور زمیندار ہے''۔ احمد خان نے کہا۔ ''تمہارے گھر میں نوکر بھی ہیں اور گھوڑی بھی ہوگی۔ سواری کے لئے گھوڑی لے آتیں اور ساتھ نوکر بھی ہوتا تو وقت پر گھر پہنچ جاتیں۔ میں نے تمہیں بہن کہا ہے اس لئے مجھے اچھا نہیں لگا کہ تم اکیلی سفر کرو اور وہ بھی اتنی دوپہر میں۔''

''بات ایسی ہے جو میں اپنے سسر یا خاوند کو نہیں بتا سکتی تھی۔'' زینب نے کہا اور کہہ کر خاموش ہوگئی۔

''چلو کوئی بات نہیں''۔ احمد خان نے کہا۔ ''مجھے بتانے والی بات نہیں تو نہ بتاؤ لیکن آئندہ اس طرح گھر سے باہر نہ نکلنا''۔

یہ بات نہیں کہ اکیلے سفر کرتے ہوئے اس عورت کی آبرو کو کوئی خطرہ لاحق تھا یا چوروں ڈاکوؤں کا کوئی مسئلہ تھا۔ اُس زمانے میں لوگوں کی اخلاقی حالت اتنی خراب بھی نہیں ہوئی تھی۔ بات دراصل یہ تھی کہ اچھے خاندان کے لئے اُس کی کسی عورت کا تنہا باہر نکلنا اُن کے لئے بڑی بے عزتی کی بات تھی اور اب یہ عورت اگر نکلی تھی تو یقیناً گھر والوں کو بتائے بغیر آئی ہوگی۔

''تم اپنے خاوند اور سسر کو کیا بتاؤ گی کہ کہاں سے آ رہی ہو؟''

''میں اپنے سسرال والے گاؤں نہیں جاؤں گی''۔ زینب نے بتایا۔ ''بلکہ اپنے بھائی کے گھر جاؤں گی۔ میرا میکا تھوڑا سا پہلے آتا ہے۔ کل شام میرا بھتیجا مجھے ملنے آیا تھا اور میں بھائی کے گھر چلی گئی۔ میرے اپنے گھر والے یہی سمجھتے ہیں کہ میں بھائی کے گھر میں ہوں۔ کل صبح بھتیجے کو ساتھ لے کر اپنے گھر واپس چلی جاؤں گی''۔

''اتنی چوری چھپے گھر سے باہر نکلنے کی ضرورت کیا آ پڑی تھی؟'' احمد خان رہ نہ سکا اور پوچھ بیٹھا۔

''تم نے مجھے بہن کہا ہے اس لئے تم سے نہیں چھپاؤں گی''۔ زینب نے کہا۔ ''خدا نے مجھے ایک ہی اولاد دی ہے اور وہ بھی بیٹی کی ذات ہے جس کی وجہ سے مجھ پر اس نازک ذمہ داری کا بوجھ آ پڑا ہے۔ اب لڑکی جوان ہوگئی ہے اور اس کے لئے رشتے آ رہے ہیں''۔

''تمہاری برادری میں اتنے اچھے رشتے ہیں''۔ احمد خان نے کہا۔ ''کئی ایک کو تو میں بھی جانتا ہوں''۔

''یہی تو مسئلہ ہے''۔ زینب نے کہا۔ ''میں نے غلطی یہ کی کہ بیٹی کو آٹھ جماعتیں پڑھا بیٹھی ہوں۔ اس کی شادی کسی اَن پڑھ سے کر دی تو وہ ساری زندگی اپنے خاوند اور سسرال والوں سے سکول کے طعنے کھاتی رہے گی۔ سوچتی ہوں ایسا لڑکا ہو جو تھوڑا بہت پڑھا لکھا ہو لیکن میرا سسر نہیں مانتا۔ اس کے ایک بھتیجے کا بیٹا باپ کی ساری جائیداد کا وارث ہے۔ اُس کی پہلی بیوی مر چکی ہے اور وہ میری بیٹی سے کم از کم پندرہ سال بڑا ہے۔ اس کی بھی کوئی بات نہیں لیکن وہ بالکل اَن پڑھ اور جنگلی ہے۔ پہلی بیوی پر بہت ظلم کرتا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ بے چاری اس کے ظلم اور زیادتیوں کی وجہ سے مری ہے۔ اب میرا سسر ضد کرتا ہے کہ لڑکی کا رشتہ اسی کو دے گا''۔

''تمہارے خاوند کا کیا خیال ہے؟''

"اس بے چارے کا کیا خیال ہوگا"۔ زینب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "وہ تو سانس بھی اپنے باپ سے پوچھ کر لیتا ہے۔"

"اور تم؟"

"میں نے ایک دفعہ بات کی تھی"۔ زینب نے کہا۔ "لیکن سسر نے مجھے ڈانٹ کر چپ کرا دیا۔ وہ کہتا ہے کہ عورتوں کو ایسے معاملات میں بولنے کا کوئی حق نہیں۔ اس کا خیال ہے کہ لڑکے کے باپ کی چھوڑی ہوئی زمین جائداد پر لڑکی عیش کرے گی۔ میرے سسر کو یہ معلوم نہیں کہ عورتوں کو ان معاملات میں بولنے کا کوئی حق نہیں لیکن میری بیٹی بول پڑی ہے۔ اس نے مجھے صاف کہہ دیا ہے کہ وہ اس آدمی سے کبھی شادی نہیں کرے گی۔"

احمد خان زینب کا مسئلہ سمجھتا تھا۔ ایک ایسی عورت جس نے صرف ایک بیٹی پیدا کی ہو، اُس کی سسرال میں اتنی حیثیت نہیں تھی کہ وہ اپنی بیٹی کے معاملے میں بات کر سکتی۔ اگر اُس کے دو چار بیٹے ہوتے تو کم از کم اُس کا خاوند اپنی بیٹی کے مستقبل کا فیصلہ خود کر سکتا۔

"میری نظر میں ایک لڑکا ہے"۔ زینب نے بتایا۔ "وہ میری بیٹی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ میری بیٹی بھی اسے پسند کرتی ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہ ہمارے خاندان کا نہیں۔ ہماری ذات ایک ہی ہے لیکن ہمارا خاندان دوسرا ہے۔ وہ لڑکا مجھ سے مل چکا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اپنے ماں باپ کو میرے گھر بھیجے گا لیکن میں نے منع کر دیا ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ اُس کے ماں باپ ہمارے گھر سے بے عزتی کرا کے جائیں گے۔"

"اب تم کہاں سے آ رہی ہو؟"

اس نے بتایا کہ دو تین میل کے فاصلے پر ایک قصبے میں ایک روحانی بزرگ بنگال سے آیا ہے جو کچھ عمل کرتا ہے تو پتھر دل بھی نرم ہو جاتے ہیں۔ وہ اس بزرگ کی مدد سے اپنے سسر کے دل میں رحم ڈالنا چاہتی تھی۔

"آج میرا دوسرا چکر تھا"۔ زینب نے احمد خان کو بتایا۔ "اُس بزرگ نے بتایا ہے کہ میری بیٹی کی شادی اُس کی پسند کے لڑکے کے ساتھ ہی ہوگی"۔

احمد خان کو زینب کی بات سن کر دھچکا سا محسوس ہوا۔

"زینب!" احمد خان نے اُس سے کہا۔ "تم نے مجھے بھائی کہا ہے، اس لئے جو بات میرے دل میں ہے وہ میں تمہیں صاف بتا دیتا ہوں۔ مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی کہ تم بیٹی کا رشتہ صرف اس لئے اُس لڑکے کو دینا چاہتی ہو کہ اُسے تمہاری بیٹی پسند کرتی ہے۔ میرے خیال میں یہ بے غیرتی ہے"۔

"بھایا جی!" زینب نے کہا۔ "اپنی بیٹی کو دوزخ میں دھکا دینے سے بہتر تو یہ ہے کہ میں یہ بے غیرتی کر گزروں۔ اگر اُس کے دادا نے اُس کی شادی اپنے اُس جنگلی رشتہ دار سے کر دی تو میں بیٹی کو زہر دے دوں گی اور خود بھی زہر کھا لوں گی"۔

احمد خان بھی اُسی دیہاتی معاشرے کا فرد تھا۔ اُس سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اس بات کو پسند کرے کہ لڑکی کی مرضی کا رشتہ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اُس زمانے میں تو اگر باپ بھائی یا دادا کو معلوم ہو جاتا کہ اُن کی لڑکی اپنے منگیتر کو پسند کرتی ہے تو اچھے خاصے رشتے کو نامنظور کر دیتے تھے۔ ہمارے بزرگ بتاتے ہیں کہ انہوں نے وہ زمانہ بھی دیکھا ہے جب شادی شدہ لڑکیوں کی طرف سے بھی خاوند کی پسندیدگی کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔

ایسی باتیں کرتے کرتے ان کا راستہ کٹ گیا اور اتنی دیر میں زینب کے بھائی کا گاؤں آ گیا۔ احمد خان نے زینب کو گاؤں سے باہر اتارا۔ اُس نے احمد خان

سے بہت کہا کہ وہ اُس کے بھائی کے گھر چلے لیکن احمد خان نے انکار کر دیا۔

"زینب!" رخصت کے وقت احمد خان نے اُس سے کہا۔ "میری تمہاری خون کی رشتہ داری کوئی نہیں لیکن میں نے تمہیں دل سے اپنی بہن کہا ہے اور ان شاء اللہ قیامت تک اپنی بہن سمجھوں گا۔ میری جب کبھی اور جہاں بھی ضرورت پڑی ایک دفعہ آواز دے دینا، ان شاء اللہ، تمہارے پاس پہنچوں گا.... ایک بات میں پھر کہوں گا.... آئندہ اس طرح گھر سے اکیلی نہ نکلنا اور اپنی بیٹی کی پسند کی شادی کا خیال دل سے نکال دو"۔

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میری بیٹی نے وہ لڑکا قابو کیا ہے؟" زینب نے کہا۔ "اور میں اُسے پھنسانے کے لئے جادو کر رہی ہوں؟ یہ بات نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ لڑکا میرے دل کو اچھا لگتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ ساری برادری میں صرف وہی میری بیٹی کے قابل ہے۔ میں نے اپنی بیٹی سے بات کی تو مجھے پتہ چلا کہ وہ اس کے دل کو بھی اچھا لگتا ہے۔ بس اتنی سی بات ہے ورنہ میری بیٹی بڑی شرم اور پردے والی لڑکی ہے....

"بھائیا جی!" زینب نے تھوڑی دیر سوچ کر کہا۔ "تم نے مجھے کہا ہے کہ میں ضرورت کے وقت آواز دوں۔ بہنیں بھائیوں کو ہی پکارتی ہیں لیکن اس وقت میری ضرورت ایسی ہے کہ میں کسی کو بھی مدد کے لئے نہیں کہہ سکتی"۔

"تم کہو تو میں تمہارے سسر سے بات کروں"۔ احمد خان نے کہا حالانکہ اُسے یقین تھا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

"یہ غلطی نہ کرنا"۔ زینب نے کہا۔ "اس معاملے میں وہ کسی کی بھی بات نہیں سنے گا"۔

"پھر میں ایک اور کام کروں گا"۔ احمد خان نے کہا۔ "میں اپنے پیرو مرشد سے بات کرتا ہوں۔ میں بابا جی کا خاص بالکا ہوں اور وہ مجھ پر کرم کی نظر رکھتے ہیں۔ تمہارا سسر بھی اُن کا ہی مرید ہے۔ اُن سے عرض کروں گا کہ وہ اُس کو بلا کر سمجھائیں"۔

زینب نے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے چوم کر آنکھوں سے لگائے۔

"بابا جی کے نام پر تو میری جان بھی صدقے"۔ اُس نے عقیدت سے کہا۔ "اُن سے عرض کرنا کہ میرے حق میں دعا کریں کہ میری یہ مشکل حل ہو جائے"۔

احمد خان نے اپنے جس بابا جی کا ذکر کیا تھا، وہ کوئی ایسے ولی کامل تو نہیں تھے لیکن نیک بزرگ تھے اور خلقِ خدا کے کام آتے تھے۔ احمد خان واقعی اُن کا خاص بالکا تھا۔ اُس نے طے کر لیا کہ وہ کسی دن جا کر اُن کی خدمت میں زینب کا مسئلہ پیش کرے گا۔

وہ گندم کی کٹائی کے دن تھے۔ اُن دنوں میں تو کسانوں کو کسی چیز کے لئے بھی فرصت نہیں ہوتی اس لئے احمد خان نے زینب کا مسئلہ تھوڑے دنوں کے لئے ملتوی کر دیا۔ جب وہ ذرا فارغ ہوا تو اُسے پتہ چلا کہ بابا جی داتا صاحب کے عرس پر لاہور چلے گئے ہیں۔ جہاں وہ کچھ دن اپنے مریدوں کے پاس ٹھہریں گے۔ احمد خان کے بابا جی سے تعلقات ایسے تھے کہ وہ اُن کے پیچھے لاہور بھی جا سکتا تھا لیکن اُس نے سوچا کہ وہ عرس سے واپس آ لیں تو اطمینان سے اُن کے ساتھ بات کرے گا۔

وہ کسانوں کے لئے بڑی مصروفیت کے دن تھے۔ کٹائی ختم ہو چکی تھی اور فصل کھلیانوں میں پہنچ گئی تھی۔ یہ بڑا ہی نازک وقت تھا۔ کسانوں کو رات بھر کھلیانوں میں اپنی فصل پر پہرہ دینا پڑتا تھا کیونکہ لوگ دشمنی میں کسی کو تباہ کرنے کے لئے کھلیانوں میں پڑی

فصل کو آگ لگا دیتے تھے۔ یوں سمجھیں کہ کھلیانوں میں گندم کی فصل نہیں بلکہ کسان کی پورے سال کی کمائی ہوتی تھی۔ اُن دنوں کھلیانوں میں سوئے ہوئے کسانوں کی قتل کرنے کا رواج عام تھا۔ لوگ اسی موقع پر اپنی دشمنی پوری کرتے تھے۔

ان دنوں میں جب احمد خان کو یہ اطلاع ملی کہ زینب کی بیٹی نصرت کی شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی ہے اور اُس کی شادی اُسی رشتہ دار سے ہورہی ہے جس کی پہلی بیوی مرچکی ہے تو احمد خان کو حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی۔ حیرت اس بات پر ہوئی کہ ان دنوں میں شادی کی تیاریاں کرنے یا شادی میں شریک ہونے کا وقت کسی کے پاس بھی نہیں تھا۔ زینب کے سسرال کو بیٹی کی شادی کے لئے ابھی تھوڑا انتظار کرنا چاہئے تھا۔

اسے افسوس اس بات پر ہوا کہ زینب بے چاری کی کوئی پیش نہ گئی اور بالآخر اُس کی بیٹی اُس کی مرضی کے خلاف ایک ایسے آدمی کی بیوی بن رہی ہے جسے نہ بیٹی پسند کرتی ہے اور نہ ہی وہ زینب کو اچھا لگتا ہے۔ زینب نے احمد خان کو بتایا تھا کہ یہ شخص خود زینب کا ہم عمر تھا۔

احمد خان کو رہ رہ کر جس چیز پر افسوس ہورہا تھا وہ یہ تھا کہ وہ اپنی اس منہ بولی بہن کے کسی کام نہ آسکا۔ بابا جی شہر سے واپس تو آگئے تھے لیکن نصرت کے دادا نے اسے گھر سے رخصت کرنے کا انتظام کرلیا تھا۔ احمد خان کو کبھی کبھی خیال آتا کہ وہ کسی طرح نصرت کے ہونے والے خاوند کو قتل کرادے یا پھر کچھ عرصہ کے لئے غائب کرادے تاکہ زینب اور نصرت کے کلیجے میں ٹھنڈک پڑے لیکن وہ یہ سوچ کر خاموش ہوگیا کہ شاید قدرت کو یہی منظور تھا۔ آخر مرد اور عورت کی جوڑی تو آسمانوں پر ہی بن جاتی ہے اور اس سلسلے میں انسان کچھ کرنا چاہے تو بھی بے بس ہوتا ہے۔

احمد خان اس بات کے لئے اپنے آپ کو معاف نہ کرسکا کہ اُس کی سستی اور کوتاہی کی وجہ سے زینب کا کام نہ ہوسکا۔ وہ اتنا پریشان ہوا کہ اپنے بابا جی کے گاؤں چلا گیا اور اُن سے ساری حقیقت حال بیان کی۔ انہوں نے اس بات پر تو اس کی پیٹھ تھپکی کہ وہ نیک ارادے سے اپنی منہ بولی بہن کے کام آرہا ہے۔ اس کے ساتھ انہوں نے یہ بھی کہا کہ احمد خان کی نیک نیتی زینب کے کام ضرور آئے گی۔ انہوں نے احمد خان سے وعدہ کرلیا کہ وہ نصرت کے لئے دعا کریں گے اور اگر ہوسکا تو اس کے لئے کوئی عملی قدم بھی اٹھائیں گے۔

اُس رات احمد خان واپس آکر کھلیان میں لیٹ تو گیا لیکن اُس کا دل بہت پریشان تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب جب کہ نصرت کی شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی ہے، اباب جی ان کی مدد کے لئے کیا عملی اقدام کریں گے۔ یہ سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔

کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی تو کچی نیند سے اُس کی آنکھ کھل گئی۔ اُسے خطرہ محسوس ہونے لگا کہ کوئی دشمن اُس کے کھلیان میں گھس آیا ہے۔ وہ تیزی سے اٹھا اور کلہاڑی چارپائی کے نیچے سے نکال لی۔ تھوڑی دور اسے دو سائے نظر آئے جو پرے جارہے تھے۔ اُس نے ان کو للکارا اور کلہاڑی لہراتا ہوا ان کے پیچھے بھاگا۔ اُس کی للکار سن کر وہ دونوں جو کوئی بھی تھے رُک گئے۔

''کون ہو تم؟'' اُس نے پوچھا، پھر ہلکی سی چاندنی میں اُس نے دیکھا کہ اس کے سامنے ایک نوجوان لڑکی اور ایک لڑکا کھڑے تھے۔

''تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟'' احمد خان نے پوچھا۔

لڑکے سے پہلے لڑکی بول پڑی اور اُس نے اپنے باپ کا نام اور دادا کا نام اور گاؤں کا نام بھی بتایا۔

''زینب کی بیٹی نصرت ہو؟'' احمد خان نے پوچھا۔
''تم ماما احمد خان تو نہیں ہو؟'' نصرت بولی۔
''میری ماں نے تمہارے متعلق بتایا تھا''۔

احمد خان کو معلوم ہوا کہ نصرت اپنی پسند کے لڑکے کے ساتھ فرار ہو رہی تھی جس کا نام ریاض تھا۔ اس فرار میں زینب کی مرضی اور مدد شامل تھی۔ احمد خان نے اُن دونوں کو اپنے پاس بٹھایا۔ انہوں نے بتایا کہ ریاض نصرت کو ساتھ لے کر شہر میں اپنے ایک دوست کے پاس جا رہا تھا جہاں دونوں نے شادی کر لینی تھی۔

''تم دونوں بے وقوف کے بچے ہو''۔ احمد خان نے انہیں کہا۔ ''اور تمہاری ماں کو بھی عقل نہیں۔ کیا صبح تمہارے گھر والے تم دونوں کو غائب دیکھیں گے تو انہیں پتہ نہیں چل جائے گا کہ نصرت کو کون ساتھ لے گیا ہے؟'' احمد خان پھر نصرت سے مخاطب ہوا۔ ''تم اپنے دادا کو نہیں جانتیں؟ وہ تو اس لڑکے کے گھر والوں کے لئے مصیبت کھڑی کر دے گا۔ شہر جانے کا خیال چھوڑو''۔

''پھر ہم کہاں جائیں؟'' لڑکے نے پوچھا۔

''نصرت کو میرے پاس چھوڑ دو اور اپنے گھر واپس چلے جاؤ''۔ احمد خان نے کہا۔ ''میں اسے اپنے گھر میں چھپا لوں گا۔ تم کل رات کو میرے پاس آنا، پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ کیا کرنا ہے''۔

ریاض نے سوالیہ نظروں سے نصرت کی جانب دیکھا۔ نصرت نے اُسے تسلی دے کر گاؤں واپس بھیج دیا اور خود احمد خان کے ساتھ اُس کے گھر آ گئی۔ احمد خان نے اپنی بیوی کو اٹھایا اور اُسے ساری بات سمجھائی۔ اُس عورت نے نصرت کو اپنے گھر رکھ لیا۔

اگلے روز احمد خان صبح ہی صبح اپنے بابا جی کے ڈیرے پر حاضر ہوا اور انہیں ساری رپورٹ پیش کی۔ اُن کی مسکراہٹ سے اندازہ ہوتا تھا کہ انہیں اس واقعے

لقمہ ایک لقمہ پیٹ تک پہنچانے کا قدرت نے کتنا انتظام کیا ہے کہ گرم ہے تو ہاتھ بتا دیتے ہیں۔ سخت ہے تو دانت بتا دیتے ہیں۔ کڑوا یا تُرش ہے تو زبان بتا دیتی ہے۔ باسی ہے تو ناک بتا دیتی ہے۔ **بس حرام ہے یا حلال** یہ فیصلہ آپ نے کرنا ہے۔

کا علم روحانی طور پر پہلے سے ہو گیا تھا۔ بہرحال انہوں نے احمد خان کو بڑی دیر تک اپنے پاس بٹھائے رکھا اور اُسے سمجھاتے رہے کہ اُس نے نیکی کا جو راستہ اختیار کیا ہے اس پر اُسے کس طرح آگے بڑھنا ہے۔ احمد خان شام کو گھر واپس آیا۔ رات کو ریاض بھی تھوڑی دیر کے لئے آیا اور پھر واپس چلا گیا۔

اگلے روز نصرت کے دادا اور باپ کو پیر صاحب کی طلبی کا پیغام ملا۔ وہ تو گزشتہ روز سے نصرت کی گمشدگی کی وجہ سے سخت پریشان تھے لیکن انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اُسے کہاں تلاش کریں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ انہیں کسی پر شک بھی نہیں تھا۔ نصرت کا دادا رہ رہ کر زینب پر الزام لگاتا تھا کہ اُسی نے اپنی بیٹی کو کہیں غائب کیا ہے۔ اب انہیں پیر صاحب کا پیغام ملا تو وہ اور پریشان ہوئے۔ انہیں اندازہ ہی نہیں تھا کہ انہیں کس سلسلے میں طلب کیا گیا ہے۔

وہ بابا جی کے آستانے پر پہنچے تو وہ سخت جلال کے عالم میں تھے۔ انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں نصرت کے باپ اور دادا کو گالیاں دیں۔

''تم جیسے بے دین مریدوں کا پیر ہونا میرے لئے کسی عذاب سے کم نہیں''۔ بابا جی نے کہا۔ ''تم نے کیا بے احتیاطی کی ہے؟''

''ہمیں تو کچھ خبر نہیں حضور!'' دادا نے کہا۔ ''ہم تو خود پریشان ہیں، ہماری ایک جوان لڑکی......''

''ہمیں بتانے کی کوشش نہ کرو''۔ پیر صاحب نے

جھاڑ کر کہا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے کہ مجھے تمہاری لڑکی کے بارے میں علم نہیں؟ اگر میں گزشتہ رات تہجد سے پہلے گھر سے باہر نہ نکلتا تو تم ساری زندگی اپنی بیٹی کو تلاش کرتے رہتے“۔

”کہاں ہے میری بیٹی؟“ زینب نے تڑپ کر پوچھا۔

”پہلے تو تم بتاؤ کہ تمہاری بیٹی کہاں ہے؟“ پیر صاحب نے اُسے ڈانٹ کر کہا۔ ”بڑے شگن کرنے چلی تھی۔ میرا ایک جن اُسے اٹھا کر کوہ قاف لے جا رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لڑکی تھی اور دوسرے ہاتھ میں تمہارے ہی گاؤں کا ایک لڑکا تھا۔ میں نے دونوں بچوں کو جن سے چھین لیا۔ لڑکا تو اُسی وقت اپنے گاؤں چلا گیا اور لڑکی میرے پاس ہے“۔

پیر صاحب نے اپنے ایک مرید کو اشارہ کیا اور وہ نصرت کو لے آیا۔ نصرت گم صم اپنے ماں باپ کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے انہیں پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

اتنی دیر میں دروازہ کھلا اور ریاض اندر داخل ہو کر پیر صاحب کے قدموں میں گر گیا۔ انہوں نے اسے اٹھایا اور اپنے پاس بٹھایا۔

”یہ ہے وہ لڑکا“۔ انہوں نے کہا۔ ”تمہارے گناہوں کی سزا ان معصوموں کو بھگتنی پڑی ہے۔ اب ایک بات کا خیال رکھنا۔ یہ دونوں بچے کوہ قاف کی مخلوق کی نظروں میں آ گئے ہیں۔ ان کی شادی جس کسی کے ساتھ بھی ہوگی، وہ جنوں کے غضب کا نشانہ بن جائے گا۔ یا تو ان کی آپس میں شادی کر دو یا پھر انہیں ساری زندگی کنوارہ رکھنا“۔

”لیکن حضور!“ دادا نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

”اگر تمہاری نیت میں کھوٹ ہے“۔ بابا جی ایک بار پھر جلال میں آ کر کہنے لگے۔ ”اور تم نے اپنی مرضی کرنی ہے تو پھر آئندہ مجھے اپنی شکل نہ دکھانا“۔

”حضور!“ دادا بولا۔ ”ہم تو یہ کہہ رہے تھے کہ ہم آپ کا حکم مانیں گے اور لڑکے کا باپ راضی ہوا تو ان کی شادی کر دیں گے“۔

”کم بختو!“ پیر صاحب نے جلال سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”خدا کا شکر ادا کرو کہ میری نظر پڑ گئی ورنہ یہ لڑکی اور یہ لڑکا اس وقت کوہ قاف کی کسی غار میں قید ہوتے“۔

یہ بات اُن لوگوں کی سمجھ میں آ گئی اور انہوں نے نصرت کی شادی ریاض سے کرنے کا وعدہ کر لیا۔ پیر صاحب کی بات رد کرنے کی کسی میں بھی جرأت نہیں تھی۔

کچھ دنوں بعد ایک کاما شادی کی دعوت لے کر احمد خان کے گھر پہنچا۔ اُس کے سارے خاندان کو اس شادی میں بلایا گیا تھا۔ یہ دعوت زینب کے سسر کی طرف سے تھی۔ احمد خان بالکل اُسی طرح نصرت کی شادی میں شریک ہوا جس طرح کوئی ماموں اپنی بھانجی کی شادی میں شریک ہوتا ہے۔ اس طرح احمد خان کی وجہ سے زینب کا مسئلہ بھی حل ہوا اور اُس کی بیٹی کی شادی اُس کی مرضی کے مطابق ہوگئی۔

آج میں آپ کو یہ بات بتا رہا ہوں کہ احمد خان نے نصرت کو اپنے گھر میں چھپا کر پیر صاحب سے مشورہ کیا تھا۔ اس سے آگے ڈرامہ پیر صاحب کے دماغ کی پیداوار تھا۔ ایک تو اُن کی احمد خان کے ساتھ بے تکلفی تھی، دوسرے وہ سچے دل سے نصرت اور ریاض کی مدد کرنا چاہتے تھے۔

اب آپ پوچھیں گے کہ یہ ساری باتیں مجھ تک کس طرح پہنچی ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ میں اسی احمد خان کا بیٹا ہوں اور مجھے یہ کہانی میرے والد صاحب نے خود سنائی تھی۔

❁❁❁

ایک حقیقت ایک افسانہ

خالص عرق گلاب

اس کا باپ مرض الموت میں مبتلا تھا اور علاج کے لئے دیسی گلاب کے خالص عرق کی ضرورت تھی اور وہ پاگلوں کی طرح عرق تلاش کر رہا تھا۔

☆ محمد صدیق شاہ بخاری

انور کے والد صاحب کو بیمار ہوئے ایک ماہ سے زیادہ عرصہ ہونے کو تھا۔ آج ان کی پوری رات کراہتے ہوئے گزری تھی۔ کھانسی کا دورہ تو ان کے لئے خاص طور پر بہت تکلیف دہ ہوا کرتا تھا کہ اس میں بعض اوقات سانس بھی رکتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ آج شب یہ بھی کئی دفعہ ہو چکا تھا۔ ابھی چند منٹ قبل ان کی آنکھ لگی تھی۔ اسی اثنا میں قریبی مسجد سے اذانِ فجر بلند ہوئی۔ انور کو اذان کا سننا بہت اچھا لگتا تھا، مگر اس وقت اس پر یہ آواز گراں گزر رہی تھی۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں یہ آواز والد صاحب کے آرام کو پھر تکلیف میں نہ بدل دے۔

ابھی نماز میں آدھ گھنٹا باقی تھا۔ اس نے سوچا کہ تھوڑی دیر کے لئے سستا لے۔ وہ کرسی پر نیم دراز ہوا۔ اس کی نظر ابھی تک اپنے والد پر جمی ہوئی تھی۔ کچھ ہی لمحے گزرے تھے کہ اسے محسوس ہوا جیسے سامنے چارپائی پر وہ خود لیٹا ہوا ہے اور اس کے والد اس کی جگہ پر ہیں۔ آج سے بیس برس قبل جب وہ پندرہ برس کا تھا تو وہ بھی ایسا ہی شدید بیمار ہوا تھا اور اس کے والد نے بھی کتنی راتیں اس کے سرہانے یوں ہی بیٹھے بیٹھے گزار دی تھیں۔ مزدور باپ نے اپنے اکلوتے بیٹے کے لئے اپنی سائیکل بھی بیچ ڈالی تھی اور اس کی ماں نے اپنے جہیز کی آخری چیز، انگوٹھی بھی فروخت کر دی تھی، مگر پھر بھی اس کے علاج کے اخراجات سنبھل نہ پائے تھے۔ دن کو مزدوری کی مشقت اور راتوں کی جاگنے کی وجہ سے ایک دن اس کا باپ شدید بخار میں مبتلا ہو گیا۔ مگر وہ پھر بھی ڈاکٹر کے پاس گیا اور کہا کہ ڈاکٹر صاحب مجھے کوئی ایسی دوا دے دیں کہ میرا بخار فوراً اتر جائے تاکہ میں کام پر جا سکوں۔ ورنہ شام کو اپنے بچے کے لئے دوا نہ خرید سکوں گا۔ بالآخر باپ کی محنت رنگ لائی۔ بیٹا صحت مند ہو گیا۔

مگر انور کی تو ساری محنت رائیگاں جا رہی تھی۔ صورتِ حال یہ تھی کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا

کی۔ وہ بھی ہر جتن کر رہا تھا مگر بے سود۔ ڈاکٹروں سے مایوس ہو کر وہ حکیموں کے پاس پہنچا۔ کل شام وہ ساتویں حکیم سے ہو کر آیا تھا مگر عجیب بات تھی کہ سب حکما کی ایک ہی رائے تھی کہ تمہارے باپ کی بیماری بالکل قابل علاج ہے مگر دوا بنانے کے لئے خالص دیسی گلاب کا خالص عرق چاہئے۔ پچھلے ایک ہفتے سے وہ مسلسل خالص عرقِ گلاب کی تلاش میں سرگرداں تھا مگر خالص عرق گلاب ہر جگہ ناپید تھا۔ اسی لمحے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خود دیسی گلاب حاصل کر کے عرق کشید کرے گا۔ صبح ہوتے ہی وہ قبرستان میانی صاحب کے باہر پھول بیچنے والوں کے پاس پہنچا اور ان سے معلومات لیں کہ دیسی گلاب کہاں سے مل سکتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اس سال دیسی گلاب کی فصل کیڑا لگنے سے مکمل تباہ ہو گئی ہے، اب تو ان کا حصول ممکن نہیں۔

وہاں سے چلتا چلتا وہ بازار گل فروشاں لوہاری گیٹ پہنچا۔ وہاں سے بھی اسے یہی جواب ملا۔ وہ پھر بھی مایوس نہ ہوا، اس کی اگلی منزل شرق پور روڈ تھی۔ وہاں پھول بیچنے والے بکثرت موجود تھے۔ ان کے پاس ہر قسم کا گلاب بھی موجود تھا، سوائے دیسی گلاب کے۔ اس نے ان سے فرداً فرداً پوچھا کہ دیسی گلاب کے ملنے کی کوئی صورت ہے؟ انہوں نے بتایا کہ اب تو یہ ممکن نہیں، اگلی فصل تک انتظار کرنا ہوگا۔ انور بڑبڑایا۔ اگلی فصل تک؟ اس پر تو ایک ایک لمحہ بھاری ہو رہا تھا۔ اسی دوڑ دھوپ میں دن کے دس بج چکے تھے، اس نے سوچا کہ شرق پور کے پاس عباس پور گاؤں جا کر خود گلاب کی فصل دیکھے کہ شاید کچھ پھول کیڑے کی دست برد سے بچ گئے ہوں۔

ابھی اس نے موٹر سائیکل کا رخ ادھر کیا ہی تھا کہ اسے خیال آیا کہ آج تو والد صاحب کی طبیعت زیادہ خرب تھی، انہیں ایک دفعہ دیکھ کر پھر جاتا ہوں۔ وہ گھر کی طرف پلٹا۔ ابھی گھر کے دروازے ہی میں تھا کہ اسے محسوس ہوا کہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ وہ تیزی سے والد صاحب کی چارپائی کی طرف لپکا۔ والد صاحب کا رنگ پہلے سے بھی زیادہ زرد ہو چکا تھا۔ نبض کی حرکت احساس سے ماوراٗ ہو چکی تھی۔ گردن ایک طرف ڈھلک گئی تھی اور جسم کی بچی کھچی گرمی بھی سردی میں بدل چکی تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ جب صبح وہ عرق کی تلاش میں نکلا تھا تو اس وقت ان کی روح بھی عدن کے باغوں کی تلاش میں نکل گئی تھی۔ پھر اس نے آنکھیں دیکھیں تو یوں محسوس ہوا جیسے وہ ابھی روشن ہیں اور جیسے وہ سوال کر رہی ہیں کہ مل گیا عرقِ گلاب؟

سوال کرتی آنکھوں نے اس کے اندر ایک موہوم سی امید کا دیا روشن کر دیا تھا۔ وہ تیزی سے باہر نکلا کہ حکیم صاحب کو بلا کر لائے کہ شاید وہ اس کی امید کی تائید کر دیں۔ اس کی والدہ نے بھاگتے ہوئے انور کے ہاتھوں میں ایک دفعہ پھر عرق گلاب کی خالی بوتل تھما دی تھی۔ حکیم صاحب کے مطب کے باہر سے اس نے انہیں آواز دی کہ جلدی آیئے۔ مگر اس نے دیکھا کہ وہ بڑے انہماک سے اخبار کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ حکیم صاحب اس کی آواز سن کر چونکے۔ انہوں نے اپنی عینک اتاری اور کہا۔

اندر آ جاؤ جلدی سے، تمہارے کام کی ایک چیز ہے۔ وہ اندر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ حکیم صاحب ایک خبر کو انڈر لائن کر رہے ہیں۔ اخبار کے صفحۂ اوّل پر یہ خبر تصویر کے ساتھ نمایاں انداز میں چھپی ہوئی تھی کہ کل گورنر پنجاب نے انڈیا سے خصوصی طور پر درآمد کردہ دیسی گلاب سے تیار شدہ 50 من خالص عرق گلاب سے دربار داتا صاحب کو غسل دیا۔

❀❀❀

جرم و سزا

بنگالن، غیرت اور سزائے موت

انہوں نے رات کے اندھیرے میں لڑکی کو چاقو اور خنجر دکھا کر دہشت زدہ کیا اور پھر اس کے منہ پر کپڑا باندھ کر گھوڑی پر بٹھا کر لے گئے۔

ایک شعر کا دوسرا مصرعہ ہے:

اک شمع رہ گئی سو وہ بھی خموش ہے

اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے زندہ دل احباب کی محفل کی میں ایک ہی شمع رہ گیا ہوں لیکن خاموش نہیں ہوں۔ خاموش اُس وقت ہوں گا جس وقت اللہ کا بلاوا آئے گا اور میرے گاؤں کے لوگ کہیں گے۔

"ہائے، باوا صابو مر گیا ہے"۔ پھر یہ لوگ باوا صابو کو بھول جائیں گے۔ افسوس ہوگا تو میری آل اولاد کو ہوگا۔ انہیں اتنا ہی زیادہ افسوس ہوگا جتنا مجھے اپنے آخری کتے کی موت پر ہوا تھا۔ یہ میرا تیسرا کتا تھا۔ اس نے میرا بڑا لمبا ساتھ دیا تھا۔ اس کو موت کے ساتھ ہی میں نے شکار چھوڑ دیا تھا۔ شکار کی عمر ہی نہیں رہی تھی۔ میرا یہ کتا بڑا ہی زندہ دل تھا۔ اس میں خرابی یہ تھی کہ عاشق مزاج تھا۔ جہاں کہیں اچھی نسل کی نوجوان کتیا دیکھتا، اس کے ساتھ پیار کی پینگیں بڑھانی شروع کر دیتا تھا۔ دلیر اور وفادار اتنا کہ حیران کر دیتا۔ کبھی اس کی پوری سوانح حیات لکھوں گا۔

میں خاموش رہ ہی نہیں سکتا۔ ماضی کی یادیں ہی تو میرے بڑھاپے کا سہارا ہیں۔ ان یادوں میں کھو جاتا ہوں اور کبھی کوئی پرانا واقعہ لکھنے بیٹھ جاتا ہوں اور کبھی پوتوں پوتیوں کو ماضی کی کہانیاں سنانے لگتا ہوں اور اس طرح بڑھاپے میں جوان رہتا ہوں۔

"ابو جی!" ایک روز میرے سب سے چھوٹے بیٹے نے مجھ سے پوچھا۔ "اتنے زیادہ اور اتنے سنسنی خیز واقعات صرف آپ کی زندگی میں ہی کیوں ہوئے ہیں؟ کبھی تو مجھے شک ہوتا ہے کہ آپ یہ کہانیاں خود ہی گھڑ لیتے ہیں"۔

"تم نے شاید میری لکھی ہوئی تمام کہانیاں نہیں پڑھیں"۔ میں نے اپنے بیٹے سے کہا۔ "میں نے ایک کہانی میں اس بات کا جواب تفصیل سے دیا ہے۔ تم بھی سن لو..... دیکھ بیٹے! سنسنی خیز اور حیران کن واقعات انہی کے ساتھ پیش آتے ہیں جو خطرے مول لیتے ہیں اور ایڈونچر کی خاطر خطروں میں کود جاتے ہیں..... اور پھر ڈرامائی واقعات اور پُراسرار حالات انہیں نظر آتے ہیں جو اپنے ذہن کی محدود سی دنیا سے نکل کر دوسروں کو غور اور دھیان سے دیکھتے ہیں۔

"ڈسکو، پاپ اور راک اینڈ رول کلچر کے دلدادہ بند کمروں میں کیا خاک نظر آتا ہے؟ گھر میں بیٹھ کر انڈین فلمیں دیکھ کر تم حقیقی زندگی کے واقعات اور حادثات کو کیسے دیکھ سکتے ہو؟ شہروں کی سڑکوں پر تم اس کے سوا اور کیا دیکھ سکتے ہو کہ دو کاریں کی ٹکرا گئیں، کوئی ویگن سائیکل یا موٹر سائیکل سوار کو کچلتی ہوئی نکل گئی، یا یہ کہ بنک سے ایک آدمی چیک کیش کروا کے نکلا اور دو نوجوان موٹر سائیکل سواروں نے ریوالور دکھا کر کئی لوگوں کے سامنے کیش چھینا اور غائب ہو گئے، یا تم سڑکوں پر اُن لڑکیوں کو تاڑتے پھرتے ہو جنہیں نئی تہذیب نے نیم عریاں کر دیا ہے..... ہمارا لڑکپن اور ہماری جوانی خطروں سے کھیلتے گزری ہے"۔

میں نے تمہید لمبی کر دی ہے۔ ایک بات اور کہوں گا۔ میرے سینے میں ابھی کئی راز دفن ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو میرے ساتھ قبر میں جائیں گے اور کچھ ایسے ہیں جو میں موقع محل دیکھ کر فاش کرتا جا رہا ہوں۔ آج میں آپ کو شکار کی نہیں بلکہ جرم و سزا کی کہانی سناؤں گا۔

ہم حسبِ معمول شکار کو نکلے۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ بقر عید کو تین یا چار دن گزر گئے تھے اور موسم سردیوں کا تھا۔ پندرہ سولہ لڑکے اور آٹھ یا نو کتے تھے۔ گندم کی فصل اُٹھ رہی تھی۔ قربانی کا گوشت اتنا کھا لیا تھا جسے گاؤں میں رہ کر ہضم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ باہر نکلنا اور بھاگنا دوڑنا ضروری ہو گیا تھا۔

پانچ چھ لڑکوں کے پاس غلیلیں تھیں۔ ان میں

سے دو نڑکوں کا نشانہ بڑا اچھا تھا۔ انہوں نے راستے میں دو جنگلی کبوتر اور دو تین فاختہ مار لیں۔ انہیں ہم نے ذبح نہ کیا۔ پر اتار کر یہ پرندے کتوں کے حوالے کر دیئے۔

کتوں کے پٹوں سے ہم نے زنجیریں اتار دیں۔ وہ ادھر اُدھر اٹھکھیلیاں کرتے ہمارے ساتھ چلتے گئے۔ میں اپنے علاقے کے خدو خال کئی بار بیان کر چکا ہوں۔ یہ کھڈ نالوں، گھاٹیوں اور ٹیلوں کا علاقہ ہے۔ کہیں آپ ایسی بلندی پر جا رہے ہوں گے کہ دور کشمیر کے برف پوش پہاڑ اور اُفق سے اُفق تک کی سرسبز وسعت نظر آئے گی اور ذرا ہی آگے جا کر آپ گھاٹی اتریں گے تو آپ قلعے جیسی بلند دیواروں میں گھرے ہوئے ہوں گے۔

ہم ایسی ہی ایک گھاٹی اترے۔ یہ برساتی نالہ تھا۔ اس میں سے گزر کر اگلی گھاٹی چڑھے۔ ہمارے سامنے وسیع و عریض میدان تھا۔ ذرا آگے گئے تو دائیں طرف کنوئیں جیسا گہرا نشیب نظر آیا لیکن یہ کنوئیں سے بہت زیادہ وسیع تھا۔ ہمارے بالمقابل اس کی دیوار میں زمین کے قریب اتنا بڑا دہانہ تھا جس میں سے ایک آدمی ذرا جھک کر گزر سکتا تھا۔ یہ بارش کے پانی کا راستہ تھا۔ ہمارے علاقے میں ایسے نشیب جگہ جگہ ملتے تھے۔ بعض تنگ اور بعض بہت ہی وسیع تھے۔ اب ان میں سے کئی نشیب بارشوں اور آندھیوں نے بھر دیئے ہیں۔

ہم اس نشیب کے منڈیر جیسے کنارے پر جا رہے تھے کہ نیچے کچھ دبی دبی آوازیں سنائی دیں۔ نیچے دیکھا تو ایک چوہا نظر آیا۔ آپ سمجھتے ہوں گے کہ یہ چھوٹا سا چوہا ہو گا جیسے شہروں کے گھروں میں پائے جاتے ہیں۔ شہر کے گھریلو چوہے کا وزن پوری دو چھٹانک نہیں ہوتا۔ میں جس چوہے کی بات کر رہا ہوں وہ بلا مبالغہ درمیانہ جسامت کی بلی جتنا بڑا تھا۔ یہ کھیتوں کے چوہے تھے جو کھیتوں میں بل بنا کر رہتے ہیں۔ عام طور پر ان کی جسامت کتیا کے نوزائیدہ پلوں جتنی ہوتی تھی لیکن بعض اس سے دُگنے اور تگنے موٹے تازے بھی ہوتے تھے۔ یہ چوہے جس کھیت میں بل بناتے تھے وہ کھیت دھنس جاتا تھا کیونکہ بارشوں کا پانی ان بلوں کے اندر چلا جاتا تھا۔ بل دور تک گئے ہوتے تھے۔ ان کشادہ بلوں میں اتنا زیادہ پانی چلا جاتا تھا کہ کھیت کا خاصا حصہ دھنس جاتا تھا۔

میں نے اب دیکھا ہے کہ ہمارے آج کل کے نوجوانوں کی طرح ان جنگلی چوہوں کے بھی قد کاٹھ چھوٹے چھوٹے رہ گئے ہیں۔

میں بتا رہا تھا کہ اس گہرے اور ذرا وسیع نشیب میں ایک موٹا تازہ چوہا دوڑتا ہوا داخل ہوا اور اس کے پیچھے دو جنگلی بلے داخل ہوئے۔ میں نے اپنی دو تین کہانیوں میں جنگلی بلے کا ذکر کیا ہے۔ یہ اُن ہی بلیوں جیسا ہوتا ہے جو ہمارے گھروں اور گلیوں میں گھومتی پھرتی رہتی ہیں لیکن جسامت میں ان سے بڑا، موٹا تازہ اور طاقتور ہوتا ہے۔ بعض جنگلی بلے اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ شیر کے بچے لگتے ہیں۔

جنگلی بلا خونخوار ہوتا ہے۔ انسان کے ساتھ مانوس نہیں ہوتا۔ کسی انسان پر حملہ نہیں کرتا بلکہ انسان کو اور کتے کو دیکھ کر بھاگ جاتا ہے اور اگر اسے کہیں روک لیا جائے اور اسے بھاگنے کا راستہ نہ ملے تو اس کا حملہ بڑا ہی خطرناک ہوتا ہے۔ یہ انسان یا کتے کو چیر پھاڑ سکتا ہے۔ جنگل میں اس کا شکار چوہے، گلہریاں وغیرہ ہوتے ہیں اور یہ خرگوش کو بھی پکڑ لیتا اور کھا جاتا ہے۔

دو جنگلی بلے ایک بڑے ہی موٹے تازے چوہے کے پیچھے نشیب میں داخل ہوئے تو ہم بہت خوش ہوئے۔ یہ جنگلی بلے ہمارا شکار تھے۔ یہ جوڑا تھا، یعنی ایک بلی تھی اور دوسرا بلا۔ ہمارے کتے اِدھر اُدھر پھر

رہے تھے۔ ہم یہ دیکھنے کے لئے دوڑتے ہوئے آگے گئے کہ کنوئیں جیسے اس نشیب میں جو دہانہ بنا ہوا ہے، اس میں کتوں کو داخل کرنے کے لئے کدھر سے نیچے جانا پڑے گا۔

تھوڑی ہی دور آگے ہمیں نالہ سا نظر آیا جو گہرائی میں تھا۔ یہ سیدھا اُس نشیب کے دہانے تک جاتا تھا۔ ہم نے کتوں کو بلایا۔ شکار پر آ کر تو وہ اشارے کے منتظر رہتے تھے۔ اتنے میں چوہا نشیب کے دہانے سے نکل آیا اور دونوں بلے اس کے پیچھے آئے۔ ہم نے دیکھا کہ اتنا بڑا اور طاقتور چوہا اتنا تیز نہیں دوڑ رہا تھا۔ جتنا تیز دوڑنے کی وہ طاقت رکھتا تھا۔ وہ ذرا ذرا اچھلتا تھا لیکن آگے کم ہی بڑھتا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ شدید زخمی ہو گیا ہو اور اس سے چلا بھی نہ جاتا ہو۔

چوہا زخمی نہیں تھا، نہ اسے چوٹ لگی تھی۔ دراصل اس کی بھاگنے کی طاقت سلب ہو گئی تھی۔ کبھی آپ بلی کو چوہے یا گلہری کے پیچھے دوڑتا دیکھیں تو آپ دیکھیں گے کہ چوہا یا گلہری تیز دوڑ ہی نہیں سکتے۔ ان پر بلی کا اتنا زیادہ خوف طاری ہو جاتا ہے کہ ان کے دوڑنے کی طاقت سلب ہو جاتی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چوہا یا گلہری ہپناٹائز ہو جاتے ہیں۔ اگر چوہے یا گلہری کے سامنے اچانک سانپ آ جائے تو یہ وہیں رکے رہتے ہیں، بھاگ نہیں سکتے اور اگر انسان، کتا یا بھیڑیا وغیرہ انہیں پکڑنے کے لئے ان کے پیچھے دوڑے تو ان کی رفتار حیران کن حد تک تیز ہو جاتی ہے۔

وہ موٹا اور ہٹا کٹا چوہا بھی دوڑنے کی طاقت سے محروم ہو گیا تھا۔ وہ جگہ جسے میں نے نالہ کہا ہے، اس قسم کی تھی کہ دونوں طرف سے زمین ڈھلانی ہو کر نیچے چلی گئی تھی اور ان کے درمیان اتنی جگہ تھی جس سے دو آدمی پہلو بہ پہلو گزر سکتے تھے۔ اس میں سے بارش کا پانی گزرتا تھا۔

بلوں نے چوہے کو پکڑ لیا۔ بلوں کو ذرا سا بھی ڈر نہیں تھا کہ اتنے سارے انسان ان کے سر پر کھڑے ہیں۔ ایک تو وہ جنگلی بلے تھے، دوسرے وہ شکار کو پکڑ رہے تھے۔ اتنے میں ہمارے کتے آ گئے۔ وہ بھونکنے اور غرائے تو بلوں نے دیکھا۔ وہ اپنا شکار چھوڑ کر اوپر کو بھاگے۔ چوہا ان کے پنجوں اور دانتوں سے ابھی زیادہ زخمی نہیں ہوا تھا۔ اس نے دیکھا کہ بلے بھاگ گئے ہیں تو وہ واپس نشیب کی طرف دوڑا۔ اب وہ اپنی پوری رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ دو تین کُتے اُس کے پیچھے چلے گئے اور باقی بلوں کے پیچھے گئے۔

جنگلی بلے میں خطرہ یہ ہوتا ہے کہ پنجہ مار کر کتے کی آنکھ نکال دیتا ہے اور اس میں شیر کی خصلتیں ہوتی ہیں۔ کتے ان دونوں کے پیچھے گئے۔ وہ الگ نہیں ہو رہے تھے۔ شاید اس لئے کہ یہ جوڑا تھا۔ ان کی رفتار بہت ہی تیز تھی۔ کتوں کی رفتار بھی کم نہیں تھی لیکن آگے بڑ کا ایک پرانا درخت آ گیا جو بہت ہی بڑا اور پھیلا ہوا تھا۔ دونوں بلوں نے اس کے قریب جا کر جمپ لگائی اور درخت پر چڑھ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اوپر ہی اوپر چڑھتے ہوئے درخت پر ہی کہیں چھپ گئے۔ کتے نیچے ہی اچھلتے رہے اور ہم ایک دوسرے کے منہ دیکھتے رہ گئے۔

وہاں سے ہم آگے چل پڑے۔ کچھ دن پہلے ہمیں ایک آدمی نے ایک جگہ کا راستہ سمجھا کر بتایا تھا کہ وہاں بہت سے خرگوش اکٹھے ہو گئے ہیں۔ وہ جگہ دور اور ویرانے میں تھی جہاں سے کوئی راستہ نہیں گزرتا تھا۔ وہاں سبزہ تھا اور پانی کا قدرتی تالاب بھی بنا ہوا تھا۔ خرگوشوں کے لئے ایسی ہی جگہ موزوں ہوا کرتی ہے۔ ہم اس روز اس جگہ جا رہے تھے۔ وہ جگہ ابھی دور تھی۔

ہم آبادیوں اور پگڈنڈیوں سے ہٹ کر جا رہے تھے۔ کتوں کو ہم نے کھلا چھوڑ رکھا تھا۔ کچھ اور آگے

گئے تو ایک گھاٹی اترے۔ یہ بھی ایک نشیب تھا جس کے وسط میں کچھ پانی تھا۔ نشیب لمبوترا اور کم و بیش پچاس قدم لمبا اور تقریباً بیس قدم چوڑا تھا۔ اس کے کنارے دیواروں جیسے اور اونچے تھے۔

اس میں نکلنے کے لئے ہم اگلی گھاٹی چڑھے۔ اب ہمارے سامنے ویران علاقہ تھا۔ کوئی گاؤں نظر نہیں آتا تھا۔ کہیں کہیں ٹیلے تھے اور ایک طرف سِلوں والی چٹان تھی جو کچھ دور تک چلی گئی تھی۔ ہم چٹان کی طرف جا رہے تھے۔ خرگوشوں والی جگہ بتانے والے نے بتایا تھا کہ راستے میں سِلوں والی چٹان آئے گی۔

ہم چٹان کے قریب پہنچے تو اس کے سامنے جو ٹیلہ تھا، اس کے پیچھے سے دو آدمی نکلے اور ان کے پیچھے ایک گھوڑی نکلی۔ گھوڑی کی باگ ان دو آدمیوں میں سے ایک نے پکڑ رکھی تھی۔ گھوڑی پر ایک عورت سوار تھی۔ ایک آدمی نے ایک کتے کی زنجیر پکڑی ہوئی تھی۔ کتا بھیڑیے کی نسل کا معلوم ہوتا تھا۔ اس نسل کے کتے رکھوالی کے لئے بہت اچھے ہوتے ہیں اور لڑتے بھی خوب ہیں۔

وہ ہم سے تیس پینتیس قدم کے فاصلے پر تھے۔ ہمارے کتوں نے اس کتے کو دیکھا تو آہستہ آہستہ غرانے لگے اور اس کی طرف چل پڑے۔ ہم نے اپنے کتوں کو منع کیا کہ وہ کوئی بدمعاشی نہ کریں لیکن ہوا یوں کہ وہ کتا اچانک ایک جھٹکے سے اپنے مالک کے ہاتھ سے زنجیر چھڑوا کر ہمارے کتوں کی طرف دوڑتا آیا۔ وہ دلیر معلوم ہوتا تھا۔

ادھر سے ہمارا بوبلی دوڑ کر آگے ہوا۔ وہ کتوں کا لیڈر تھا۔ وہ اس کتے کی طرف دوڑا۔ اُدھر سے وہ کتا دوڑتا آیا۔ بوبلی نے اُس پر حملہ کر دیا۔ وہ کتا مقابلے میں ڈٹ گیا۔ اُدھر سے اُس کا مالک ادھر آیا۔ ادھر سے ہم آگے بڑھے کہ کتوں کو چھڑا دیں۔ پیشتر اس کے ہم پہنچتے، ہمارے تمام کتے اس اکیلے کتے پر ٹوٹ پڑے۔ ہمارے کتے اپنے لیڈر کی توہین برداشت نہیں کیا کرتے تھے۔

اُس کتے نے بھاگ نکلنے میں ہی خیریت سمجھی۔ ہمارے کتے اس کے تعاقب میں گئے۔ وہ گھوڑی کے نیچے چلا گیا۔ گھوڑی رُکی ہوئی تھی۔ ہمارے کتوں نے اُس کتے کو گھوڑی کے نیچے سے جا پکڑا۔ گھوڑی ایسی بُری طرح بدکی کہ بھاگنے لگی۔ جس آدمی نے باگ پکڑی ہوئی تھی، اُس نے گھوڑی کو قابو میں رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن کتے اس آدمی کی ٹانگوں سے بھی ایسے ٹکرائے کہ وہ گر پڑا اور اس کے ہاتھ سے باگ چھوٹ گئی اور گھوڑی ایک طرف دوڑ پڑی۔

''گھوڑی روکو اوئے''۔ ہمارے کسی ساتھی نے چلا کر کہا۔ ''یہ لڑکی گر پڑی تو ماری جائے گی''۔

ہمارے کچھ ساتھی گھوڑی کے پیچھے دوڑ پڑے اور باقی اپنے کتوں کو زنجیریں ڈال کر قابو میں لانے لگے۔ میں گھوڑی کو روکنے والی پارٹی میں تھا۔ ہم پانچ چھ لڑکے تھے۔ گھوڑی کو ہم دائیں، بائیں اور آگے کو پھیل کر روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کی سوار جوان لڑکی تھی۔ وہ چیخ چلا رہی تھی۔ اللہ نے اس پر یہ کرم کیا کہ گھوڑی کا رخ چٹان کی طرف ہو گیا اور چٹان نے اسے روک لیا۔ دائیں اور بائیں ہم تھے اس لئے گھوڑی دائیں اور بائیں نہیں جا سکتی تھی۔ ہم نے گھوڑی کو پکڑ کر اسے تھپکیاں اور لڑکی کو تسلیاں دیں۔ لڑکی کا تو بُرا ہی حال تھا۔ وہ گندمی رنگ کی خوبصورت لڑکی تھی۔ اس سے اس کا گاؤں پوچھا تو وہ آنکھیں پھاڑے ہمیں دیکھتی رہی۔ ہم سمجھے کہ وہ خوفزدگی کی وجہ سے ابھی بول نہیں سکتی۔ ہم سب نے باری باری اسے کہا کہ دل سے ڈر اتار دے اور خدا کا شکر ادا کرے کہ وہ گھوڑی سے گری نہیں۔

"تم پوٹھوہارن ہو کر اتنی زیادہ ڈری ہوئی ہو!" میں نے کہا۔ "اتنی بزدل؟"

"بنگالی" کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ "ہم بنگالی"۔

وہ بنگالن تھی۔ ہم اس سے کچھ اور پوچھنا چاہتے تھے لیکن اس کے ساتھ کا ایک آدمی چٹان کی دوسری طرف سے دوڑتا آیا۔ اُسے دیکھ کر لڑکی ہمارے پیچھے ہو گئی۔

"نہیں"۔ اُس نے ڈرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "نہیں جانا... ساتھ نہیں جانا"۔

ہمارے لئے یہ کوئی حیرت والی بات نہیں تھی کہ بنگال کی لڑکی پوٹھوہار کے علاقے میں کیسے آ گئی ہے۔ یہ بھی آپ کو بتا دوں گا۔ ہم ابھی تک یہی سمجھ رہے تھے کہ لڑکی ڈری ہوئی ہے اور گھوڑی پر نہیں بیٹھنا چاہتی۔ ہم نے اس آدمی سے کہا کہ یہ گھوڑی سے ڈر گئی ہے، اسے پیدل ساتھ لے جاؤ۔

میں نے لڑکی کا بازو پکڑ کر پیار سے کہا۔ "آؤ بیٹی، اب گھوڑی پر نہ بیٹھنا" لیکن وہ اپنا بازو چھڑا کر ہمارے پیچھے ہو گئی۔ وہ اس آدمی کے ساتھ نہیں جا رہی تھی۔ ہم اسے بہلا پھسلا کر اُدھر لے گئے جہاں سے کتوں نے گھوڑی کو بھگایا تھا۔ ہمارے ساتھیوں نے کتوں کو زنجیریں ڈال دی تھیں۔ ہمیں توقع تھی کہ جس کتے نے ہمارے کتوں کو مشتعل کیا تھا، اُس کا مالک ناراضگی کا اظہار کرے گا لیکن اس کا انداز دوستانہ اور شریفانہ تھا۔ لباس اور انداز سے وہ اونچی ذات کا معزز آدمی لگتا تھا اور وہ زندہ مزاج بھی معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے کتوں کی لڑائی کی بات مزاحیہ انداز میں کی۔

"اچھا دوستو!" اس معزز آدمی نے ہماری طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "اچھا شغل ہو گیا۔ اب چلتے ہیں۔ شکر ہے ہماری لڑکی بچ گئی ہے۔ یہ تمہاری ہمت تھی کہ گھوڑی کو روک لیا ورنہ لڑکی جان خطرے میں آ گئی تھی"۔

اس نے ہم سب سے ہاتھ ملایا اور جب لڑکی سے چلنے کو کہا تو لڑکی پھر ہمارے پیچھے ہو گئی۔ اب اس نے ہاتھ جوڑ کر رونا شروع کر دیا۔ اس معزز آدمی نے بڑے غصے سے اُسے اٹھنے کو کہا۔ لڑکی ہمارے ایک ساتھی کی ٹانگ سے لپٹ گئی۔

"نائیں جانا"۔ لڑکی واویلا بپا کرنے لگی۔ "نائیں... نائیں...... ام اشرف کا بیوی...... یہ نائیں...... یہ نائیں"۔

لڑکی ٹوٹی پھوٹی اردو اور اشاروں میں ہمیں سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ ان دو آدمیوں کے ساتھ نہیں جائے گی اور وہ اشرف کی بیوی ہے۔ اس کے اشاروں سے میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ اس کے ساتھ زبردستی اور جبر ہو رہا ہے۔ میں نے ان دونوں آدمیوں سے پوچھا کہ یہ معاملہ کیا ہے؟

"تم سب اپنے شکار کو جاؤ یارو!" معزز آدمی نے ہمیں کہا۔ "اشرف میرا چھوٹا بھائی ہے۔ وہ اسے بنگال سے بیاہ لایا ہے اور اسے گھر چھوڑ کر واپس بنگال اپنی نوکری پر چلا گیا ہے۔ یہ کہتی ہے کہ اس کے ساتھ جانا ہے"۔

"اب اسے لے جا کہاں رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اپنے پیر صاحب کے سلام کے لئے اسے لے جا رہے ہیں"۔ اس نے جواب دیا۔ "تم جاؤ"۔

لڑکی نے شاید اس کی بات سمجھ لی تھی۔ اس نے پھر واویلا بپا کر دیا۔ "نائیں، نائیں، نائیں...... جھوٹ"۔ اور وہ ہماری ٹانگوں کے ساتھ لپٹتی، ہاتھ جوڑتی اور روتی تھی۔

آج کل تو لوگوں کے سامنے ایک آدمی قتل ہو رہا

ہو تو وہ منہ پھیر لیتے یا وہاں سے کھسک جاتے ہیں۔ موقع کے گواہ بھی گواہی دینے سے انکاری ہو جاتے ہیں۔ ہماری نوجوانی کے دور کی بات کچھ اور تھی۔ کسی گھر کے اندر کوئی شور شرابہ اٹھتا تھا تو پڑوسی دوڑ کر پہنچتے اور پوچھتے تھے کہ گھر والے خیریت سے تو ہیں۔ وہ انگریز کا دور تھا جو اپنے قانون کی توہین برداشت نہیں کرتے تھے اور لوگوں میں اخلاق اور کردار تھا۔ ایک دوسرے کو کسی مشکل اور مصیبت میں دیکھ کر نظریں پھیر نہیں لیا کرتے تھے۔

ہمیں اس بنگالی لڑکی کے متعلق شک ہونے لگا کہ معاملہ گڑبڑ والا ہے۔ ہم نے ان دونوں آدمیوں پر جرح شروع کر دی۔ میں نے جس آدمی کو معزز کہا ہے، وہ غصے میں آ گیا۔ اس آدمی کی عمر پینتیس چھتیس سال تھی۔ اس کا ساتھی اس سے چار پانچ سال چھوٹا تھا۔

"ہوش کرو لڑکو!" اس معزز آدمی نے قدرے غصیلی آواز میں کہا۔ "تم نے تو یوں تفتیش شروع کر دی ہے جیسے تم سب تھانیدار اور حوالدار ہو اور ہم چور ہیں۔ میں تمہیں کہہ چکا ہوں کہ کھسکو یہاں سے، تم سر چڑھتے جا رہے ہو ... یہ ہماری اپنی لڑکی ہے"۔

"پھر تمہارے ساتھ جاتی کیوں نہیں؟" میرے دوست افضل نے پوچھا۔

"جاتی ہے یا نہیں جاتی"۔ اس نے کہا۔ "تم اس کے مامے چاچے لگتے ہو؟"

ہمیں مشتعل کرنے کے لئے "مامے چاچے" کہہ دینا ہی کافی تھا۔ اس کے ساتھ بنگالن کا واویلا اور اس کا ہماری ٹانگوں کے ساتھ لپٹ لپٹ جانا، ہاتھ جوڑنا اور رو رو کر کہنا۔ "ام نا ئیں جانا.... ام اشرف کا بیوی .... یہ نا ئیں"۔ ہماری عزت کو للکار رہا تھا۔ ہمارے ساتھ درجن بھر کتے تھے اور سوا درجن ہم خود تھے۔ ہم ڈٹ گئے۔

"تم جو کوئی بھی ہو"۔ میرے دوست شاہباز خان نے کہا۔ "اور جہاں کہیں کے بھی رہنے والے ہو، ہمیں پروا نہیں۔ اس لڑکی کو ہم نہیں جانے دیں گے۔ ہمیں اصل بات بتا دو"۔

یہاں سے ہمارے درمیان تلخی پیدا ہو گئی۔ ہمارا لہو پہلے سے ہی گرم تھا۔ ہم نے لڑکی کو اپنی پناہ میں لے لیا اور ان آدمیوں سے کہا کہ ہم لڑکی کو تھانے لے جائیں گے اور وہ تھانیدار کی اجازت سے لڑکی کو لے جائے۔

"تم اپنی موت کو آوازیں دے رہے ہو"۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ "ہم نے اپنے گاؤں میں جا کر بتا دیا کہ تم نے ہماری لڑکی ہم سے چھینی ہے تو گاؤں کا، بچہ بچہ لاٹھیاں اور کلہاڑیاں لے کر پہنچ جائے گا اور تمہاری بوٹی بھی نہیں ملے گی"۔

"بسم اللہ، بسم اللہ"۔ میں نے کہا۔ "جاؤ، گاؤں والوں کو ساتھ لے آؤ"۔ میں نے اپنے دوستوں سے کہا۔ "بیٹھ جاؤ بھائیو!"

وہ کچھ اور ہی باتیں کرنے لگے۔ اس ڈرامے کا ایک اور پردہ اٹھا جو بالکل ہی غیر متوقع تھا اور یہ بہت ہی عجیب اتفاق تھا۔ بنگالن کی قسمت اچھی تھی اور وہ اتنی نیک لڑکی تھی کہ خدا نے اسے مدد بھیج دی۔ یہ مدد پولیس کی صورت میں تھی۔ قریب سے ایک راستہ گزرتا تھا جو ذرا آگے جا کر نیچے چلا جاتا تھا۔ وہاں سے علاقے کا تھانیدار اوپر اٹھا پھر اس کا گھوڑا نظر آیا پھر اس کے پیچھے ایک ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبل ابھرے۔ ان کے ساتھ کسی گاؤں کے تین چار آدمی تھے۔

"یہ بھی ٹھیک رہا"۔ ہمارے ایک ساتھی نے کہا۔ "پولیس یہیں آ گئی ہے"۔

مجھے آج تک یاد ہے۔ میں نے اُس آدمی کو دیکھا جسے میں نے معزز کہا ہے۔ اس کے چہرے پر

گھبراہٹ اور بے چینی آ گئی تھی۔ وہ اپنے ساتھی کی طرف اور ساتھی اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دونوں کھڑے تھے۔ دونوں نے مڑ کر پشت راستے کی طرف کر دی۔

''بیٹھ جاؤ بھائیو!'' معزز آدمی نے ہمیں کہا۔ ''انہیں گزر جانے دو پھر تمہیں اس لڑکی کی اصل بات سنائیں گے۔ بڑے مزے کی بات ہے''۔

ہم میں سے کوئی بھی نہ بیٹھا اور ہم سب پر خاموشی طاری ہوگئی۔ تھانیداروں کا بڑا رعب ہوا کرتا تھا۔ یہ تھانیدار جو چلا آ رہا تھا، اس دیہاتی علاقے کا تھانیدار تھا۔ وہ ہماری طرف دیکھتا آ رہا تھا۔ وہ ذرا قریب آ گیا تو بنگالی لڑکی اچانک اٹھی اور تھانیدار کی طرف دوڑ پڑی۔ تھانیدار نے اُسے دیکھتے ہی گھوڑا روک لیا۔

تھانیدار نے گھوڑا روک لیا۔ ہم سب اُدھر دیکھ رہے تھے۔ لڑکی نے تھانیدار کے پاس پہنچ کر اس کی ٹانگ پکڑ لی اور بولنا شروع کر دیا۔ اِدھر یہ دونوں آدمی آہستہ آہستہ سرکتے ایک طرف ہو گئے۔ قریب ایک ٹیلہ تھا۔ دونوں دوڑ کر اس کے پیچھے چلے گئے۔

''او دیکھو اوئے!'' ہمارے کسی ساتھی کی آواز سنائی دی۔ ''وہ دونوں غائب ہو گئے ہیں۔''

تین لڑکوں نے ٹیلے کے پیچھے دیکھا تو وہ دونوں وہاں سے بھاگ اٹھے۔ ہمارے ان ساتھیوں کے کتے ان کے ساتھ تھے۔ انہوں نے کتوں کی زنجیریں اتار کر کتے ان کے پیچھے چھوڑ دیئے۔ خود بھی کتوں کے پیچھے دوڑے۔ کتوں نے انہیں دور نہ جانے دیا۔ وہ چٹان کے پیچھے چلے گئے تھے۔ اِدھر تھانیدار ہمارے پاس پہنچا اُدھر سے ہمارے ساتھ اُن دونوں آدمیوں کو پکڑ کر لے آئے۔ تھانیدار گھوڑے سے اتر آیا...... بنگالن دونوں آدمیوں کی طرف اشارہ کر کے پھر بولنے لگی۔ وہ کچھ الفاظ اردو کے اور باقی اپنی زبان بولتی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

اب اگر میں ہر وہ بات سنانے لگا جو تھانیدار نے اُن سے پوچھی اور جو بات انہوں نے کہی اور تھانیدار نے ہم سے کیا پوچھا اور ہم میں سے کس نے کیا جواب دیا تو کہانی بہت ہی لمبی ہو جائے گی اور ہوسکتا ہے کہانی بے مزہ بھی ہو جائے۔ کام کی باتیں سنا دیتا ہوں۔

تھانیدار نے بنگالن کا واویلا سنا جو وہ سمجھ ہی نہ سکا ہوگا لیکن اس نے دیکھا کہ وہ دونوں آدمی بھاگ اٹھے تھے اور ہمارے ساتھی انہیں پکڑ کر لے آئے تھے تو وہ سمجھ گیا کہ ان لوگوں نے بنگالن کے ساتھ کوئی بڑی زیادتی کی ہے۔ تھانیدار نے ان دونوں آدمیوں کو اپنے سامنے کھڑا کیا۔ اس کی نظریں اس آدمی کے چہرے پر جم گئیں جسے میں نے معزز کہا ہے۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' تھانیدار نے اس سے پوچھا اور کہا۔ ''میں تمہیں جانتا ہوں''۔

''بوٹا خان''۔ اس آدمی نے اپنا نام بتایا۔

''بوٹا کہہ بوٹا''۔ تھانیدار نے اُس کے منہ پر بڑی ہی زور سے تھپڑ مارا اور نہایت غلیظ گالی دے کر کہا۔ ''خان غیرت آبرو والے لوگ ہوتے ہیں۔ مجھے تمہارا چہرہ یاد ہے۔ تمہیں سزا ہوئی تھی۔ فوراً بولو کتنی سزا ہوئی تھی اور کیوں ہوئی تھی''۔ تھانیدار نے اُسے ایک ہی سانس میں تین چار گالیاں دے دیں۔

''تین سال پہلے کی بات ہے''۔ اُس آدمی نے کہا۔ ''آپ چکوال تھانے کے تھانیدار تھے۔ میں چوری کی ایک واردات میں پکڑا گیا تھا اور ایک سال قید کی سزا ہوئی تھی''۔

''ہاں، مجھے یاد آ گیا''۔ تھانیدار نے کہا۔ ''تم پیشہ ور وارداتیے ہو...... یہیں بتا دو کہ اس لڑکی کو کہاں سے لائے ہو اور کہاں لے جا رہے تھے؟'' تھانیدار نے

اس کے ساتھی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ ''یہ تمہارا شاگرد ہے؟''

اُس نے سر ہلا کر اقرار کیا کہ یہ اس کا شاگرد ہے۔ تھانیدار نے دونوں سے کہا کہ وہ یہیں اور سب کے سامنے بیان دے دیں ورنہ وہ ان پر کُتے چھوڑ دے گا اور اُسے پوچھنے والا کوئی نہیں۔

یہ بنگالی لڑکی پوٹھوہار میں کیسے آ گئی تھی؟ پہلے اُس سوال کا جواب سن لیں۔ انگریزوں کے دورِ حکومت میں بنگال پولیس اور برما پولیس میں انگریز پٹھانوں اور پنجابیوں کو بھرتی کر کے لے گئے۔ وہ برما اور بنگال کے باشندوں کو پولیس اور فوج کی نوکری کے قابل نہیں سمجھتے تھے۔ ہمارے علاقے کے کئی آدمی بنگال پولیس میں تھے۔

اُس زمانے میں اگر کوئی دیہاتی ریل گاڑی پر دس پندرہ میل سفر کرتا تھا تو یہ اس کی زندگی کا یادگار واقعہ ہوتا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ فلاں شخص نے ریل گاڑی پر اتنا لمبا سفر کیا ہے صرف فوجی تھے جو دور دراز چھاؤنیوں تک سفر کیا کرتے تھے۔ بنگال تو ملک کے دوسرے سرے پر تھا۔ وہاں تک پہنچنے کی کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

بنگال کے متعلق ہمارے خطے میں عجیب وغریب کہانیاں مشہور تھیں۔ زیادہ مشہور بنگال کا جادو تھا اور بنگالی عورتوں کا حُسن بھی بہت مشہور تھا۔ کہتے تھے کہ بنگال کی عورت کسی آدمی پر عاشق ہو جائے اور وہ آدمی اس کی طرف توجہ نہ دے تو متعلقہ بنگالن اُس کی روح گنے میں ڈال لیتی ہے۔ وہ جب گنا چوستی ہے تو وہ آدمی درد سے تڑپتا ہے اور کھچا ہوا اس عورت کے پاس پہنچ جاتا ہے۔

ہمارے وہ آدمی جو بنگال پولیس میں تھے، چھٹی پر آتے تھے تو اسی قسم کی سنسنی خیز اور پُراسرار باتیں سناتے تھے۔ اس سے انہیں بڑی اہمیت ملتی تھی۔ یہ تو دوسری جنگ عظیم میں جب ہر گھر کے ایک ایک دو دو جوان فوج میں بھرتی ہو گئے اور ان میں سے بہت سے بنگال گئے تو پتہ چلا کہ بنگال میں کوئی جادو نہیں اور نہ وہاں کی عورتیں حسین ہیں۔ کوئی بنگالن گورے رنگ کی نہیں ہوتی۔ صرف اتنی سی بات ہے کہ بنگالی عورتوں کے بال لمبے اور ملائم ہوتے ہیں اور ان کی آنکھیں موٹی اور دلکش ہوتی ہیں۔ پھر ہم نے بنگالیوں کی غربت اور نیم فاقہ کشی کی باتیں سنیں۔ 1947ء میں بنگال دو حصوں میں بٹ گیا اور ایک حصہ مشرقی پاکستان بن گیا تو بنگالیوں کو ہم نے قریب سے دیکھا اور پھر اخباروں میں آئے دن دریائی اور سمندری سیلابوں اور طوفانوں کی خبریں آنے لگیں۔ ایک ہی بار کئی ہزار بنگالی سیلاب اور طوفانوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔

ہمارے فوجی جو مشرقی پاکستان میں ہوتے تھے، بتاتے تھے کہ خرگوشوں کی طرح بچے پیدا کرتے رہنا بنگالیوں کی ہابی ہے۔ اگر سیلاب میں دو ہزار بنگالی مارے جائیں تو ان کے پسماندگان اگلے سیلاب تک سوا دو ہزار بچے پیدا کر لیتے ہیں۔

اب میں اس بنگالی لڑکی کی طرف آتا ہوں جس کی میں کہانی سنا رہا ہوں۔ تھانیدار نے وہیں، ہم سب کے سامنے، ان دونوں آدمیوں سے اقبالِ جرم کروا لیا۔ اس وقت کے تھانیدار فرض شناس ہوتے تھے۔ اگر یہ واقعہ آج کے دور میں ہوتا تو وہ بنگالی لڑکی کی بات ہی نہ سنتا۔ کہتا کہ تھانے میں آ کر رپورٹ درج کراؤ۔ اگر وہ لڑکی کی سن ہی لیتا تو ملزموں کو تھانے لے جا کر مُک مُکا کر لیتا اور لڑکی کو ملزموں کے حوالے کر کے تھانے سے رخصت کر دیتا۔

وہ تھانیدار جو غالباً وزیر آباد کے کسی گاؤں کا رہنے والا تھا، اپنی ڈیوٹی اور اپنی حیثیت کو سمجھتا تھا۔ اُس

سے یہ تحقیق نہ سوچا کہ یہ کون سے تھانے کا کیس ہے۔ انہوں نے یہ دیکھا کہ یہ پولیس کا کیس ہے۔ اس نے اسی جگہ کو تھانہ سمجھ لیا اور ملزموں پر تھوڑا سا تشدد کر کے تمام جرم کرا لیا۔

یہ واردات اس طرح ہوئی تھی کہ ہمارے علاقے کے ایک گاؤں کا ایک جوان بنگال پولیس میں ملازم تھا۔ گاؤں میں ہی اس کی منگنی ہو چکی تھی۔ اب یہ انتظار تھا کہ وہ چھٹی آئے تو اس کی شادی کر دی جائے۔ وہ دو مہینوں کی چھٹی لے کر آیا تو اس کے ساتھ یہ بنگالی لڑکی تھی۔ اس نے اس سے شادی کر لی تھی اور اسے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اس نے گھر والوں کو بتایا تو گھر والوں نے سر پیٹ لئے۔ زیادہ صدمہ تو انہیں ہوا جن کی لڑکی کے ساتھ اس کی منگنی ہوئی تھی اور وہ شادی کی تیاریاں کر رہے تھے۔

یہ شخص بڑی جرأت والا جوان تھا۔ اس نے گھر والوں سے کہہ دیا کہ اس لڑکی کو قبول کر لیں۔ اگر انہوں نے اسے تنگ اور پریشان کیا تو وہ اسے ساتھ لے کر واپس بنگال چلا جائے گا اور پھر کبھی واپس نہیں آئے گا۔

جس لڑکی کے ساتھ اس جوان کی منگنی ہوئی تھی اس کے دو بھائی تھے۔ بڑا بھائی بدمعاشی میں منہ مارتا تھا۔ یہ خوشحال زمیندار خاندان تھا۔ یہ بڑا بھائی جوا بھی کھیلا کرتا تھا۔ اس کی یاری بوٹا کے ساتھ تھی۔ بوٹا کسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ وہ جوا کھیلنے آیا کرتا تھا اور سزا یافتہ جرائم پیشہ تھا۔ منگنی والی لڑکی کے بھائی نے بوٹا کے ساتھ بات کی اور کہا کہ وہ اپنے خاندان کی بے عزتی کا انتقام لینا چاہتا ہے۔ اس کا طریقہ اس نے یہ سوچا کہ لڑکی کو قتل کر دیا جائے۔

بوٹا نے کہا کہ وہ اس بنگالن کو اغوا کرے گا اور کسی جگہ لے جا کر بیچ دے گا۔

انہوں نے پلان بنا لیا۔ اس پلان میں کوئی دانشمندی یا استادی نہیں تھی۔ منگنی والی لڑکی کے بھائی نے یہ سوچا تھا کہ بنگالن کو غائب کر کے یہ مشہور کر دیا جائے گا کہ لڑکی خود کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ اس پلان پر عمل درآمد بہت ہی مشکل تھا لیکن اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے کہ یہ کام ہو جائے تو اس کے لئے خود ہی حالات پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں اور یہ کام یا حادثہ یا واقعہ ہو جاتا ہے۔

اغوا کی رات ان کے گاؤں میں ایک شادی کا ہنگامہ تھا۔ وہاں بجلی کی چراغاں تھی نہیں کہ گاؤں میں روشنی ہی روشنی ہوتی۔ صرف شادی والے گھر روشنی تھی۔ سارا گاؤں اس شادی میں شریک تھا۔ بنگالی لڑکی بھی دو تین لڑکیوں کے ساتھ اس ہنگامے میں شامل تھی۔ سوانگئے بھی آئے ہوئے تھے جن کا طنز و مزاح کا اور پھر گانے بجانے کا پروگرام ساری رات چلا کرتا تھا۔ یہ اتنا دلچسپ ہوا کرتا تھا کہ لوگ اس میں گم ہو جایا کرتے تھے۔

بوٹا وہاں پہنچ گیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا ساتھی تھا۔ دونوں گاؤں سے کچھ دور چھپے رہے تھے۔ بنگالی لڑکی کا خاوند اس رات گاؤں میں نہیں تھا۔ وہ جہلم یا راولپنڈی کے قریب کسی گاؤں میں اپنے ایک دوست کی شادی پر چلا گیا تھا اس نے تین چار دن وہیں گزارنے تھے۔

بوٹا نے ایک عورت کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ آدھی رات سے ذرا پہلے یہ عورت بنگالی لڑکی کو ورغلا کر ایک طرف لے گئی۔ بوٹا اور اس کا ساتھی تیار تھے۔ انہوں نے لڑکی کے منہ پر کپڑا باندھ دیا اور اُسے قتل کی دھمکیاں دیتے ہوئے گھوڑی پر بٹھا کر لے گئے۔ راستے میں وہ ویرانے میں رکے۔ انہوں نے لڑکی کا منہ کھول دیا۔ چاقو اور خنجر سے اُسے بہت ڈرایا۔

تی گئی تھی اور بڑی بیبی کی اور اس پر دہشت طاری کر دی۔

وہاں سے سحری کے وقت چلے۔ ان کا رخ چکوال کی طرف تھا لیکن راستے میں ہمارے کتے آ گئے اور ایک مظلوم لڑکی کی مدد کے لئے خدا نے ایک فرض شناس تھانیدار کو وہاں جنگل بیابان میں بھیج دیا۔ وہ تھانیدار دونوں ملزموں کو، بنگالی لڑکی کو اور ہم سب کو تھانے میں لے گیا۔ ملزموں کی نشاندہی پر اس عورت کو بھی تھانے بلا کر حراست میں لے لیا گیا۔ بنگالی لڑکی کی گمشدگی کی رپورٹ ابھی تک تھانے نہیں دی گئی تھی۔

عجیب بات یہ ہوئی کہ منگنی والی لڑکی کے جس بھائی نے بوٹا اور اس کے ساتھی کو بنگالی لڑکی کے اغوا کے لئے کہا تھا، اسے گرفتار نہیں کیا گیا تھا۔ اسے شامل تفتیش کیا گیا تھا لیکن اس کے خلاف مقدمہ نہیں بنتا تھا۔ وجہ یہ معلوم ہوئی تھی کہ وہ اس جرم میں عملی طور پر شامل نہیں تھا۔ کسی کا کسی کو یہ کہنا کہ تم یہ جرم کرو اور خود اس میں شامل نہ ہو، جرم نہیں، البتہ وہ اس جرم میں ملزموں کی مدد عملی طور پر کرے تو وہ سزا کا حقدار ہوتا ہے۔

یہ دیکھیں کہ اس دور میں مقدموں کا فیصلہ کتنی جلدی ہوتا تھا۔ تینوں ملزم اقبالی ہو گئے تھے۔ گواہ موجود تھے۔ چار ماہ مقدمہ چلا۔ بوٹا اور اس کے ساتھی کو اغوا اور آبروریزی کے جرم میں سات سات سال سزائے قید ہوئی۔ اس عورت کو جو بنگالی لڑکی کو دھوکے میں بوٹا اور اس کے ساتھی تک لے گئی تھی، تین سال سزائے قید ملی تھی۔ میری ساری شکاری پارٹی اس کیس میں گواہ تھی، ہمارے لئے سیر سپاٹے کا بڑا اچھا انتظام ہو گیا تھا۔ ہم پیشی پر راولپنڈی جاتے تھے اور ہمیں کورٹ سے خرچہ ملتا تھا۔

بنگالی لڑکی کے خاوند کی چھٹی دو مہینے تھی لیکن اسے مقدمے تک سرکاری طور پر روک لیا گیا تھا۔ ان لوگوں کا گاؤں ہمارے گاؤں سے بارہ تیرہ میل دور تھا۔ مقدمے کے فیصلے کے دو اڑھائی مہینے بعد ہم نے سنا کہ منگنی والی لڑکی کا بھائی مقدمے کے خاتمے کے تیسرے روز قتل ہو گیا تھا اور قاتل کا سراغ نہیں ملا۔

تقریباً بیس سال گزر گئے۔ پاکستان معرض وجود میں آ چکا تھا۔ بنگالن کا خاوند پنشن پر گھر آ چکا تھا۔ ایک روز اس قتل کا راز مجھ تک پہنچ گیا۔ ہوا یوں تھا کہ بنگالن کا خاوند مقدمہ ختم ہونے کے دوسرے تیسرے دن بیوی کو ساتھ لے کر بنگال کو روانہ ہو گیا۔ تیسری رات منگنی والی لڑکی کے بھائی کی لاش کھیتوں سے ملی۔ اُس کے گلے میں رسّی ڈال کر مارا گیا تھا۔ اسی نے بوٹا سے کہا تھا کہ اس بنگالن کو غائب کر دو۔

راز یہ کھلا کہ بنگالن کا خاوند اسے ساتھ لے کر بنگال کے لئے روانہ ہوا تھا لیکن اس نے ریل گاڑی کا ٹکٹ جہلم کا لیا تھا۔ وہاں اس کا ایک دوست پنجاب پولیس میں تھا۔ اس نے بیوی کو اس کے گھر چھوڑا اور واپس اپنے گاؤں آیا لیکن گاؤں میں داخل نہ ہوا۔ اس نے اپنے ایک ہم عمر رشتہ دار سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ مقتول کو فلاں رات اور فلاں وقت باہر کھیتوں میں لے آئے۔

یہ پلان کامیاب رہا۔ بنگالن کا خاوند پہنچ گیا۔ مقتول اُس کے رشتہ دار کے ساتھ مطلوبہ جگہ موجود تھا۔ قاتل نے اس کے گلے میں رسّی ڈالی اور اُسے مار کر واپس چلا گیا۔ جہلم سے وہ ریل گاڑی میں بیٹھا اور بنگال چلا گیا۔

بنگالن کو غائب کرانے کا اصل مجرم تو یہی تھا لیکن قانون نے اُسے مجرم تسلیم نہ کیا۔ بنگالن کے خاوند کی غیرت نے اُسے سزائے موت دے دی۔

❁❁❁

نقطہ نظر

کورونا...... حقیقت یا سازش؟

یہ ڈرگ مافیا جو کچھ کر رہا ہے محض اپنے کاروبار کو وسعت دینے کے لئے کر رہا ہے۔ اس کے ایک سرے پر وائرس کا خوف اور دوسرے سرے پر ویکسین کی Sale ہے، بس اور کچھ نہیں۔

0321-7612717 شیخوپورہ

مارچ 2020ء کا مہینہ پاکستان اور دیگر ممالک میں ایک خوف ناک حوالے سے یاد رکھا جائے گا۔

ہر چیز تقریباً نارمل حالت میں تھی جب اچانک چائنہ کے شہر ووہان کے بارے میں ایک عجیب و غریب رپورٹ شائع کی گئی کہ وہاں ایک نیا وائرس بنام Corona پھوٹ پڑا ہے اور کئی لوگ مبتلائے مرض ہو گئے ہیں۔ لاک ڈاؤن ہو گیا ہے اور یہ خطرناک مرض ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اس کے ساتھ (ایسا لگتا ہے کہ یہ ایک طے شدہ منصوبہ تھا۔ اچانک ہی سارے ممالک میں لاک ڈاؤن، احتیاطی تدابیر، پروازیں بند، کاروبار بند اور مساجد، مدارس، گرجے ہر چیز بند کر دی گئی۔ لوگ گھروں میں مقید وغیرہ وغیرہ۔ کئی مولوی حضرات کے فتوے اور حکومتی اقدامات کے حق میں تقاریر وغیرہ اور خوفناک انداز میں خبریں مثلاً اتنے مریض بن گئے، اتنے فوت ہو گئے وغیرہ وغیرہ۔ یہ معاملہ مئی جون تک بھی جاری و ساری ہے۔ مگر حقیقت میں دیکھیں تو ٹی وی، اخبارات اور حکومتی شور شرابے یعنی میڈیا سے ہٹ کر یہ کہیں نظر نہیں آتا۔ کئی خاندانوں سے پتہ کرایا، کوئی نہیں مرا نہ مریض۔ سبزی منڈیوں میں بھی جہاں کوئی احتیاطی تدابیر نہیں اور گندگی اور رش بھی بہت ہے کوئی اس مرض سے نہ مرا۔ خدا کا شکر ہے!

کئی لوگ اس کی حقیقت جاننا چاہتے ہیں مگر حقیقت کو اس طرح چھپایا گیا ہے کہ وہاں تک شاید ہی کسی کی رسائی ہو کیونکہ یہ ایک ہائی پروفائل کیس ہے (محترم عمران خان صاحب وزیراعظم پاکستان از خود کہتے ہیں کہ میں اس طرح کے لاک ڈاؤن کے حق میں ہرگز نہ تھا مگر مجبور کیا گیا)۔ جس طرح غریب عوام کو بھوکا مارا گیا وہ سب کو معلوم ہے۔

جو حقائق اب تک منظرِ عام پر آئے ہیں ان کی روشنی میں آپ خود ہی اندازہ لگا لیں۔

جس دن سے یہ خبر ٹی وی سے نشر کی گئی اسی دن مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ جھوٹ گھڑا گیا ہے کیونکہ میڈیکل سے تعلق رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ جس طرح ایک شخص کی کچھ خصوصی علامات ہوتی ہیں مثلاً شکل، رنگ، قد، عادات وغیرہ اسی طرح امراض بھی اپنی اپنی خصوصی علامات (Sings & Symptoms) رکھتے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ بار بار بدلتے ہیں (یہ کوئی جادو کا کھیل تو ہے نہیں) مگر ہر روز نیا بیان، نئی شکلیں، نئی علامات، واہ بھئی واہ!

پاکستان میں جو اقدامات ہوئے اور نتائج ظاہر ہوئے ان کے بارے میں بھی پڑھ لیں تاکہ مزید وضاحت ہو سکے۔

(1) تمام O.P.D بند کر دیئے گئے۔ اب سوچیں وہ مریض کہاں جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ یا تو پرائیویٹ ہسپتال میں جائیں یا پھر کورونا وارڈ۔ اب دل کے مریض کو سٹنٹ تو نہ لگا اس کو Ventilator پر ڈال دیا۔ ظاہر ہے وہ کب تک جئے گا۔ مرے گا تو ''کورونا بن جائے گا'' بات ختم۔

(2) اس بارے میں جو SOP بنائے گئے وہ بھی بڑے حیران کن ہیں اور نہایت قابلِ احترام سپریم کورٹ آف پاکستان کے چیف جسٹس صاحب نے بھی کئی سوال اٹھائے مثلاً

(a) ہمارے حکومتی اعداد و شمار کے مطابق اس وقت صرف محدود تعداد میں مریض ہیں جن پر اربوں کھربوں روپے لگائے جا رہے ہیں۔ کہاں اور کیسے، کچھ معلوم نہیں۔

(b) دیگر امراض سے اموات (مثلاً کینسر، ہارٹ فیل اور ہائی بلڈ پریشر اور ٹی بی وغیرہ سے) کہیں زیادہ ہوتی ہیں مگر وہاں کوئی لاک ڈاؤن نہیں بلکہ ان سب مریضوں کو بھی کورونا کے کھاتے میں ڈالا جا رہا ہے۔

(c) کورونا سبزی منڈی نہیں جاتا؟ گوشت کی دُکان پر نہیں جاتا؟ ہفتہ اتوار سو کر گزارتا ہے۔ اگر جاتا ہے تو صرف مسجد میں اور وہاں سے صفیں اٹھا دی جاتی ہیں۔ واہ...... عقل مندو!

(d) گلیوں وسڑکوں پر کلورین کا سپرے کرایا جاتا ہے جو کہ دیکھنے میں نہایت بھلی بات لگتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک نہایت زہریلی اور مہلک گیس ہے جو کہ دماغ اور پھیپھڑوں کو ماؤف کر دیتی ہے اور جب یہ ہوا میں شامل ہو گی تو تمام لوگوں، چرند اور پرند کے لئے بھی خطرناک ہے۔ اگر یقین نہ آئے تو کسی سائنس کے ٹیچر سے پوچھ لیں۔ جب سپرے شدہ اشیاء پرندے اور دیگر جانور کھائیں گے تو وہ مریں گے یا نہیں؟

(e) کورونا کی احتیاطوں میں شامل ایک مزے کی بات یہ ہے کہ 20 سیکنڈ تک کئی بار ہاتھوں کو صابن سے دھوئیں یعنی صابن کی Sale بڑھے گی اور پانی کتنا استعمال ہو گا جب کہ پاکستان پہلے ہی پانی کی کمی کا شکار ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سازش ہی لگتی ہے۔

(f) اب ماسک ہر بندے کے لئے لازمی قرار دیا گیا ہے۔ ہمارے کرتا دھرتا افراد تو اے سی میں بیٹھتے ہیں، گرمی میں اس کا استعمال غریب عوام کیسے کریں گے۔ یہ انہوں نے نہ سوچا لیکن ماسک کی Sale تو کروا دی نا۔ اسی طرح Sianitizar اور Ventilater کی Sale کا معاملہ ہے۔

(g) اب ایک سنگین معاملہ (SOP) کا یہ ہے کہ اگر کوئی اس بے نام مرض سے مرتا ہے تو اس کی لاش بھی غائب۔ اب چیف جسٹس صاحب کے سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ لاشیں کہاں جاتی ہیں؟ کون سی ایجنسی لے جاتی ہے اور کہاں تجربات کرتی ہے۔ یہ

بات صیغہ راز میں ہے اور شاید ہمیشہ ہی رہے گی۔

(h) ماہرین معاشیات یہ سمجھتے ہیں کہ ایک ملک کا کاروبار اگر بند کرایا جائے تو کتنا Loss ہوتا ہے اور یہ بھی کہ ہر ملک Revenue سے ہی چلتا ہے جو کہ کاروبار سے حاصل ہوتا ہے تو ہمارے ملک کا کتنا نقصان ہوا خود ہی اندازہ کر لیں۔

یہ ہیں وہ بھیانک حقیقتیں جو کہ اندھا دھند تقلید کی وجہ سے پیدا ہوئیں جو مشکلات لوگوں کو ہوئیں جو Loss or Revenue سرکاری محکموں کو ہوا وہ الگ ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ میں محترم جناب وزیراعظم پاکستان کی رائے سے متفق ہوں کہ ایسے لاک ڈاؤن وغیرہ کی ضرورت نہیں تھی جس نے عوام کو بے حال اور ملک کو بدحال کر دیا اور کئی کمپنیوں اور صاحبِ اقتدار سیاستدانوں نے بے حساب کمائی کی۔

حدیث قدسی میں ہے کہ ہم نے کوئی ایسا مرض نہیں اتارا جس کی شفا نہ اتاری ہو۔ اب کورونا کا ڈرامہ کہتا ہے کہ (1) یہ مرض بغیر علامات ہے۔ (2) بغیر علاج ہے۔ (3) ویکسین کب بنے گی پتہ نہیں۔

تو یہ بات حدیث کے خلاف ہی ہوئی نا؟ مزید مزیدار بات یہ ہے کہ ہفتہ اور اتوار کو کورونا صاحب چھٹی پر ہوتے ہیں اور پتہ نہیں اسے یہ چھٹی کون دیتا ہے۔ جمعہ کو کورونا صاحب پورے زور پر ہوتے ہیں۔ دراصل سمجھداری کی بات ہے سیدھی سی کہ ہفتہ اور اتوار کی چھٹی پہلے ہی پورے یورپ میں ہوتی ہے اور وہ (1) ہاتھ نہ ملانا، (2) دستانے اور ماسکس اور اب مذکورہ چھٹیاں دراصل پاکستانیوں کو یورپی ڈھب پر لانے کی تراکیب ہیں۔ ہفتہ یہودیوں کا متبرک دن ہے اور اتوار ہمارے محترم عیسائی بھائیوں کا۔ تو اس طرح ہم بھی ان کے ساتھ ہی مل جائیں گے۔

اب ایک نئی بات سامنے آ رہی ہے کہ جو شخص بھی باہر جائے گا ''نام نہاد کورونا'' ٹسٹ کروائے گا جو کہ 6500 روپے کم از کم فیس میں ہوگا۔ تو کتنا مال اکٹھا ہو سکتا ہے۔ یہ فارمولا مزید وسعت اختیار کرے گا۔

اس سلسلے میں ایک رپورٹ ماہنامہ ''احرار'' لاہور شمارہ جولائی 2020ء میں شائع ہوئی ہے جس کے چند پوائنٹ درج کر رہا ہوں۔ (دروغ برگردن راوی)۔

(1) یہ ایک امریکی منصوبہ ہے۔ دنیا پر راج کرنے کا جس کے بانی کے ہنری کسنجر، جارج اور ویلز اور بل گیٹس جو کہ کئی فارماسیوٹیکل کمپنیز کے مالک ہیں، وہ دنیا میں ''ان دیکھے مرض کا خوف پیدا کر کے اور نام نہاد ویکسین اور ایسی ہی مشینری جو کہ ان کی مرضی کے رزلٹ دے، دنیا پر راج کرنے اور پھر دنیا کو بے روزگار کر کے ان کو Lock Down سے گھروں میں بند کر کے اور ان کے استعمال میں نہ آنے والی اشیاء بیچ کر ان کو مزید غریب سے غریب اور اپنے شکنجے میں پھنسانے کا منصوبہ ہے۔

وہ مزید لکھتا ہے کہ بل گیٹس نے ویکسین الائنس کے نام سے دنیا کی سب سے بڑی شراکت دار کمپنی "Gavi" کے نام سے قائم کی اور اس کے لئے 750 بلین ڈالر مہیا کئے۔ یہ ایک ڈرگ مافیا ہے جو کہ بظاہر ہر مرض کی ویکسین بنائے گا (کورونا کی فی الحال ویکسین بھی نہیں بنی مگر اس کو Pass کرانے کی زبردست جدوجہد ہو رہی ہے۔ کیسی حیرانی کی بات ہے کہ جو چیز موجود نہیں اس کے لئے کوششیں بعینہٖ جیسے کورونا موجود نہیں مگر اس کا خوف پیدا کر کے متعلقہ سامان کی خرید و فروخت اور ملکوں کے کاروبار کا بھٹہ بٹھایا جا رہا ہے) اور کوئی پوچھنے والا نہیں۔ سپریم کورٹ میں بھی معاملہ گیا مگر کسی نے Parsue نہیں کیا۔

یہ ڈرگ مافیا جو کچھ کر رہا ہے محض اپنے کاروبار کو وسعت دینے کے لئے کر رہا ہے۔ اس کے ایک سرے پر وائرس کا خوف اور دوسرے سرے پر ویکسین کی Sale ہے، بس اور کچھ نہیں۔ جس کی بنیاد جعلی مفروضے، جعلی حل اور زبردستی لاک ڈاؤن پر ہے۔

ایک عجیب حقیقت یہ کہ اگر کسی غریب کو "نام نہاد کورونا" ہوتا ہے تو اس کی لاش بھی SOP کے مطابق نہیں ملتی مگر جب یہ مرض ایک امیر کو ہوتا ہے تو وہ کہیں نہیں جاتا، کوئی دوا بھی نہیں لیتا۔ پھر ایک دو ہفتے کے بعد دانت نکال کر واپس آ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ "دیکھا میں نے کورونا کو شکست دے دی"۔ کیسا لطیفہ ہے، نا مزیدار۔

آج بھی اگر کسی کورونا سینٹر میں جائیں تو ڈاکٹر حضرات مریض کو کوئی دوائی نہیں دیتے صرف آرام اور تنہائی ہی دو فارمولے ہیں اور اس کی آڑ میں جو کرپشن ہے وہ کسی کی نظر میں نہیں ہے۔ اگر صرف آرام ہی کرنا ہے اور مرض ختم تو پھر ویکسین کی تکلیف کیوں کرنی ہے؟ یعنی خواہ مخواہ کا خرچہ۔

ووہان لیبارٹری کو امریکہ کے وبائی امراض کنٹرول کرنے والے ادارے کی جانب سے امداد دی جاتی ہے جس کے سربراہ ڈاکٹر فاؤچی ہیں جو کہ بل گیٹس کے [illegible] دوست [illegible] ہیں۔ اب ان کا گٹھ جوڑ سمجھ میں آ رہا ہو گا کہ یہ سب ایک طے شدہ منصوبے کو [illegible] ادا کر رہے ہیں اور ان کی کڑیاں اور الزام تراشیاں [illegible] ایک طے شدہ کھیل کا حصہ ہیں۔

یہ کتنی تکلیف دہ حقیقت ہے کہ جو چیز دنیا میں شاید ہی کہیں ہو اس کے پیچھے ساری دنیا کو پاگل کر دیا گیا ہے۔ کاروبار، مزدور اور کاروباری طبقہ برباد ہو رہا ہے مگر گندگی کے ڈھیر، مکھیوں کی فوجیں، مچھر، [illegible] مکوڑے بے شمار اسی طرح ہیں ان کے لئے کوئی مؤثر

قانون نہیں بناتا۔ ملک پانی کی قلت کے خطرے سے دوچار ہے مگر اراکانِ اسمبلی اور اشرافیہ کو اپنی جعلی لڑائیوں اور بے کار الزام تراشیوں سے ہی فرصت نہیں۔

ان کی تنخواہیں حال میں جتنی بار بھی بڑھیں ان کی تسلی نہیں ہوئی۔ کرپشن سے پیٹ نہیں بھرتے مگر ان کو اپنے فرائض اور ملک کی وفاداری یاد نہیں آتی۔ ان کو خدا اور آخرت کے عذاب کا بھی کوئی خوف نہیں۔ کوئی ذمہ داری نہیں لیتا، اگر سب پاک و ایماندار ہیں تو پھر ملک پاکستان اس قدر زبوں حال کیوں ہے؟

چند روز قبل ٹی وی پر ایک مذاکرہ آیا تھا غالباً ARY پر۔ اینکر پرسن نے صاف کہا کہ کورونا سے مرنے والوں میں اکثریت ہارٹ اٹیک، کینسر اور دیگر امراض میں مبتلا تھے۔ ڈاکٹر ٹرمپ صاحب نے بھی چند دن قبل فرمایا۔ ''کئی ممالک میں کورونا کے مریضوں کی تعداد بڑھ رہی ہے تو انہیں ٹسٹ ہی نہیں کروانے چاہئیں''۔ کتنی سچائی انہوں نے بیان کر دی ہے۔ ایک غیر مسلم ہو کر اور ادھر ہمارے مسلمان بھائی ہیں کہ بس خدا کی آیات کو بھلا کر ایسے منصوبے کا حصہ بن رہے ہیں۔ صاف لگتا ہے کہ وہ سچ بولنے سے گریزاں ہیں۔

ایک بات اور بھی سوچنے کے قابل ہے کہ یہ مرض اچانک کہاں سے آ گیا اور پوری دنیا میں پھیل گیا۔ ایسے جیسے بجلی۔ اگر بغور دیکھیں تو میڈیا (ٹی وی اور اخبارات) ہی اس کو پھیلانے کا بڑا سبب ہیں پتہ نہیں انہیں کیا مفادات ملے ہوں گے۔ ورنہ اگر محلوں، گلیوں، بازاروں میں جائیں خصوصاً دیہات میں تو ہر طرف چین ہی چین ہے۔ صرف میڈیا نے آسمان سر پر اٹھایا ہوا ہے اور اب موبائل کمپنیوں والے بھی اس بے جا خوف و ہراس کو ہر وقت پھیلانے میں شب و روز مصروف ہیں اور ہمارے صاحب اقتدار ان کو پوچھتے تک نہیں۔ حالانکہ ملکی قانون کے تحت ایسی خبریں پھیلانا بھی ایک سنگین جرم ہے کیونکہ جتنی تیزی سے وہ امراض کا پھیلاؤ بتاتے ہیں اس طرح تو گلیوں اور سڑکوں پر لاشیں ہی لاشیں ہونی چاہئیں اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ اب مرنے والوں کی تعداد بہت کم بتائی جاتی ہے اور تو اور مردے دفن کرنے والے بھی تقریباً بے روزگار ہو گئے ہیں۔ مگر میڈیا ہے کہ ایک ہی مزدوری پر لگا ہوا ہے بغیر سوچے۔ وہ ایک مثال ہے کہ کسی شخص پر ایک جگہ بجلی کی Heavy Tnson تار گر پڑی تو وہ خوف سے مرنے لگ گیا کہ اب مرا اور تب مرا۔ پھر اسے یاد آیا کہ بجلی تو ایک بجے سے بند ہے اور دو گھنٹے کے بعد آئے گی۔ تب وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کپڑے جھاڑ کر اپنی راہ چلا گیا۔

اگر آپ سب حالات کو میڈیا کی باتوں سے ہٹ کر دیکھیں تو ہر جگہ عجیب حقیقتیں نظر آئیں گی۔ آنکھ والوں کے لئے عبرت ہے۔

ایک اٹل حقیقت یہ بھی ہے کہ یہ فرضی وائرس کورونا ایجاد کرنے والوں کو خود بھی پتہ نہیں کہ اس جھوٹ کو سچ کیسے بنانا ہے۔ لہٰذا وہ جھوٹ پر جھوٹ بولتے جا رہے ہیں۔ کبھی کوئی بیان بازی، کبھی کسی ڈرامہ بازی کا سہارا لیتے ہیں مگر چھپ نہیں پائے۔ اگر محترم چیف جسٹس اور وزیراعظم صاحب منصفانہ انکوائری کرائیں تو بات صاف ہو جائے گی۔ اب ایک مشورہ ہے۔

اگر اب بھی یہ مرض ایجاد کرنے والوں کو سمجھ نہیں آئی تو کسی پاکستانی ڈاکٹر خصوصاً ہومیوپیتھک والوں سے رجوع فرمائیں۔ وہ چند دن میں آپ کو Vaccine بنا کر دے دے گا۔ اگر نیت نیک ہو تو کوئی کام ناممکن نہیں۔ ارشادِ ربانی ہے۔ ترجمہ: انسان کے لئے وہی کچھ ہے جس کے لئے وہ کوشش کرتا ہے۔

❁❁❁

عمر رفتہ کو آواز دینا

لکڑی سے بنے سامان والا رہٹ جب چلتا تو اس کی ''روں روں'' کی آواز کانوں کو بہت بھلی لگتی جیسے کوئی اللہ کی تسبیح اور حمد کر رہا ہو۔

راولپنڈی

• نیاوی غرض و غایت کے حوالے سے بہتر سہولیات کے حصول کے لئے گاؤں، دیہاتوں سے عموماً شہروں کی جانب ہجرت ہوتی ہے۔
انسان سہل پسند ہے لہٰذا ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ ہجرت کے لئے شہروں سے گاؤں یا دیہی علاقوں کا رخ کیا جائے۔ ایک بار جو شہر آ کر بس گیا اور وہاں کی زندگی کا عادی ہو گیا تو پھر اس نے پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ تاہم آج کل کورونا وائرس نے کچھ ایسا خوف جمایا ہے کہ عارضی ہی ہجرت کے لئے شہر والوں کا رخ گاؤں دیہاتوں کی طرف ہی ہے۔ ان کے خیال میں شہروں کی نسبت دیہی علاقے زیادہ محفوظ ہیں۔
کچھ اسی خیال کے زیر اثر راقم نے بھی گزشتہ ماہ جون میں گاؤں کی طرف رخت سفر باندھا اور نہ نہ کرتے پورا مہینہ گاؤں میں گزارا۔ جہاں شہروں کی نسبت کم ہی گلہ تھا اور شہری زندگی والی تیز رفتاری نہیں دیکھی گئی۔ گو کہ آج کل کے گاؤں دیہات بھی پہلے والے نہیں رہے۔ گلیوں میں لوگ پیدل کم چلتے ہیں بیشتر موٹر سائیکل سوار نظر آتے ہیں تاہم گاؤں میں بیشتر اتنا وقت گزارنا لگ بھگ پچاس ساٹھ سال بعد ہوا۔ یعنی نصف صدی کے بعد ایسا پہلی مرتبہ ہوا۔ اس سے قبل جب بھی جانا ہوا تو ایک آدھ دن ہی ٹھہرنا ہوا۔ اس دفعہ یہ خیال بھی ہوا کہ ان جگہوں اور مقامات کی زیارت کی جائے جہاں گزشتہ چھ سال سے ماہنامہ ''حکایت'' میں مسلسل لکھی جانے والی ناقابل فراموش کہانیوں اور واقعات نے جنم لیا اور پھر ان جیتے جاگتے کرداروں سے ملاقات کا شوق بھی پورا ہو گا جو ان واقعاتی کہانیوں کے روح رواں تھے۔ بس یہی شوق ایک بار پھر کشاں کشاں گاؤں لے گیا۔
وہاں میری کہانیوں کے انسانی کردار تو خال خال ہی رہ گئے ہیں اور جو رہ گئے ہیں انہیں پہچاننا بھی محال ہے کہ زندگی جینے کی سزا دیتی ہے۔ میرے ذہن میں تو ایسے کردار اب بھی بچے، نوجوان، جوان اور تر و تازہ چہرے ہیں مگر اب پچاس ساٹھ سال کے وقفے کے بعد ان کی زیارت کرنا کچھ خوشگوار تجربہ نہ رہا۔
ادھر ان کی نظر میں میرا بھی یہی حال ہو گا۔ جیسے ایک کردار کو میں 64 سال بعد ملا ہوں۔ جو میرا چھٹی جماعت کا کلاس فیلو تھا۔ مگر حیرت ہے کہ اس نے مجھے پہچان لیا اور میرا نام لیا۔ حالانکہ اگر میرے ساتھ میرا بھتیجا ارشد حبیب ملک جو وہاں کا ہی باسی ہے، نہ بتاتا کہ یہ آگے آگے گدھی پر کین رکھے جو شخص پانی بھرنے جا رہا ہے یہ آپ کا کلاس فیلو محبوب عالم ہے، تو میں اسے پہچان نہ پاتا۔ اس طرح میرے بچپن کا ایک کردار محمد اصغر عرف کاکو ہوا کرتا تھا، اب وہ جب سامنے سے ہو کر گزر گیا اور میں نے اس پر ایک اچٹتی سی نگاہ بھی ڈالی تھی تو مجھے بھتیجے نے بتایا کہ یہ کاکو تھا۔ اب چونکہ بھرے گاؤں میں کاکو ایک ہی تھا جو میری یادداشت میں محفوظ تھا تو میرے سامنے کاکو کا وہ چہرہ آیا جو 65-64 سال پہلے کا تھا جو جوڑے والی کبڈی کا مانا جانا کھلاڑی تھا۔ اتنا تیز کہ کسی کے ہاتھ نہ آتا تھا اس کے جسم میں گویا بجلی بھری تھی۔ اب اس کاکو کی جو جھلک میں نے دیکھی تو مجھے اپنی آنکھوں پہ یقین نہ آیا۔ یہ کاکو جو جھکی ہوئی خمیدہ کمر لئے، موٹے شیشے کا چشمہ لگائے لاٹھی ٹیکتے بمشکل قدم اٹھا رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ راستہ کے کنارے ہو لیا کہ مبادا کسی کی ٹکر نہ لگے۔
''نہیں یار! یہ کاکو کوئی اور ہے''۔ میں نے کہا۔
''وہ نہیں جو میرے بچپن کا کاکو تھا''۔ لیکن وہ سچ مچ کاکو تھا۔
ایک اور کردار چھینی ہتھوڑے سے بن کے پہلو میں زمین میں گڑے بڑے سے پتھر پہ پہلوانوں کی کشتی کی تصویریں بناتا تھا جو بہت ہی دل آویز ہوا

رہیں۔ کافی عرصہ تک وہ تصویریں اس پتھر پر کندہ رہیں اور ہم انہیں نہایت لگن سے دیکھا کرتے تھے۔ پھر وقت کی آندھیوں نے یہ تصویریں مٹا ڈالیں لیکن وہ پتھر اب بھی اسی طرح زمین میں گڑا ہوا ہے۔ میں نے اس بار بھتیجے کو دکھایا۔ مگر اس پر تصویر نہ تھی۔ یہ کردار اس دفعہ میرے سامنے سے ہو کر گزر گیا۔ میں اسے بمشکل پہچان پایا وہ بھی تب جب وہ مجھ سے آگے نکل چکا تھا۔ پیچھے سے میں نے اسے بہت آوازیں دیں مگر وہ جلدی سے جا کر اپنے گھر میں گھس گیا۔ جیسے کہہ گیا ہو کہ ”عمر رفتہ کبھی لوٹتی نہیں۔ جا پتھروں سے میری جوانی اٹھا کے لا“۔ اس کا نام محمد ایوب تھا وہ 90 کے پیٹے میں ہوگا۔ واہ رے زندگی.....!

بعد میں پتہ چلا کہ وہ ثقل سماعت کا بھی شکار ہے۔ اس لئے میری آواز نہ سن پایا ہوگا۔ کچھ دوست جن سے ملنے کا شوق تھا، اپنے اپنے گھروں میں قرنطینہ میں پڑے تھے اور ملنے ملانے سے گریزاں تھے۔ جان ہر ایک کو پیاری ہوتی ہے۔

البتہ مساجد میں نوجوان طبقہ زیادہ دیکھنے میں آیا جو کہ خوش آئند بات تھی۔ جوان نمازی زیادہ تھے۔ پہلی صف میں بالا (محمد اقبال) موجود تھا۔ مجھ سے خاصا چھوٹا ہے۔ سفید داڑھی، پکا نمازی، کچھ اعصابی کمزوری کا شکار پایا۔ بالا کی کہانی بڑی دردناک تھی۔ جوانی میں اس کی بیوی روٹھ کر میکے چلی گئی، ساتھ دو چھوٹے چھوٹے بچے بھی لے گئی۔ ایک طویل مدت ناچاقی رہی اور سالوں بعد بالا اس کے گاؤں گیا اور اسے منا لایا۔ برسوں کا ٹوٹا ہوا گھر پھر سے بس جانے پر گاؤں والوں کو دلی مسرت ہوئی۔ مجھے بھی پتہ چلا تو میں نے راولپنڈی سے اسے فون کر کے مبارک باد دی۔ اللہ تعالیٰ کا کرنا تھا کہ اس کے آنے کے ایک ہفتہ بعد وہ اس سے پھر بچھڑ گئی۔ مجھے جب پتہ چلا تو پھر فون کیا اور تعزیت

> **خبردار!** کبھی اپنی اولاد اور اموال کے لئے بددعا نہ کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی ایسے وقت میں اللہ سے دعا کر بیٹھو جس میں دعا قبول ہو جاتی ہے۔
> (سننِ ابی داؤد:1532)

کی کہ ملے بھی اور پھر بچھڑنے کے لئے۔ کہنے لگا۔ ”بھائی جی مٹی دا تک ایتھے ای لکھیا سی، اس بے چاری دا“۔ بالا صبر کر گیا اور مسجد پکڑ لی۔ وہ بوڑھا ہو چکا ہے۔ ہاتھوں اور گردن میں ہلکا سا رعشہ ہے۔ بالے کے وہ دونوں بچے اب ماشاء اللہ، جوان ہیں وہ بھی مسجد آتے ہیں۔ اب تو ان کے بھی بچے ہیں۔ بالا دادا بنا پھرتا ہے۔

بالے کے دادا قادر بخش کے زمانے میں ہمارا بچپن تھا۔ قادر بخش نے ایک خونخوار لڑاکا کتا رکھا ہوا تھا۔ جو ہر بھیڑی جیت کر آتا تھا۔ وہ جب کتے کو باہر لے جانے کے لئے گلی میں نکلتا تھا تو لوگ خوف کے مارے راستہ سے ہٹ جاتے۔ ہم خود بھی کتے سے بہت ڈرتے تھے۔ جس دن کتا جیت کر آتا تھا تو قادر بخش کے گھر رات گئے تک ڈھول بجتا اور گولے چھوڑے جاتے۔

جھاہ سے ملاقات

مغرب کی نماز کے لئے مسجد جاتے ہوئے بالے کے گھر کے بالکل قریب ایک دوسرے گھر کے دروازے کے سامنے سرِ راہ جھاہ سے ملاقات ہوگئی۔ یہ ملاقات بھی 65 سال بعد ہوئی۔ جھاہ سورج غروب ہوتے ہی اپنی کمین گاہ سے نکلا تھا۔ اس کی کمین گاہ وہ گھر تھا جہاں سے نکلا تھا۔ گو کہ انہوں نے بہت مضبوطی سے کواڑ بند کئے ہوئے تھے اور چھوٹے بڑے سوراخوں

کو پتھر کے ٹکڑے ڈال کر بند کیا گیا تھا لیکن جھاہ کی یہ خاصیت ہے کہ یہ تنگ سے تنگ سوراخ سے بھی پتلا اور لمبا ہو کر نکل لیتا ہے (حیران کن حد تک)۔ مجھے دیکھتے ہی ٹھٹکا اور رک گیا۔ جبکہ میرا خیال تھا کہ وہ چوہے کی طرح بھاگ جائے گا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے پاؤں لگایا جس کا مطلب یہ تھا کہ کیسے گزر رہی ہے؟ اس نے فوراً گیند بن کر بتلا دیا کہ ''ایسے۔'' اب کرلو جو میرا کرنا ہے۔ اس کا مطلب کہ وہ فطری زندگی گزار رہا ہے۔

جھاہ بہت شرمیلا سا جانور ہے۔ آدمی کو دیکھ کر بھاگتا نہیں بلکہ وہیں پر اپنا منہ گود میں چھپا کر گیند بن جاتا ہے۔ جب تک خطرہ ٹل نہیں جاتا وہ اندر سے منہ نہیں نکالتا۔ کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ وہی فطرت وہی عادت اس کی یہ ادا اچھی لگتی ہے۔ ہم اسے اٹھا کر جھولی میں ڈال لیتے تھے اور اس کے کانٹوں سے جھولی میں چھلنی کی طرح چھید ہو جاتے تھے۔ دل چاہا کہ ایک بار پھر اس کو جھولی میں ڈال لوں مگر رستے سے لوگ گزر رہے تھے۔ سوچا وہ کیا کہیں گے کہ بقول محترم بھائی صدیق صاحب جنڈ والے کہ اس پوٹھوہاری بابے کو کیا ہو گیا ہے؟ یہ بھی کوئی اٹھانے والی چیز ہے۔ کانٹوں سے بھرا بدن، کالا کلوٹا، بغیر دم کے۔

نماز پڑھ کر آیا تو وہ وہیں پھر رہا تھا۔ اب کی بار میں نے اسے نہ چھیڑا وہ اپنی دھن میں مگن تھا۔ اندر سے دل تو چاہ رہا تھا کہ اسے لے چلوں اور پوٹھوہار کی سیر کراؤں۔ راولپنڈی آ کر پتہ چلا کہ سامنے I-10-4 والے پارک میں مغرب کے وقت دیکھے جاتے ہیں وہ جھاہ۔ حیرت ہوئی کہ نصف صدی گزر گئی اس بچپن کے دوست سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ جون 2016ء میں لکھی جانے والی میری کہانی ''گوہ کا گھمنڈ'' میں جھاہ سے دوستی کا ذکر ہے۔

اب ان جگہوں اور مقامات کا ذکر جن سے ناقابل فراموش واقعات اور کہانیاں وابستہ ہیں اور وجود میں آئیں۔ ایک حالیہ کہانی ''پانی، پرنالہ اور پروین'' کے عنوان سے چھپی ہے۔ جو ''حکایت'' کے قارئین نے پسند کی ہے۔ جس میں بڑے کنویں کا ذکر ہے۔ جسے پھر سے دیکھنے کو بے قراری تھی۔ گھروں میں پانی آ جانے کے باعث اب یہ کنواں متروک ہو گیا ہے۔ میں اور میرا بھتیجا نماز فجر سے فارغ ہو کر علی الصبح واک کے لئے دور دراز کے علاقے میں نکل جاتے تھے۔ ایک صبح اس کنویں کو ہو لئے۔ ایک لمبا چکر کاٹ کر وہاں پہنچے راستہ بہت خراب تھا۔ راستے، راہ چلنے والوں سے آباد رہتے ہیں۔ جب راہ گیر اٹھ جاتے ہیں تو راستے ویران ہو جاتے ہیں۔ ان میں خودرو جھاڑیاں اور کانٹے دار درخت اُگ آتے ہیں۔ یہ وقت تمام کنویں میں جھانکنے کا موقع ملا۔ وہ کنواں جو گرمی کے اس موسم میں تہہ تک خشک ہو جاتا، صرف سحری کے وقت جانے پر کچھ پانی حاصل ہوتا۔ دن چڑھے تو خالی کیچڑ ہی ملتا۔ اب اوپر تک بھرا تھا۔ اسے یوں لبالب بھرا دیکھ کر بدن میں جھرجھری سی آ گئی۔ ایسا منظر کبھی دیکھا نہ تھا۔

مجھے بتایا گیا کہ گاؤں کے نوجوان تیراک لڑکے اس میں چھلانگیں لگاتے ہیں۔ بڑے دل گردے والے لڑکے ہوں گے۔ تیراکی تو میں نے بھی سیکھی ہوئی ہے اور بن کے پانی میں کی بھی ہے لیکن پانی سے لبالب بھرے اتنے گہرے کنویں میں غوطے اور چھلانگیں لگانے والے لڑکوں کو داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کنویں کے قریب سے ملک کرم داد کا وہ کنواں تھا جس میں پروین گر گئی تھی۔ لپک کر وہاں پہنچا۔ دروازے کو معمولی کنڈی لگی تھی۔ کھٹکھٹایا مگر کوئی نہ آیا۔ دھکا دینے پر کھل گیا۔ اندر جا گھسے۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ کنواں دیکھا لکڑی کی مالا اور دیگر سامان کی جگہ سب جگہ لوہا لگا تھا۔ فوراً

کنوئیں میں جھانکا دور گہرائی میں پانی نظر آیا۔ مائل (...) کو نظروں سے ٹٹولا کہ کہیں اس سے پروین نہ چپکی ہو۔ مگر پروین اس دنیا میں نہیں رہی۔ کہانی چھوڑ گئی ہے۔

لوہے کے سامان والا رہٹ یا کنواں دیکھ کر مزہ نہیں آتا۔ جو لکڑی کے سامان والے کنوئیں کو دیکھنے میں آتا۔ لکڑی درخت سے آتی ہے اور درخت فطرت کے بہت قریب ہوتے ہیں۔ لکڑی سے بنے سامان والا رہٹ جب چلتا تو اس کی رواں رواں کی آواز کانوں کو بہت بھلی لگتی جیسے کوئی اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور حمد کر رہا ہو۔ جبکہ موجودہ لوہے والے رہٹ کی ٹک ٹک کانوں پہ بہت بھاری ہوتی ہے۔ اب یہ کنواں ملک کرم داد کی تیسری نسل کی تحویل میں ہے۔ اس سے ملحق کھیت خالی پڑے ہیں جہاں سیبوں کا باغ ہوتا تھا۔ آلوچے، خوبانی اور امرود کے بھی درخت تھے۔ بہرحال ثبات صرف تغیر کو ہے۔

دیگر پھلدار باغوں والے کنوؤں پر بھی گئے۔ جہاں درختوں پر موسمی پھلوں کی بہتات تھی۔ کسی کنوئیں پر بیلوں والی جوگ دکھائی نہ دی اس کی جگہ بجلی سے چلنے اور پانی کھینچنے والی موٹریں اور پمپ لگے تھے۔ جیسے گہرے کنوئیں صرف نمائش کے لئے رکھے ہوں۔ موضع ڈلوال کے نواح میں اس کنوئیں کے قریب سے گزرے جس کی کہانی ''حکایت'' کے جون 2015ء کے شمارے میں ''اتنی سی بات'' کے عنوان سے چھپی تھی۔ کنوئیں میں جھانکنے کا موقع نہ ملا۔ جس میں اک ذرا سی بات کے پیچھے عل خان نے چھلانگ لگا دی تھی۔ ساتھ ہی برگد کا دیوہیکل درخت اسی سج دھج سے کھڑا دیکھا۔ ڈلوال گاؤں کے پاس سے گزرے، جہاں مشروں کی ماڑی کو مشہور زمانہ نقب لگائی گئی تھی۔ زیورات اور قیمتی پارچہ جات نکال کر خالی ٹرنک جاگو والی بن پر پھینک دیا گیا تھا۔ جاگو والی بن کی اس منڈیر پر جا کر کھڑے ہوئے جہاں جدید دور کے درخت لگے ہوئے تھے۔ پرانا کوئی کھرا کھوج نہیں تھا۔ ساتھ ہی جدید دور کی ایک وسیع و عریض رقبہ پر گورنمنٹ گرلز ہائی سکول کی خوشنما عمارت تھی۔ سکول کالج تو مکمل بند ہیں۔ مشروں کی ماڑی والی واردات کے وقت یہاں گھنا جنگل تھا۔

قارئین ''حکایت'' کو یہ دلچسپ کہانی مئی 2014ء کے شمارے میں ''محبوب کی خاطر'' کے عنوان کے تحت پڑھنے کو ملی تھی۔

''بن کی سزا'' ستمبر 2014ء کے شمارے میں پڑھی جا سکتی ہے۔ اس بن پر تقریباً روزانہ جانا ہوتا تھا۔ آج اس میں کشتیاں چلتی ہیں۔ ''بابا تمبر والا کنواں'' جولائی 2018ء میں شائع ہوئی۔ اس کنوئیں میں جھانکا جہاں شاہناز کو قتل کر کے پھینکا گیا تھا۔ ''غریب کی بہو'' اکتوبر 2014ء کے شمارے میں کٹھہ (نشیبی جگہ) کا ذکر ہے۔ جہاں رحمو کو قتل کر کے پھینکا گیا۔ گو وہاں تغیرات ہو گئی ہیں لیکن وہ تھوڑی سی جگہ عوامی راستہ میں آ گئی ہے جس جگہ رحم نور کی لاش پڑی ہم نے بھی سکول جاتے ہوئے دیکھی تھی۔

''بن، بجو اور بیلچہ'' کے زیر عنوان دلچسپ کہانی میں خوشی والی بن کا تذکرہ ہے۔ یہ بن آج بھی موجود

❀ اپنے جسم کے وقار کے لئے اپنا سر اونچا رکھو اور اپنی ذات کے وقار کے لئے اپنی نظریں اور لہجہ ہمیشہ نیچا رکھو۔

❀ انسان کا کردار ایک ایسی مالا ہے جس کی ایک گرہ کھل جانے سے تمام موتی بکھر جاتے ہیں۔

مرسلہ:---------------- نسیم سکینہ صدف

ب اور سڑک کنارے واقع ہے۔ جہاں سے مٹی کھود کر گاؤں والے اپنے گھروں کی چھتوں کی لپائی کرتے تھے۔ آج اس بن میں ملحقہ سیمنٹ فیکٹری کا فضلہ پھینکا جا رہا ہے۔ کیونکہ اس کی مٹی کی ضرورت نہیں رہی اور فیکٹری والوں کو اس کی ضرورت تھی، وہ اسے کام میں لے آئے۔

اپریل 2016ء کے شمارے میں ''میاں جی کی ٹانگی'' کا بڑا غلغلہ تھا۔ یہ کہانی کسی الف لیلوی داستان کی طرح دلچسپ تھی۔ میاں جی تو زمانہ ہوا اس دنیا سے اٹھ گئے اب ان کے پوتے بھی جوان ہیں۔ یہ سارا کنبہ حفاظ کرام کا ہے۔ میاں جی کے جانے سے ٹانگی بھی ان کے گھر سے اٹھ گئی ہے۔ میاں جی کے گھر کا نقشہ تبدیل ہو گیا ہے۔

ستمبر 2016ء کے شمارے میں کہانی ''وہ دشمن کے مورچوں میں شہید ہوا'' چھپی۔ اس میں میرے دوست اور کلاس فیلو سپاہی محمد اسلم شہید کی داستانِ شجاعت رقم کی گئی ہے۔ محمد اسلم نے ستمبر 1965ء کی جنگ میں مادرِ وطن کے دفاع میں اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر کے شہادت کا اعلیٰ رتبہ حاصل کیا۔ محمد اسلم شہید کے گھر کے سامنے سے گزر ہوا جیسے وہ اب بھی کہہ رہا ہو۔ ''اندر آ جاؤ نذیر! میں تمہیں کریلوں کی بیل پر کئے خوبصورت پھول کھلے دکھاتا ہوں''۔ یہ بیل محمد اسلم نے اپنے گھر کے کمرے کی دہلیز کے بالکل سامنے لگائی ہوئی تھی۔

''مقبرے والی رات'' جنوری 2018ء یہ میری اپنی پسندیدہ کہانی ہے۔ یہ مقبرہ موضع مگھال (Maghal) سے ملحقہ پہاڑی پر واقع ہے۔ گاؤں آتے جاتے اس پر نظر پڑ جاتی ہے۔ اندر جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ فیکا نہیں رہا۔ نہ جانے ہماری اس بہن کا کیا حال ہے۔ بہت وقت گزر چکا ہے۔ ''سرنگ، سانپ اور سپیرن'' جنوری 2015ء کی بہترین کہانی تھی۔ اس کا تعلق گندھالہ کے نیلگوں پہاڑیوں والے جنگل سے تھا۔ گندھالہ جانا نہیں ہوا۔ گاڑی جانے کا راستہ مسدود ہو چکا ہے۔ ''سونے والی بن کا خونی معرکہ'' جولائی 2014ء۔ کتے لڑاتے لڑاتے بندے آپس میں لڑ پڑے اور چار قتل ہو گئے۔ دو کتے بھی مارے گئے۔

''جب بیٹی ماں کی بہو بنی'' اگست 2014ء میں لکھی گئی۔ بھرپور تاثر والی کہانی رہی۔ اس کے تمام کردار اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ''بھلا موئے تے وچھڑے.....'' اگست 2016ء کی ناقابلِ فراموش کہانی تھی۔ اسی طرح ''آزادی کی جیت'' اگست 2015ء۔ ''جنگ اور جذبہ'' برائے سالگرہ نمبر ستمبر 2015ء۔ ''بارش، برگد اور عورت'' مئی 2019ء سراہی گئی۔

مل ملا کر اب تک 42 کہانیاں لکھی گئیں۔ جو قارئین ''حکایت'' نے پسند کیں، یہ میرا اثاثہ ہے۔

مدیر ''حکایت'' جناب عارف محمود صاحب کا ممنون ہوں جنہوں نے انہیں قابلِ قدر سمجھا اور میری رہنمائی فرمائی۔

محترم اعجاز حسین ستھار صاحب، جناب محمد صدیق جنڈ والے، میری کہانیوں پر اظہار خیال فرماتے ہیں اور اپنی قیمتی آرا اور مشوروں سے نوازتے رہتے ہیں۔ ان کا تہہ دل سے شکرگزار ہوں۔

قارئین کے فون بہت آتے ہیں۔ ان کا بھی احسان مند ہوں۔ کہانی خود بتا دیتی ہے کہ اس میں آدھا سچ ہے یا پورا۔ کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ آدھا سچ نہ ہو۔ باقی سچی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اللہ تعالیٰ سچ بولنے، سچ لکھنے اور سچ کا ساتھ دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

❀❀❀

قسط: 6

سانحہ مشرقی پاکستان

ڈھاکہ ہیڈ کوارٹر سکتے کے عالم میں تھا کہ اب کیا کیا جائے؟ امداد کس طرح بھیجی جائے؟ ڈھاکہ ایئر پورٹ پر C-130 جہاز تیار رکھا گیا۔

balochsk@yahoo.com
ملتان

چٹاگانگ ائیرپورٹ کا قبضہ

فوجی نقطہ نظر سے میں جب بھی مشرقی پاکستان میں بنگالی بغاوت اور ان کی کارروائیوں کا تجزیہ کرتا ہوں تو ایک بات جو واضح طور پر متاثر کرتی ہے وہ ہے ان لوگوں کی تفصیلی منصوبہ بندی۔ اس ساری منصوبہ بندی کا خالق کون تھا۔ یہ وقت ضرورت عملدرآمد کس نے کرایا اور پورے مشرقی پاکستان میں فوری رابطے کا نظام کس طرح قائم کیا گیا، بہت غور طلب عوامل ہیں جو کسی بھی فوجی منصوبہ ساز کے لئے حیران کن ہیں۔ یہ منصوبہ سازی اتنی تفصیلاً کی گئی کہ کوئی بھی اہم مقام نہ چھوڑا گیا اور بغاوت کی کارروائی ایک ہی وقت میں پورے مشرقی پاکستان میں شروع ہوئی جبکہ مغربی پاکستانی ٹروپس انجانے میں پکڑے گئے اور بہت نقصان اٹھایا۔ انہیں اس بغاوت کا شک تو تھا لیکن یہ خیال نہ تھا کہ پوری بنگالی یونٹس، ایسٹ پاکستان رائفلز۔ ایسٹ پاکستان پولیس یکدم پاکستانیت کا لبادہ اتار پھینکیں گے اور آسانی سے بنگلہ دیشی بن جائیں گے۔

کچھ لوگوں کے دل میں یہ بھی غلط فہمی تھی کہ ہماری ایک دوسرے کے ساتھ برسوں کی رفاقت ہے۔ فیملی تعلقات ہیں۔ کامریڈشپ کی صورت میں دوستیاں ہیں۔ جدوجہد آزادی میں اکٹھے تھے۔ 1965ء کی جنگ میں مل کر بھارت کے خلاف لڑے ہیں اور یہ مضبوط رشتے یوں یکدم ٹوٹ جائیں گے۔ یہ بنگالی ٹروپس ہمارے خون کے پیاسے ہو جائیں گے، اس کی امید نہ تھی۔ بنگالی ٹروپس نے باہمی اعتماد کا لبادہ آخر تک اوڑھے رکھا جس وجہ سے مغربی پاکستانی ٹروپس مشرقی پاکستانیوں کے خلاف آخری لمحے تک تذبذب کا شکار رہے اور کسی قسم کی فوجی کارروائی کی منصوبہ بندی نہ کی۔ جب اچانک ہر طرف سے گولیاں برسنی شروع ہوئیں۔ لاشیں اٹھانی پڑیں تو ہوش آیا کہ بنگالی ٹروپس کے خلاف فوجی کارروائی کی جائے لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ بھارتی کمانڈوز اور ''را'' اپنے پنجے گاڑ چکے تھے۔

چٹاگانگ کے حوالے سے بھی تفصیلی منصوبہ بندی کی گئی تھی۔ مکتی باہنی ایسٹ بنگال رجمنٹ، ایسٹ پاکستان رائفلز اور ایسٹ پاکستان پولیس کے مابین گہرا رابطہ تھا۔ ہر شخص کو پتہ تھا کہ بغاوت کے وقت اس نے کہاں ہونا ہے اور کیا کارروائی سرانجام دینی ہے۔ بریگیڈیئر موجمدار کی گرفتاری کے بعد سارا کنٹرول میجر ضیاء الرحمٰن نے سنبھال لیا۔ جونہی اس نے بغاوت کی کال دی تمام لوگ پہلے سے مقرر کردہ بغاوتی کارروائی میں مصروف ہو گئے۔ شہر کے تمام اہم مقامات یعنی ایرپورٹ، ریڈیو سٹیشن، ٹیلیگراف، ٹیلیفون اور واپڈا وغیرہ کے دفاتر پر قبضہ کر لیا گیا۔ میجر ضیاء الرحمٰن کی راہنمائی میں شہر کا کنٹرول مکتی باہنی نے سنبھال لیا۔ چٹاگانگ کو باہر سے ملانے والی سڑکوں کی ناکہ بندی کر لی گئی اور بنگالی ٹروپس کو مغربی پاکستانی فوج سے لڑنے اور سڑکوں پر پاکستانی فوج کے خلاف گھاتیں لگانے کے فرائض سونپ دیئے گئے۔ جو انہوں نے بہت دلیری اور جوش وجذبے سے سرانجام دیئے اور پاکستان فوج کو گہرے زخم لگائے۔

چٹاگانگ ایرپورٹ اہم ترین مقامات میں سے ایک تھا۔ اس پر 25 مارچ کو مکتی باہنی اور ایسٹ پاکستان پولیس نے قبضہ کر لیا کیونکہ اس وقت تک مغربی پاکستان سے فوجی یونٹس مشرقی پاکستان پہنچنا شروع ہوئی تھیں۔ لہٰذا ائرپورٹ کا فوری قبضہ بنگالیوں کے لئے ضروری تھا تاکہ کوئی فوجی یونٹ وہاں پر اتاری نہ جا سکے۔ بنگالی عملہ ویسے ہی وہاں سے بھاگ گیا جو چند ایک بہاری تھے یا تو قتل کر دیئے گئے یا اغوا کر لئے گئے اور کچھ اپنی جان بچانے کے لئے جہاں ممکن ہو سکا چھپ گئے۔

مغربی پاکستانی فوج کے لئے ایرپورٹ کا قبضہ اہم ین بداف میں سے ایک تھا۔ لیکن قبضے کے لئے ٹروپس نہ تھے۔ جلدی میں نزدیک ترین بارڈر سے ایسٹ پاکستان رائفلز کا ایک بھاری دستہ منگوایا گیا۔ کسی کو یہ ہوش نہ تھا کہ ایسٹ پاکستانی تو ہمارے خون کے پیاسے ہو چکے ہیں۔ انہیں وہاں نہ بھیجا جائے یا انہیں کم از کم مغربی پاکستانیوں سے علیحدہ کرلیا جائے۔ بہرحال اس دستے کو بغیر سوچے سمجھے بھیج دیا گیا۔ خوش قسمتی سے اس دستے میں دو مغربی پاکستانی صوبیدار اور چند ایک NCOs بھی تھے۔ بھلا ہو ان لوگوں کا کہ انہوں نے حالات قابو میں رکھے۔ ائرپورٹ پہنچتے ہی مغربی پاکستانی NCOs نے نہایت ذمہ داری کا ثبوت دیتے ہوئے LMGS اپنے پاس رکھ کر اہم جگہوں پر پوزیشنیں لے لیں۔ بنگالی ٹروپس کو آگے کنٹرول ٹاور اور باقی جگہوں پر قبضے کے لئے بھیج گیا لیکن انہیں مسلسل LMGS فائر کی زد میں رکھا۔ مغربی پاکستانی JCOs نے بھی اہم کردار ادا کیا اور مزید خوش قسمتی یہ کہ ایسٹ پاکستان رائفلز کے ان جوانوں کو تاحال بنگالی بغاوت کے وقت کا علم نہ تھا کیونکہ مکمل بغاوت 26/25 مارچ کی رات کو شروع ہوئی۔ ان دستوں کے پہنچتے ہی مکتی باہنی اور ایسٹ پاکستان پولیس کے لوگ چپکے سے غائب ہو گئے لیکن اب ایسٹ پاکستان رائفلز کے جوانوں کی وہاں پر موجودگی مزید خطرناک تھی۔ وہ کسی وقت بھی بغاوت کر کے ایرپورٹ کا مکمل قبضہ حاصل کر سکتے تھے۔

بنگالی ٹروپس اگرچہ شہر میں ہونے والی بغاوت سے علم تھے لیکن انہیں زیادہ دیر وہاں رکھنا خطرے سے خالی نہ تھا خصوصاً جبکہ ان کے پاس ہتھیار بھی تھے۔ انہیں حالات کا علم کسی وقت بھی ہو سکتا تھا۔ بدقسمتی سے اس وقت فوجی ٹروپس کہیں بھی میسر نہ تھے۔ پورے چٹاگانگ میں صرف 20 بلوچ رجمنٹ موجود تھی اور وہ ایسٹ پاکستان رجمنٹل سنٹر کے ساتھ نبرد آزما تھی۔ یہ سنٹر شہر سے کئی میل دور تھا۔ خوش قسمتی سے چٹاگانگ نیول بیس پر کچھ مغربی پاکستانی نیول دستے موجود تھے۔ لہٰذا فوری طور پر نیوی کی مدد حاصل کی گئی اور نیوی نے لیفٹیننٹ کمانڈر اختر بلوچ کی زیرنگرانی ایک دستہ روانہ کیا۔ اختر بلوچ کا تعلق بنیادی طور پر تو "سب میرین" گروپ سے تھا لیکن کمانڈو ٹریننگ بھی حاصل کر رکھی تھی۔ وہ آرام سے اپنے جوانوں کے ساتھ ایرپورٹ پہنچا۔ مغربی پاکستانی JCOs کو ساتھ لیا اور کنٹرول ٹاور کے پاس چلا گیا۔ بغیر کوئی مسئلہ کھڑا کئے ہوئے اپنے حواس قابو میں رکھے اور سیدھا بنگالی ٹروپس کے پاس گیا۔ احتیاطاً کچھ نوجوانوں نے خصوصاً مغربی پاکستانی NCOs نے LMGs کی پوزیشنز لے رکھی تھیں جو ایمرجنسی حالات میں کاروائی کر سکتی تھیں۔

ایسے حالات میں بے جا بہادری دکھانے کی بجائے ہوش اور عقلمندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ کمانڈر اختر نے نہایت ہوشمندی کا ثبوت دیا۔ اس نے موقعہ پر پہنچ کر تمام بنگالی ٹروپس کا شکریہ ادا کیا اور انہیں بتایا کہ ہمیں آپ لوگوں کی جگہ لینے کے لئے بھیجا گیا ہے اور وہ بلاچوں و چراں عمارات سے باہر آ گئے۔ جب کمانڈر اختر کے لوگوں نے اہم پوزیشنز سنبھال لیں تو اس نے بنگالی ٹروپس کو حکم دیا کہ وہ ہتھیار ایک جگہ رکھ کر تاحکم ثانی اندر آرام کریں چونکہ آپ لوگ تھک چکے ہیں اور نیوی کے ٹروپس تازہ دم ہیں لہٰذا وہ ڈیوٹی دیں گے۔ بنگالی ٹروپس بغیر شک کے ہتھیار رکھ کر اندر چلے گئے۔ کمانڈر اختر نے کمرے کی کنڈی بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا اور ان لوگوں کے اوپر گارڈ تعینات کر دی۔ کمانڈر اختر بلوچ کی دلیری اور حاضر دماغی کام آ گئی۔

دوسرے دن کیپٹن سجاد کو ایک دستہ دے کر ائرپورٹ بھیجا گیا۔ کیپٹن سجاد کا تعلق کمانڈو گروپ سے

تھا۔ لہٰذا اس نے ایئرپورٹ کا کنٹرول سنبھال لیا اور کمانڈر اختر کے دستے کو واپس بھیج دیا۔ ایئرپورٹ کے اہم ٹیکنیکل سٹاف کو مشکل سے تلاش کیا گیا اور مکمل قبضہ اور فضائی رابطہ 29 مارچ کو بحال ہوا۔

جب ہر لمحہ موت کا پیغام دینے لگا

جنگ میں وقت سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ بروقت اقدامات بڑے سانحہ سے بچا سکتے ہیں جبکہ سستی یا دیری تباہی کا موجب بن سکتی ہے۔ جنگ میں ایک ایک لمحہ شکست و فتح پر اثر انداز ہوتا ہے۔ مشرقی پاکستان میں بھی ایسے لمحات آئے جب زندگی اور موت کے درمیان محض لمحات کی بات رہ گئی۔ ایسا ہی ایک موقعہ 29 مارچ 1971ء کو پیش آیا۔ ڈھاکہ کے بعد چٹاگانگ مشرقی پاکستان کا اہم ترین شہر تھا اور سب سے بڑی بندرگاہ بھی۔ جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے کہ یہاں بنگالی فوج سب سے زیادہ تھی اور مغربی پاکستان کی محض ایک بلوچ رجمنٹ۔ سب سے سینئر مغربی پاکستانی فوجی آفیسر بریگیڈیئر ایم ایچ انصاری تھا جو اس وقت وہاں کا اسٹیشن کمانڈر تھا جسے فوجی اصطلاح میں عام طور پر ''بیس ایریا'' کہتے ہیں۔ بریگیڈیئر انصاری نے چٹاگانگ بچانے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ درحقیقت چٹاگانگ بچا ہی انہی کی وجہ سے تھا۔ اس لئے فوری طور پر انہیں جنرل کے رینک پر ترقی دے کر ایک ڈویژن کی کمان سونپ دی گئی۔ آنے والے مشکل حالات میں بھی ان کا کردار بہت اہم رہا۔

جونہی 25 مارچ کو فوجی کارروائی کا فیصلہ ہوا تو بنگالی یونٹوں اور نیم فوجی تنظیموں کے جوانوں نے بغاوت شروع کر دی۔ جس کی پہلے سے منصوبہ بندی کر رکھی تھی۔ لہٰذا 27 مارچ کی رات کو میجر ضیاء الرحمٰن نے چٹاگانگ ریڈیو پر بنگلہ دیش کا اعلان آزادی کر دیا۔ خود آزاد بنگلہ دیش فوج کے کمانڈر انچیف کے فرائض سنبھال لئے۔ پورے شہر میں مکتی باہنی کے لوگوں نے کنٹرول سنبھال کر قتل و غارت شروع کر دی جس کی مکمل منصوبہ بندی پہلے سے ہی کر رکھی تھی۔ ایسٹ بنگال رجمنٹس، ایسٹ پاکستان رائفلز، ایسٹ بنگال رجمنٹل سنٹر اور ایسٹ پاکستان پولیس کے لوگوں نے شہر سیل کر دیا تاکہ باہر سے کوئی مدد نہ آ سکے اور شہر کے اندر سے بچ کر کوئی باہر نہ جا سکے۔ باغی ہونے والی یونٹوں اور جوانوں نے تمام اسلحہ اور اسلحہ خانوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ حالات یکدم بہت خراب ہو گئے۔ ایسا نظر آتا تھا مغربی پاکستانی سویلین اور بہاریوں کے ساتھ ساتھ مغربی پاکستانی فوج میں سے بھی شاید کوئی زندہ نہ بچ سکے۔ ان مشکل حالات میں بریگیڈیئر انصاری نے چٹاگانگ میں موجود تمام مغربی پاکستانی ٹروپس کی کمان سنبھال لی۔ ابتر حالات کا ادراک کرتے ہوئے ڈھاکہ ہائی کمان نے نزدیک ترین چھاؤنی کومیلا سے 53 بریگیڈ کو 26 مارچ کی صبح ہی روانگی کے احکامات جاری کر دیئے تھے اور بریگیڈ روانہ بھی ہو گیا۔ اس بریگیڈ میں صرف ایک انفنٹری یونٹ 24 فرنٹیئر فورس رجمنٹ تھی۔

کومیلا سے چٹاگانگ تک پیدل تین دنوں کا راستہ تھا۔ راستے میں مکتی باہنی کے لوگوں نے تمام پل جلا دیے تھے۔ باغی بنگالی سپاہیوں نے جگہ جگہ ناکے لگا رکھے تھے۔ اس طرح بریگیڈ کی نقل و حرکت بہت مشکل ہو گئی۔ ان سب مشکلات کے باوجود بریگیڈ مسلسل چلتا ہوا 28 کی رات کو چٹاگانگ کے گردونواح میں پہنچ گیا۔ کومیلا روڈ پر ایسٹ پاکستان رائفلز سنٹر کے ہیڈ کوارٹر کی عمارت تھی۔ اس سے ایک کلومیٹر پیچھے کومیلا کی طرف قمرہ نامی گاؤں کے پاس میجر ضیاء الرحمٰن نے بہت بڑا ناکہ لگوا رکھا تھا۔

ان جوانوں کو حکم تھا کہ کسی قیمت پر 53 بریگیڈ کو چٹاگانگ داخل نہ ہونے دیا جائے۔ لہٰذا یہاں شدید لڑائی ہوئی۔ 24 ایف ایف کا کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ

کرنل شاہ پور اور بہت سے جوان شہید ہو گئے ۔ بریگیڈ ایک انچ بھی آگے نہ بڑھ سکا ۔ ڈھاکہ ہیڈ کوارٹر اطلاع دی گئی اور وہاں سے کمانڈو بٹالین بھیجنے کی استدعا کی گئی ۔ اس وقت حالات کچھ اس طرح تھے کہ چٹا گانگ میں موجود مغربی پاکستانی واحد بٹالین 20 بلوچ شہر سے 20 کلومیٹر باہر ایسٹ بنگال رجمنٹل سنٹر کی بغاوت سے نبرد آزما تھی ۔ وہ شہر میں نہیں آسکتی تھی کیونکہ شہر کی ناکہ بندی کر لی گئی تھی ۔ ائیر پورٹ مکتی باہنی کے قبضے میں تھا ۔ 53 بریگیڈ بھی ناکے کے سامنے بے بس تھا ۔ بہت سی شہادتیں ہو چکی تھیں جن کی لاشیں اٹھانا بھی مشکل تھا ۔ شہر میں کوئی خاص ٹروپس موجود نہ تھے ۔ ہر لمحہ موت کو دعوت دینے لگا ۔ بریگیڈیئر انصاری نے رات ہی سے ائیر پورٹ پر دوبارہ قبضہ کی کوشش شروع کر دی ۔ مناسب ٹروپس چونکہ موجود نہ تھے لہٰذا نیوی کے موجود دستے کی مدد لی گئی اور یہ کام نیوی کے کمانڈر اختر بلوچ نے بہت دلیری اور بہت ذہانت سے سرانجام دیا ۔

ڈھاکہ ہیڈ کوارٹر سکتے کے عالم میں تھا کہ اب کیا کیا جائے؟ امداد کس طرح بھیجی جائے؟ ڈھاکہ ائیر پورٹ پر C-130 جہاز تیار رکھا گیا ۔ کمانڈو بٹالین بمعہ کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل محمد سلیمان تیاری کی حالت میں تھے ۔ خوش قسمتی سے 29 مارچ کو 10 بجے تک ائیر پورٹ کا مکمل قبضہ حاصل کر لیا گیا اور جہاز روانہ ہو گیا ۔ یہ ٹروپس جونہی چٹا گانگ پہنچے انہیں دشمن میں گھرے ہوئے 53 بریگیڈ کی مدد کے لئے روانہ کر دیا گیا ۔ بڑی مشکل سے دوسری پرواز میں مزید جوان اور راشن وغیرہ بھیجے گئے ۔ شاید تقدیر کو کچھ ایسا ہی منظور تھا ۔ کرنل سلیمان وہاں سے کمانڈوز شہر کی طرف سے 53 بریگیڈ کی مدد کے لئے روانہ ہوئے ۔ علاقے سے ناواقف تھے ۔ ''ریکی'' جو کسی بھی فوجی کارروائی کے لئے بہت اہم ہوتی ہے وقت کی کمی کی وجہ سے ممکن نہ ہو سکی ۔ لہٰذا علاقے سے مکمل عدم واقفیت کی بنا پر کوئی تفصیلی منصوبہ بندی بھی نہ ہو سکی ۔

کرنل محمد سلیمان کو یہ بھی اندازہ نہ تھا کہ ناکہ لگائے گئے علاقے میں تھوڑا پہلے شہر کی طرف ایسٹ پاکستان رائفلز سنٹر واقع ہے اور سنٹر کے ہیڈ کوارٹر کی عمارت عین شاہراہ کومیلا پر واقع ہے ۔ سنٹر کے لوگ بغاوت کر چکے تھے ۔ سنٹر میں موجود مغربی پاکستانیوں اور ان کے اہل خانہ کو قتل کر دیا گیا تھا اور کچھ قید کر لئے گئے تھے ۔ ان لوگوں نے اپنی عمارت کے سامنے ناکہ لگا دیا تا کہ کوئی آدمی شہر کی طرف سے باہر نہ جا سکے ۔ مکتی باہنی کے مخبر پورے شہر میں پھیلے ہوئے تھے ۔ کرنل سلیمان کے ٹروپس بعد دوپہر جونہی لاگ ایریا ہیڈ کوارٹر سے روانہ ہوئے ان کی اطلاع ایسٹ پاکستان رائفلز پہنچا دی گئی اور وہ اپنے شکار کے لئے تیار ہو گئے ۔ جونہی یہ لوگ سنٹر کی عمارت کے نزدیک پہنچے گولیوں کی بارش شروع ہو گئی ۔ کرنل سلیمان ، اس کے تین آفیسرز اور تیس جوان موقعہ پر شہید ہو گئے ۔ باقی سارے زخمی تھے جنہیں اٹھانے والا بھی کوئی نہ تھا ۔

یہ سانحہ پاکستانی ٹروپس کے لئے بہت بڑا دھچکا تھا ۔ مزید بدقسمتی یہ ہوئی کہ 53 بریگیڈ کے سامنے ناکہ ختم کرانے کے لئے نیوی سے مدد مانگی گئی ۔ نیوی نے ایک کھڑے جہاز سے ضرورت کے مطابق ایسٹ پاکستان رائفلز سنٹر پر توپ سے گولہ پھینکا ۔ یہ گولہ باغیوں پر گرنے کی بجائے سیدھا 53 بریگیڈ پر جا گرا اور وہ چلا اٹھے ۔ خیال تھا کہ شاید گولہ فائر کرنے والے توپچی کی صحیح رہنمائی نہیں کی گئی ۔ لہٰذا اسے دوبارہ نئے ریفرنس سے گولہ پھینکنے کا حکم دیا گیا ۔ یہ گولہ بھی سیدھا اپنے جوانوں پر جا گرا مجبوراً فائر بند کرا دیا گیا ۔ بعد میں پتہ چلا کہ توپچی کو ریفرنس دینے والا سگنل مین بنگالی تھا اور یہ ساری کارستانی اسی کی تھی ۔ فوری طور پر علاقے میں موجود

بنگالیوں کو غیر مسلح کرکے یونٹ لائنز میں قید کر دیا گیا لیکن جو نقصان ہونا تھا وہ ہو گیا۔ غدار اپنا کام دکھا چکے تھے۔

جن یونٹوں میں اسلحہ تھا وہ تمام کی تمام بغاوت کر چکی تھیں۔ الگ ایریا کے پاس جو تھوڑا بہت اسلحہ تھا وہ اب خاتمے کے قریب تھا۔ لہٰذا بریگیڈیئر انصاری نے اس خطرناک صورت حال کا سگنل ڈھاکہ روانہ کیا کہ اگر اسلحہ فوری نہیں پہنچتا تو چٹاگانگ پر باغی قابض ہو جائیں گے۔ 53 بریگیڈ کی شہادتیں اور ناکہ بندی، کمانڈوز کی شہادتیں، اسلحہ کا خاتمہ قدرتی طور پر ڈھاکہ ہیڈکوارٹر میں سب کے پسینے چھوٹ گئے۔ شام ہو رہی تھی۔ چٹاگانگ ایئر پورٹ پر رات کو جہاز اتارنے کی سہولت نہ تھی۔ ہر لمحہ موت کا پیغام دے رہا تھا اور اب پوری رات درمیان میں تھی۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ لہٰذا ایک دوسرے C-130 میں اسلحہ لادنا شروع کر دیا گیا۔ جب اسلحہ لادا جا چکا اور پائلٹ سکواڈرن لیڈر محمد یونس نے روانگی کے لئے لوڈ چیک کیا تو اسلحہ کے باکسز کھلے رکھے ہوئے تھے۔ باکسز کو مخصوص طور پر باندھنے اور ترتیب سے رکھنے کے لئے کسی کے پاس وقت ہی نہیں تھا۔ کھلے رکھے ہوئے باکسز جہاز میں خطرناک ہوتے ہیں۔ ہمیشہ انہیں اس طرح باندھا جاتا ہے کہ دوران پرواز ہل نہ سکیں۔ ہلنے سے پھٹ سکتے ہیں اور جہاز کا حادثہ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا پائلٹ نے اس طرح جہاز اڑانے سے انکار کر دیا۔ لیکن اب باندھنے کے لئے نہ تو رسیاں تھیں نہ جوان اور نہ وقت کیونکہ اندھیرا ہونے میں زیادہ دیر نہ تھی۔ یہاں تمام افسران کے رنگ خوف سے پیلے ہو گئے۔ اب کیا کیا جائے؟

ہیڈکوارٹر کے کرنل افضل وڑائچ پائلٹ کو علیحدہ لے گئے اور بتایا کہ اگر سامان کی ترسیل کل تک ملتوی کی جاتی ہے تو شاید ہم دوبارہ چٹاگانگ کبھی نہ اتر سکیں۔ سکواڈرن لیڈر یونس بھی ایک دلیر آفیسر تھا اور جنگ میں تو [illegible] ت سے کھیلنا ہی پڑتا ہے۔ اس نے بھی حالات کی خطرناک صورتِ حال بھانپ لی۔ ملک کی سالمیت کا سوال تھا۔ یونس نے جواب دیا۔ ٹھیک ہے اگر صورتِ حال اتنی خطرناک ہے تو میں تیار ہوں۔ اگر کوئی اور چیز لے جانا ضروری ہے تو وہ بھی رکھیں۔ ساتھ کھڑے میجر محمد افضل نے فوری کہا ہاں ایک 106 Recoilless Rifle ایک جیپ پر فکس ہے۔ یہ اس نے کسی ورکشاپ میں پڑی ہوئی ڈھونڈی تھی۔ یونس کے کہنے پر اس رائفل سمیت جیپ جہاز کے اندر کھڑی کر دی گئی۔ جہاز کے عملے کے لئے بیٹھنے کی جگہ نہ بچی۔ لہٰذا وہ تمام اس جیپ کے اوپر بغیر سیٹ بیلٹ باندھے بیٹھ گئے اور سکواڈرن لیڈر یونس نے اللہ کا نام لے کر کھلے اسلحہ اور بغیر بندھی جیپ کے ساتھ جہاز محوِ پرواز کر دیا۔ سب لوگوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ شام تک یہ طیارہ بحفاظت چٹاگانگ ایئر پورٹ پر اتر گیا۔ یونس اور اس کا عملہ یہ اسلحہ اس طرح حفاظت سے لے گئے جس طرح ایک ماں اپنے بچے کو گود میں جھولا دیتی ہے۔ ہیڈکوارٹرز کے آفیسرز نے خصوصی شکرانے کے نوافل ادا کئے۔ بروقت اسلحہ پہنچنے سے بریگیڈیئر انصاری نے ایسٹ پاکستان رائفلز ہیڈکوارٹر پر فوری حملہ ترتیب دیا۔ خود رہنمائی کی۔ باغیوں کو مار بھگا کے ہیڈکوارٹر پر قبضہ کر لیا۔ 18 ہزار رائفلز اور بہت سا اسلحہ ہاتھ لگا جو ان لوگوں نے جمع کر رکھا تھا۔ اسی دن سلہٹ میں حالات خراب ہو گئے تو ایک پی آئی اے کا فوکر جہاز لیا گیا جس میں 70 جوانوں کو فوری روانہ کیا گیا جبکہ اس میں زیادہ سے زیادہ 40 آدمیوں کی گنجائش ہوتی ہے۔ یہ عظیم اور نڈر پائلٹ یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں جن کی بے خوف قیادت سے بروقت کارروائی ممکن ہوئی۔ دفاعِ وطن میں ان لوگوں کا کردار یقیناً قابلِ تحسین تھا اور قوم انہیں سلام پیش کرتی ہے۔

❁❁❁

حکیم آفتاب احمد قرشی

آسمانِ طب کا روشن ستارہ

اب ان کے صاحبزادے محسن آفتاب قرشی اپنے والد کے مشن کی تکمیل کیلئے سرگرم ہیں اللہ ان کو کامیاب کرے۔

شفائے ملک حکیم محمد حسین قرشی

حکیم محمد آفتاب قرشی

حکیم آفتاب احمد قرشی 1925ء کو لاہور کے ایک علمی و طبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا قاضی فضل الدین شہر گجرات کے قاضی تھے علاوہ ازیں آپ امیر کابل کے دربار نیز ریاست ہائے کشمیر اور نابھہ کی سرکار سے بھی وابستہ رہے۔

آپ کے دوستوں میں پیر محمد علی شاہ اور جمال الدین افغانی جیسے اسلامی نشاۃ ثانیہ کے داعیان کا نام نامی آتا ہے۔

آفتاب کی والدہ شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی کی زوجہ محترمہ ایک تہجد گزار خاتون تھیں اور اپنے

غزل

مجھے بیگانے کی ضرورت کیا تھی
یہ بتانے کی ضرورت کیا تھی
ہم سے کہتے، نہ دیکھتے تجھ کو
منہ چھپانے کی ضرورت کیا تھی
ترک تعلق نے ہمیں مار ڈالا
زہر کھانے کی، ضرورت کیا تھی
زلفِ زنجیر سے، رہائی نہیں ممکن
قید خانے کی،ضرورت کیا تھی
میری میت پہ، آئے ہیں بہانے آنسو
اس بہانے کی، ضرورت کیا تھی
خامشی سے، میرے شہر سے جاتے شاکر
شور مچانے کی، ضرورت کیا تھی
(ایم سرفراز شاکر)

شوہر اور بزرگوں کے اتباع میں شب و روز بسر کرتیں۔ گھر میں نوکروں کی کمی نہ تھی لیکن وہ آفتاب کی دادی کی خدمت اپنے ہاتھوں سے انجام دیتیں وہ اسے عبادت کا درجہ دیتی تھیں۔ آفتاب کے والدین سیاسی اور سماجی لحاظ سے ایک ممتاز شخصیت تھے۔ تمام نعمتوں سے بہرہ ور آفتاب احمد عجز و انکسار اور سادگی کا پیکر بنے رہے۔ آپ اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے تمام عمر دکھی انسانیت کی خدمت کرتے رہے۔

آفتاب احمد قرشی نے ابتدائی تعلیم لاہور میں حاصل کی۔ طبیہ کالج لاہور سے زبدۃ الحکما کی سند پہلی پوزیشن کے ساتھ حاصل کی۔ وہ شروع ہی سے حضرت علامہ اقبالؒ کے اس نظریہ سے متفق تھے کہ برصغیر کے مسلمان ایک علیحدہ خطہ ارضی کے حصول کے لئے جدوجہد کریں جب مسلم لیگ کی سرگرمیاں بڑھیں تو اس وقت وہ کالج میں زیر تعلیم تھے۔ آپ نے عملاً اس تحریک میں بحیثیت رکن مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن حصہ لیا اور پھر آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس کی مجلس عاملہ کے رکن منتخب ہوئے۔ انہوں نے 1940ء میں اقبال پارک میں مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس کے انعقاد کے سلسلے میں دیگر ساتھی طلباء کے ہمراہ انتظام و انصرام کی ذمہ داریاں نبھائیں۔ 1944ء میں انہیں پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا سیکرٹری منتخب کیا۔ 1946ء میں اسلامیہ کالج کے جفاکش اور بہادر فرزندوں کی بدولت پنجاب میں مسلم لیگ نے انتخابی معرکہ سر کیا۔ ان کی خدمات کا اعتراف خود حضرت قائداعظمؒ نے کیا۔ انہوں نے اسلامیہ کالج کے جلسہ تقسیم اسناد میں شرکت کی اور حکیم آفتاب احمد قرشی اور سید قاسم رضوی کو قومی کارکردگی کی اسناد دیں جن پر ان کے دستخط ثبت تھے۔ اس انتخابی مہم کے سلسلے میں حکیم آفتاب احمد قرشی دو اڑھائی ماہ مسلسل پنجاب کے مختلف شہروں کا دورہ کرکے انتخابی مہم چلاتے رہے۔ ان تھک محنت اور مسلسل بے خوابی کی وجہ سے ان کی صحت خراب ہوگئی لیکن انہوں نے مطلق پروا نہ کی اور ہمیشہ یہی کہتے ایسی کئی زندگیاں وطن عزیز پر قربان کرسکتا ہوں۔

حکیم عبدالرحمٰن سواتی انجمن حمایت اسلام کے اس جلسہ میں شریک تھے جو اسلامیہ کالج وطبیہ کالج کی مشترکہ وسیع گراؤنڈ میں منعقد ہوا تھا اور اس میں حضرت قائداعظمؒ تشریف فرما تھے۔ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں قائداعظم نے شفا الملک سے مخاطب ہوکر فرمایا آپ کا صاحبزادہ آفتاب جو اس وقت سٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر ہیں مجھے ان

کی شبانہ روز محنت پر بہت خوشی ہے مجھے کامل بھروسہ ہے کہ انشاء اللہ پاکستان کے قیام کے بعد ہم ضرور طب اسلامی کی سرپرستی کریں گے۔ حکیم آفتاب احمد قرشی کو 24 جنوری 1947ء میں پنجاب میں سول نافرمانی کی تحریک میں سرگرم حصہ لینے کی پاداش میں گرفتار کرلیا گیا اور سینٹرل جیل لاہور میں رکھا گیا۔ کچھ عرصہ بعد رہائی ملی تو کسی اور مقدمہ میں دوبارہ گرفتار کرلیا گیا۔ اس مرتبہ انہیں میانوالی کی جیل میں قید رکھا گیا۔ ان کی رہائی اس وقت عمل میں آئی جب سول نافرمانی کی تحریک اختتام کو پہنچی جب وہ بذریعہ ریل لاہور کے پلیٹ فارم پر اُترے تو ایک شاندار جلوس ان کے استقبال کے لئے موجود تھا انہیں نعروں کی گونج میں گھر تک لایا گیا۔

مئی 1947ء میں جالندھر میں تقسیم پنجاب کیخلاف فسادات شروع ہوگئے تو وہاں کی مسلم لیگی قیادت نے حکیم آفتاب احمد قرشی کو ایک جلسہ میں شرکت کی دعوت بھجوائی۔ فسادات کی وجہ سے سفر میں جو خطرات لاحق تھے ان کی وجہ سے احباب کے منع کرنے کے باوجود انہوں نے جلسہ میں شرکت کی۔ قومی سطح پر ان کا تشخص مرکزی لیڈر کی حیثیت سے ابھر رہا تھا۔ جون 1947ء میں انہیں سرحد کے مسلم لیگی زعماء نے مدعو کیا۔ انہوں نے سرحد کے استصواب میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے مہاجرین کی آبادکاری میں حصہ لیا جو لوگ بے سروسامانی میں نظر آتے انہیں اپنے گھر سے ضروریات کی اشیاء دے آتے حتیٰ کہ گھر میں بستر اور سر کے نیچے رکھنے کے لئے تکیہ بھی نہ رہا۔ ایک رات شفاء الملک گھر واپس آئے تو سونے کے لئے بستر تھا اور نہ تکیہ زوجہ محترمہ نے بتایا کہ ہم تو کئی روز سے اسی طرح رہ رہے ہیں گھر کا سامان آفتاب بھارت سے آنے والے مہاجرین کو دے آئے ہیں غالباً انہیں احساس نہیں ہوا کہ یہ بستر آپ کا ہے۔ یہ سن کر شفاء الملک مسکرا دیئے۔ ہاں! ایثار تو اسی کو کہتے ہیں بیگم صاحبہ نے نوکر کے ذریعہ شفاء الملک کے لئے تکیہ پڑوسیوں کے گھر سے منگوایا کیونکہ وہ تکیہ کے بغیر سو نہیں سکتے تھے اس رات شفاء الملک ننگے فرش پر تکیہ رکھ کر سوئے اگلے دن شفاء الملک نے تمام ضروری اشیاء کی خریداری کروائی۔

تحریک پاکستان کے دوران آپ نے شب و روز محنت کی اور مسلسل سفر میں رہے۔ ان صعوبتوں کی وجہ سے نزلہ' بخار اور دل کا عارضہ لاحق ہوگیا تھا۔ علاج کراتے تھے لیکن چونکہ اپنی ذات کی نفی کر چکے تھے لہٰذا اس میں باقاعدگی نہ تھی طبی اور ملکی سیاست میں حصہ لینے کی والد کی طرف سے اجازت تھی لہٰذا وہ بلا روک ٹوک حصہ لیتے لیکن والد محترم کو تمام حالات و واقعات سے آگاہ رکھتے۔ والدہ محترمہ ایک انٹرویو میں فرماتی ہیں والد نے تمام بچوں کو علیحدہ علیحدہ ذمہ داریاں سونپ رکھی تھیں۔ آفتاب احمد نے طبی اور سیاسی میدان میں خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ریاض احمد کا رجحان تصنیف و تالیف کی طرف تھا اس لئے ان کی توجہ مطب اور تصنیف و تالیف کی طرف رہی' انہیں اس پر کام کرنے کا پورا موقع فراہم کیا گیا۔ سعید احمد کو گھریلو ذمہ داریاں اور گھر پر آنے والے مریضوں کو ادویات دینے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اقبال احمد نے کیمیکل انجینئرنگ میں ایم ایس سی

کی تھی لہٰذا قرشی صاحب نے انہیں قرشی دواخانہ کی تمام ذمہ داری سونپ دی تھی ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے فرمایا یوں تو ماں کو تمام اولاد پیاری ہوتی ہے مگر آفتاب کو مجھ سے اور مجھے آفتاب سے بہت پیار تھا۔ اس نے وسائل ہونے کے باوجود اپنا علیحدہ مکان نہیں بنایا بلکہ تمام عمر میری محبت کی وجہ سے میرے ساتھ گزار دی۔

حکیم آفتاب احمد قرشی آزادی کشمیر کے لئے بھی سرگرم رہے۔ ان کی خدمات کا اعتراف چودھری غلام عباس، سردار محمد ابراہیم خان اور سردار عبدالقیوم خان نے کیا۔ موتمر عالم اسلامی کی پہلی نشاۃ ثانیہ کے انعقاد کے موقع پر وہ اپنے والد کے ہمراہ تھے اور کانفرنس کے انتظام و انصرام میں نمایاں حصہ لیا۔ قیام پاکستان کے بعد انہیں مسلم لیگ کے مرکزی زعماء نے عہدوں کی پیش کش کی لیکن انہوں نے ٹھکرادی اور حکومت کا حصہ نہ بنے قناعت انہیں ورثے میں ملی تھی کسی بھی قسم کی دنیاوی چمک دمک نے انہیں متاثر نہ کیا۔ البتہ ایسے اعزازی منصب کو قبول کر لینے میں عار محسوس نہ کرتے تھے جس کا مقصد عوام الناس کی خدمت ہوتا تھا۔ 1962ء میں انہوں نے آل پاکستان یوتھ کنونشن منعقد کیا جس میں ملک بھر سے نوجوان شریک ہوئے۔ اجلاس نے متفقہ طور پر انہیں صدر منتخب کیا۔ اس پلیٹ فارم سے انہوں نے بیرون ملک نوجوانوں کے مختلف بین الاقوامی اجتماعات میں شرکت کی وہ ویانا، فرانس اور سری لنکا گئے اور پاکستانی نوجوانوں کی نمائندگی کی۔

آفتاب احمد قرشی کے والد موتمر عالم اسلامی کی پاکستان شاخ کے صدر تھے اس حوالے سے وہ اس تنظیم کی تمام سرگرمیوں میں [illegible] انتظامات اپنی نگرانی میں کرواتے۔ لاہور میں موتمر عالم اسلامی کے شاندار اجتماعات کے انعقاد میں آپ کی کاوشیں شامل ہیں۔ 1974ء میں لاہور میں دوسری اسلامی سربراہی کانفرنس کے موقع پر چونکہ شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی شدید علیل تھے لہٰذا اس کانفرنس میں والد محترم کی نمائندگی حکیم آفتاب احمد قرشی نے کی۔ 1978ء میں موتمر عالم اسلامی کا ایک وفد لے کر روس کے دورہ پر گئے۔ آپ تاشقند، سمرقند، بخارا، ماسکو اور لینن گراڈ گئے اور وہاں مسلم اکابرین سے ملے۔ آپ مختلف تعلیمی اور رفاہی تحریکات میں بھی حصہ لیتے رہے۔ آپ انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کے رکن اور طبیہ کمیٹی کے رکن تھے آپ اسلامیہ کالج لاہور کی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے صدر بھی رہے۔

تحریک پاکستان کے دنوں میں آپ نے سفر کی صعوبتیں برداشت کیں ان سرگرمیوں کو انجام دیتے ہوئے سردی، گرمی اور برسات کبھی ان کے آڑے نہ آئے کبھی کوئی تکلیف آپ کو ان کاموں سے نہ روک سکی۔ صحت کی طرف سے اغماض برتنا بالآخر رنگ لایا دسمبر 1981ء کو چھپن سال کی عمر میں تحریک پاکستان کا یہ خاموش سپاہی اپنے خالق حقیقی سے جاملا۔ خانوادہ قرشی نے تحریک پاکستان کے دوران جو خدمات انجام دیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ انہوں نے اپنے مقام یا تعلقات کی بنیاد پر کبھی کوئی مفاد حاصل نہیں کیا بلکہ اپنا تن، من، دھن سب کچھ قربان کیا۔

مسئلہ کشمیر

کشمیری عوام پر بھارت نے جنگ مسلط کر رکھی ہے۔ کشمیر سے بھارتی فوج لداخ کی طرف پیش قدمی کر رہی ہے۔ پاکستان کے لئے یہ موقع ہے کہ بھارت سے بات چیت کی زبان نہیں بلکہ توپ اور میزائل کی زبان سے بات کرے۔

چین کی لداخ میں پیش قدمی

کشمیر کی آزادی کے امکانات بڑھ گئے
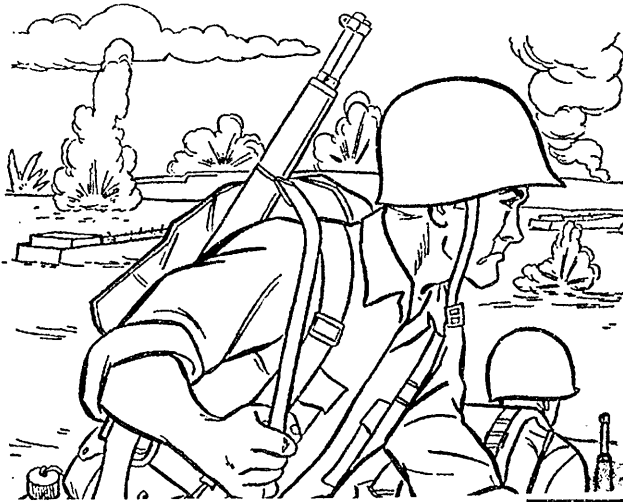
☆ گلزار اختر کاشمیری
E:Mail: gulzar.akhtar@gmail.com

15 جون 2020ء کو ریاست جموں و کشمیر لداخ کے علاقے میں بھارت اور چین کے فوجیوں کے درمیان جھڑپ میں بھارت کے بیس سے زیادہ فوجی مارے گئے۔ اور 35 سے زیادہ زخمی بھی ہوئے۔ اس مضمون میں ہم جائزہ لیتے ہیں کہ یہ جگہ کون سی ہے۔اس کے جغرافیائی حالات کیسے ہیں۔ اور مستقبل میں تحریک آزادی کشمیر اور سی پیک پر اس کے کیا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔

تاریخی حیثیت

برٹش انڈیا کے دور میں یہ جگہ نا معلوم اور دشوار گزار راستے تھے۔ جہاں برف جمی رہتی تھی۔ وادی لیہ سے تعلق رکھنے والے غلام رسول گلوان نے یہ علاقہ 1818ء میں دریافت کیا تھا۔اسی کے نام پر اس وادی کا نام گلوان وادی جہاں بہتے دریا کا نام دریائے گلوان رکھا گیا۔ یہ لداخ کے اس ایریا میں ہے جو چین کے

علاقے اکسائی چن اور قراقرم پاس سے نزدیک ہے اور ان دونوں علاقوں کا گیٹ وے ہے۔

جغرافیائی صورتِ حال

اس کے ساتھ تبت کا علاقہ ہے۔ چین نے 1950 میں تبت کی خود مختاری ختم کر کے چین کا حصہ بنالیا۔ تبت میں برٹش انڈیا کے ریسٹ ہاؤس ٹیلی گراف آفس اور کچھ پراپرٹی تھی۔ بھارتی وزیر اعظم جواہر لعل نہرو نے خیر سگالی کے طور پر نہ صرف تبت پر چین کے قبضہ کو تسلیم کیا بلکہ برٹش انڈیا کی تمام پراپرٹی اور گیسٹ ہاؤس چین کو دے دیے۔

اکسائی چین کا علاقہ جس پر بھارت اور چین دونوں کا دعوی تھا۔چین اور بھارت کے درمیان 1962ء میں جو جنگ ہوئی تھی۔چین نے اکسائی چن پر مکمل قبضہ کر لیا تھا۔آخر میں یہاں لائن آف اکچول کنٹرول قائم ہوئی۔ جسے LAC کا نام دیا گیا ہے۔ LAC دونوں فریقین نے مل کر طے نہیں کی بلکہ چین نے اپنے طور پر اسے طے کیا اور بھارت نے اپنے طور 1993ء میں چین اور بھارت کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ جس کے درمیان یہ طے پایا کہ فریقین ایک دوسرے پر فائر نہیں کریں گے۔ لداخ کا یہی علاقہ گلوان وادی کا ہے۔ جہاں سے اکسائی چن کی طرف راستہ جاتا ہے۔ اور یہاں سے قراقرم پاس کی طرف بھی راستہ جاتا ہے۔ جو پاکستانی زیر قبضہ سکردو اور گلگت بلتستان کی طرف جاتا ہے۔

بھارتی پیش قدمی

5 اگست 2019ء کو بھاتی لوک سبھا میں بھارتی قومی سلامتی کے مشیر امیت شاہ نے اعلان کیا کہ ریاست جموں وکشمیر کو ہم نے بھارت میں ضم کر دیا ہے۔ دفعہ 35A اور دفعہ 370 کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اب آزاد کشمیر، گلگت بلتستان اور اکسائے چن پر بھی قبضہ کریں گے۔چین نے اس پر اعتراض کیا۔مگر بھارت نے چین کو کوئی لفٹ نہ کرائی۔ بلکہ آگے بڑھ کر لداخ میں تعمیرات شروع کر دیں۔ بھارت نے بیک وقت 35 سڑکوں پر کام شروع کیا۔جو چین کے 3500 کلو میٹر مکمل بارڈر کو کور کر سکتی ہے۔تبت پر چین کے قبضے سے چین بھارت کا ہمسایہ بن گیا۔چین سے تبت تک رسائی صرف اکسائی چن کے راستے ہی ممکن ہے جہاں چین نے ایک کشادہ شاہراہ بنائی ہے بھارت صرف اسی لیے اکسائی چن پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ اس سے نہ صرف اکسائی چن کا علاقہ بھارت کے قبضے میں آئے گا بلکہ تبت کا راستہ بند ہونے کی وجہ سے تبت تک چین کی رسد اور کمک بند ہونے سے زمینی راستے سے تبت پر بھی قبضہ کیا جا سکتا ہے۔ بھارت کی طرف سے اکسائی چن کا علاقہ مشکل ترین جبکہ چین کی طرف سے آسان راستہ ہے۔ لداخ میں بھارت اور چین کی سرحد 320 کلو میٹر ہے۔بھارت نے لداخ سے اکسائے چن کے راستے پر ایک سڑک تعمیر کرنی شروع کی جو 255 کلومیٹر لمبی تھی۔ دریائے گلوان پر پل بھی بنایا۔ جس کا افتتاح وزیر دفاع راج ناتھ نے کیا۔چین نے اس پر اعتراض کیا۔ مقامی فوجی کمانڈروں کے درمیان مذاکرات ہوئے مگر بھارت نے ہٹ دھرمی اختیار کی۔ناچار مئی میں چین نے اپنے ہزاروں فوجیوں کے ساتھ آگے بڑھ کر LAC پر جو علاقہ چین اپنا کہتا تھا مگر 1962ء کی جنگ کے بعد وہ وہاں سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔اس پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔یہ لداخ میں تین جگہوں سے اندر آئے جو درج ذیل ہیں۔

ا۔ گلوان ویلی

اس وادی میں چین چار ہزار آدمی لے کر اندر آیا۔ یہاں اس نے بھارت کے زیر کنٹرول ایریا جہاں نئے بینکر سڑکیں اور مورچے زیر تعمیر تھے قبضہ کرلیا۔ یہ وادی اکسائے چن کا دروازہ ہے۔ یہاں ہی سے بھارت اکسائے چن کی طرف حرکت کر سکتا ہے۔ یہاں چار کلومیٹر کے علاقے میں متعدد پوسٹیں بھی بنائیں جو دریائے گلوان کے دونوں اطراف میں ہیں۔ ساتھ ہی اس پل پر بھی قبضہ کرلیا۔ جسکا راج ناتھ نے افتتاح کیا تھا۔

۲۔ پینگانگ

یہاں سے چین کی فوج اندر داخل ہوئی۔ یہاں پر ایک جھیل بھی ہے۔ پہاڑ میں فنگر بنی ہوئی ہیں۔ بھارت کا دعویٰ ہے کہ فنگر ایک سے فنگر آٹھ تک اس کا قبضہ تھا۔ اور چین نے فنگر دو سے فنگر چار تک قبضہ کرلیا ہے۔ جھیل میں چین کی موٹر بوٹ گشت کر رہی ہیں۔ یہ خاصی لمبی چوڑی گہری اور خوبصورت جھیل ہے۔ چین کے گلوان دریا اور پینگانگ جھیل پر قبضے کی وجہ سے بھارتی فوج کی کئی پوسٹوں تک رسائی بند ہوگئی ہے۔ بند ہونے والی پٹرولنگ پوسٹوں میں 14-16-18 اور 19 شامل ہیں۔ لداخ میں چین کے ہزاروں فوجیوں کے مقابلے میں بھارتی فوج کی تعداد کم ہے۔ اس وجہ سے چین بھارتی فوج کو دبوچنے میں کامیاب رہا۔

چین نے گلوان اور دیپ سنگ کے میدانی علاقے میں چین کی فوج نے دو سڑکیں بنانی شروع کر دی ہیں۔ بھارت ان سڑکوں کو اپنے علاقے میں مداخلت قرار دے رہا ہے۔ پینگانگ سو سیکٹر میں چین کے فوجیوں نے فنگر فور کا علاقہ جو فنگر آٹھ تک 8 کلومیٹر تک محیط ہے۔ چینی فوج کے گلوان دریا کے دونوں اطراف پہاڑی چوٹیوں پر قبضہ کر کے گلوان وادی کے شمال میں ڈومیسانگ میں داخل ہوگئی ہے۔ اسی طرح اتر کھنڈ کے ہرسل سیکٹر میں بھی چینی فوج نے جو پیش قدمی والے علاقوں کو سپورٹ کرتی ہیں۔ پینگانگ سو سے دو سو کلومیٹر کے فاصلے پر چین نے اپنے لڑاکا جہازوں کے لئے ایئر پورٹ بنانا شروع کر دیا ہے۔ یہ 14 ہزار فٹ کی بلندی پر ایئرپورٹ ہے جو تبت کو بھی سپورٹ کرے گا۔ تبت میں اس کے علاوہ بھی تین ایئر پورٹ موجود ہیں۔ 2017ء میں ڈوکلام میں جھڑپ کے بعد تبت میں چینی جنگی جہاز ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ چین نے پچھلے عرصے تبت کے علاقے میں بڑی فوجی مشقیں بھی کی ہیں۔ جن میں جنگی طیاروں، راکٹ فورسز ایئر ڈیفنس، ریڈار جیمرز سمیت ہر شعبہ نے حصہ لیا ہے۔ یہ چین کی طرف بھارت کے لئے پیغام تھا۔

۳۔ ڈنچل

یہ علاقہ بھی لداخ کے جنوب میں واقع ہے۔ جہاں چینی فوج ساٹھ مربع کلومیٹر علاقے میں داخل ہوگئی ہے۔

۴۔ سقم

چوتھا علاقہ سقم کا ہے۔ جہاں چینی فوج نے پیش قدمی کی ہے۔ بھارت پاکستان میں سی پیک کے منصوبے پر چیخ پا تھا اور گلگت بلتستان میں سے گزرنے والی شاہراہ کو تباہ کرنے کی دھمکیاں دیتا رہتا ہے۔ بھارت اگر سکردو اور گلگت بلتستان کی طرف پیش قدمی کرے تو صرف وادی گلوان کی طرف سے ہی کر سکتا ہے۔ جہاں چین کا قبضہ ہو چکا ہے۔ لداخ میں وادی گلوان کے ساتھ دولت بیگ کا علاقہ جہاں سے قراقرم پاس کی طرف راستہ جاتا ہے اس پر قبضہ کر کے چین

نے سی پیک کو محفوظ کر لیا ہے۔ دولت بیگ جس کا آج کل دنیا بھر کے میڈیا پر چرچا ہے ہمالیہ اور قراقرم کے بلند و بالا پہاڑی سلسلوں میں ایک وسیع علاقہ ہے یہاں درجہ حرارت منفی 55 ڈگری سینٹی گریڈ تک گر جاتا ہے یہاں سے چینی سرحد 8 کلو میٹر اور انسانی آبادی 100 کلو میٹر دور ہے۔ یہاں بلتی نسل کے لوگ آباد ہیں۔ چین نے اس پر قبضہ کر کے سی پیک اور گلگت بلتستان کو محفوظ کر لیا ہے۔

حالیہ جھڑپیں

چین کی پیش قدمی کے بعد مئی سے اس وقت تک بھارتی فوج اور چینی فوج کے درمیان کئی ملاقاتیں ہوئیں مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا پھر یہ ملاقات کور کمانڈر سطح پر ہوئی مگر اس کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ مؤرخہ 15 جون 2020ء کو 16 بہار رجمنٹ کے کمانڈنٹ کرنل سنتوش اپنی یونٹ کے تقریباً ایک سو سے زائد افراد کو لے کر رات کے اندھیرے میں گلوان وادی چینی کیمپ میں داخل ہوئے۔ ان کا اصل منصوبہ کیا تھا یا ان کو کیا حکم ملا تھا اس کی پوری کوئی اطلاع نہیں مل سکی۔ اس علاقے میں بھارت اور چین کی فوجوں کے درمیان فائر نہ کرنے کا معاہدہ ہے۔ چین کا یہ فوجی کیمپ پہاڑ کی چوٹی پر تھا جہاں آگے انتہائی ڈھلوان تھی۔ جو دریائے گلوان پر ختم ہوتی تھی۔ چین نے یہاں پر مارشل آرٹ کے ٹرینڈ لوگ رکھے ہوئے تھے۔ جنہوں نے ڈنڈوں کے ساتھ بھارتی فوجیوں پر حملہ کیا اور زخمی ہونے والوں کو نیچے کھائی میں لڑھکا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ زیادہ تر زخمی اور ہلاکتیں اسی کھائی میں گرنے کی وجہ سے ہوئیں۔ بعض فوجی راستے میں ہی چٹانوں اور پتھروں سے ٹکرا کر مر گئے بعض دریا میں گر گئے۔ 20 کے قریب لوگ موقع پر مر گئے۔ جن میں کرنل سنتوش بھی شامل ہیں۔ 35 کے قریب انتہائی زخمی ہوئے باقی گرفتار ہو گئے۔ بھارت نے چین سے یہ جگہ خالی کرانے کے لئے اس کے بعد طاقت استعمال نہیں کی البتہ انڈیا نے دوست ممالک کے ذریعے بھی کوشش کی مگر کوئی کامیابی نہ ہو سکی۔ ڈپلومیٹک چینل بھی استعمال کیے مگر کچھ نہ ہو سکا۔

بھارت کی اہم مجبوری

جون، جولائی، اگست پہاڑی علاقوں کی فوج کا ڈمپنگ سیزن ہوتا ہے۔ سردیاں آنے سے قبل فوج سردیوں کے لئے اپنا ایمونیشن راشن جس میں گوشت دالیں لکڑی مٹی کا تیل وغیرہ جو انتہائی برف باری میں استعمال ہوتا ہے، وہ جمع کرتی ہے۔ جہاں تک سڑک جاتی ہے وہاں گاڑیوں کے ذریعے وہاں سے آگے خچروں سے۔ سیاچین اور اس طرح کے علاقوں میں یاک بھی استعمال ہوتے ہیں۔ بعض ایسے علاقے جہاں خچر یا یاک بھی نہیں جا سکتے وہاں مزدور لگائے جاتے ہیں۔ ایسے سیزن میں چین نے آگے بڑھ کر بھارت کا ڈیمپنگ سیزن متاثر کر دیا کئی علاقوں کے راستے یہاں سے ہو کر گزرتے تھے۔ چین نے سڑکیں بند کر دیں۔ ان میں ایک راستہ سیاچین کی طرف جانے والے راستوں میں سے ہے۔ سیاچین کا ایک سیکٹر جو پاکستانی فوج کے سامنے ہے وہ بلاک ہو گیا بھارت ہیلی کاپٹر استعمال کر سکتا ہے۔ مگر خرچہ بہت زیادہ آئے گا۔ یا تو بھارت کو کچھ علاقے خالی کرنے پڑیں گے۔ جہاں ہماری فوج لڑے بغیر قبضے کر سکتی ہے۔

چین بھارت کی حالیہ جھڑپ اور سی پیک کی حفاظت

چائنا پاکستان اکنامکس کاریڈور یعنی سی پیک کشمیر

کے علاقے گلگت بلتستان سے گزرتا ہے۔ جو پاکستان اور بھارت کے درمیان متنازعہ علاقہ ہے۔ بڑھتے ہوئے پاک چین تعلقات بھارت کے لئے پریشانی کا سبب بن گئے ہیں۔ سی پیک شروع ہونے سے چین کی خارجہ پالیسی میں پاکستان کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ جموں وکشمیر کے مسئلے پر چین نے ہمیشہ پاکستان کا ساتھ دیا۔ حالیہ چین بھارت ٹکراؤ سے دونوں ممالک کے تعلقات انتہائی کشیدہ ہوچکے ہیں۔ جو مستقبل قریب میں حل ہوتے نظر نہیں آتے۔ جب سے سی پیک شروع ہوا۔ بھارت نے پاکستان میں تخریب کاری میں اضافہ کردیا۔ تاکہ پاکستان اور چین کا یہ منصوبہ کامیاب نہ ہوسکے۔ لداخ سے آگے آکر دولت بیگ ایک بڑا مقام ہے۔ جہاں بھارت اپنا ملٹری بیس بنا رہا تھا۔ اس راستے سے وہ گلگت بلتستان کی طرف فوجی کارروائی کر سکتا تھا۔ ہمالیہ اور قراقرم کے بلند وبالا پہاڑی سلسلے کے درمیان ایک وسیع سرد میدان ہے۔ سردیوں میں یہ برف سے ڈھکا رہتا ہے۔ گرمیوں میں دو تین ماہ یہ خالی ہوتا ہے۔ یہاں سے چینی سرحد 8 کلومیٹر ہے۔ یہاں کوئی آبادی نہیں۔ قریبی انسانی آبادی تقریباً سو کلومیٹر دور منور کو گاؤں ہے جہاں بلتی نسل کے لوگ آباد ہیں چین نے دولت بیگ پر قبضہ کرکے بھارتی ملٹری بیس جو بن رہا تھا۔ اس پر قبضہ کرلیا۔ اسی وجہ سے دولت بیگ کا اس وقت ساری دنیا کے میڈیا پر چرچا ہے۔ دولت بیگ پر قبضہ کرکے چین نے سی پیک کو محفوظ کرلیا۔ جس کے خلاف سازشیں ہورہی تھیں۔

پہلے تو چین سی پیک کے معاملات پُرامن طریقے سے حل کرنا چاہتا تھا۔ جب بھارت کے مشیر قومی سلامتی امیت شاہ نے لوک سبھا میں علان کیا کہ جب ہم جموں وشمیر کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب پاکستان کے زیر قبضہ علاقہ آزاد کشمیر گلگت بلتستان اور اکسائے چن ہوتا ہے۔ امیت شاہ نے مزید کہا کہ اس میں کسی کو شک نہیں ہونا چاہیے کہ یہ سارے علاقے اور پورا جموں وکشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے۔ اس اعلان نے ہلچل مچادی۔ اسی وجہ سے چین نے اکسائے چن اور سی پیک کی حفاظت کی خاطر دولت بیگ، لداخ کے علاقوں پر قبضہ کیا۔ امریکہ اور چین کی سرد جنگ میں بھارت امریکہ کا فرنٹ مین ہے اور سی پیک کے خلاف سازش کا مین کردار بھی۔ ممکن ہے چین بھارت کو یہ پیغام دے رہا ہے کہ امریکہ کے زیادہ قریب جانے سے گریز کرے۔ بھارت پہلے ہی چین کی ابھرتی ہوئی طاقت کے دباؤ میں ہے۔

مغرب میں چین سی پیک کے ذریعے ترقیاتی منصوبوں میں مصروف ہے۔ امریکہ اسرائیل اور بھارت نہیں چاہتے یہ منصوبے کامیاب ہوں۔ وہ بھارت کو اکسا رہے ہیں کہ سی پیک کی شہ رگ شاہراہ ریشم میں رکاوٹ ڈالی جائے تاکہ آمدورفت رک سکے۔ بھارت نے امریکہ اور اسرائیل کے بہکانے پر سی پیک کو ایک ناجائز منصوبہ قرار دیا۔ جو چین کی ناراضگی کا سبب بنا۔ چین کی اس وقت سب سے بڑی ترجیح سی پیک کی تکمیل ہے۔ جس کے لئے وہ ہر طرح کے آپشن استعمال کرسکتا ہے۔ چین علاقے میں امن وامان کا خواہش مند ہے۔ تاکہ معاشی منصوبے بدامنی کا شکار نہ ہوں اسی وجہ سے دولت بیگ پر قبضہ کیا گیا۔ تاکہ یہ منصوبہ بھارت کی پہنچ سے دور ہوجائے۔

موجودہ حالات اور کشمیر کی آزادی

1962ء میں چین اور بھارت کے درمیان جو جنگ ہوئی وہ اسی اکسائی چن میں ہوئی تھی۔ اکسائے چن کا علاقہ 37550 کلومیٹر ہے۔ بھارت اور چین دونوں اس کے دعویدار ہیں۔ چین کا تبت کے

ساتھ سڑک کا رابطہ صرف اکسائے چن کے راستے ہی ہے۔ 1962 میں چین نے اس پر ایک شاہراہ بنائی جو چین اور تبت کو جوڑتی ہے۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان کارگل میں جو لڑائی ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یہ بنی کہ جموں وکشمیر کی مجاہدین کی تنظیم حزب المجاہدین کے سکردو کے کمانڈر عبدالاحد صاحب جو رہنے والے تو لداخ کے تھے۔ پھر ان کو سکردو کا کمانڈر بنایا گیا۔ سردیوں میں وہ اپنے دستے کے ہمراہ کارگل سے گزرے تو انہوں نے دیکھا کہ بھارتی فوج کے بنکر خالی پڑے ہیں۔ جب کہ اسلحہ کا ڈھیر بنکروں میں موجود ہے۔ انہوں نے باڈر لائن پر جاکر (NLI) ناردرن لائٹ انفنٹری بٹالین کے سی او کو بتایا۔ سی او نے ایک مسلح دستہ ان کے ہمراہ بھیجا۔ مسلح دستہ رات تک وہاں ٹھہرا مگر بھارتی فوج کا کوئی آدمی ،کوئی فرد یہاں نہ آیا۔ جس سے اندازہ ہوا ہے کہ بھارتی فوج سخت سردی میں کچھ پیچھے ہٹ جاتی ہے۔ مگر سڑک نہ ہونے کی وجہ سے اپنا زیادہ ایمونیشن یہاں ہی چھوڑ جاتی تھی۔ اب بھارت یہاں سڑکیں بنوا چکا ہے۔ اور ڈیفنس کو کافی مضبوط کر چکا ہے۔ پاکستانی فوج نے کرنل کیپٹن شیر خان شہید (نشان حیدر) کی قیادت میں سرینگر زوجیلا اور کارگل ،لیہ ہائی وے کو شمال کی جانب سے لداخ سے کاٹنے کی کوشش کی تھی۔ ہو سکتا ہے۔ کہ پاکستان دریائے سورہ کے آر پار قبضہ کر لیتا تو بھارت کے لئے تباہ کن ہو سکتا تھا۔ چونکہ اس شاہراہ پر امریکی تنصیبات تھیں جہاں چین کے خلاف امریکی تحقیقاتی ادارہ ہے۔ اس لئے امریکہ نے دباؤ دے کر نواز شریف سے وہ علاقہ واپس بھارت کو دلوایا تھا۔ اور وہ بھارت کے لئے فائدہ مند ثابت ہوا۔ اب چین گلوان ویلی میں دریا کے دونوں اطراف اونچی چوٹیوں پر بیٹھا ہے۔ اور داربک شیوک ،دولت بیگ، اولڈی ہائی وے کے عین اوپر چین کی چوکیاں بن چکی ہیں۔ جس کے بعد بھارتی فوج کو سب سیکٹر نارتھ سے جوڑنے والی یہ سڑک خطرے میں پڑ چکی ہے۔

یہ سیکٹر اب چین کے رحم وکرم ہے۔ اگر پاکستان بھی کارگل جنگ کی منصوبہ بندی پھر سے زیر غور لاتا ہے تو بھارت پاکستان اور چین کے درمیان پھنس سکتا ہے۔ چین کی فوج دریائے گلوان اور دریائے شیوک کے ملاپ کے مقام پر پہنچ چکی ہے۔ یہ مقام اس سڑک سے صرف ڈیڑھ کلومیٹر دوری پر ہے۔ یہ سڑک شیوک دریا کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ اور چین کی فوج اونچائی سے اس سڑک کو آرٹلری ، میزائلوں کی مدد سے نشانہ بنا سکتی ہے۔ اگر چین اس سڑک پر مستقل قبضہ رکھے اور مسلسل دباؤ میں رکھ لے اور چینی انجینئر علاقے کو اپنی حدود میں بنی سڑکوں سے جوڑ لیں اور چینی فوج کنکریٹ کے بینکر جو بنا رہی ہے تیار ہو گئے تو بھارت کے لئے کافی مشکل ہو گی۔ پاکستان کے لئے اس میں سیکھنے کے اسباب موجود ہیں گو کہ بھارتی فوج کے ساتھ کارگل میں بھی یہی ہوا تھا اس نے انٹیلی جنس ناکامی کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ اور یہ کہ شمالی کمانڈر نے غفلت کا مظاہرہ کیا ۔اس کے علاوہ 2013 میں دولت بیگ، اولڈی میں بھی بھارت نے لینڈنگ گراؤنڈ تیار کر لیا تھا۔ جس میں چین نے مداخلت کر کے قبضہ کر لیا۔

کشمیری عوام پر بھارت نے جنگ مسلط کر رکھی ہے۔ کشمیر سے بھارتی فوج لداخ کی طرف پیش قدمی کر رہی ہے۔ پاکستان کے لئے یہ موقع ہے کہ بھارت سے بات چیت کی زبان نہیں بلکہ توپ اور میزائل کی زبان سے بات کرے۔ اس صورتِ حال میں مناسب منصوبہ بندی کر کے بھارت کو جارحیت سے باز رکھا جا سکتا ہے۔

❁❁❁

منظور احمد تو اللہ تعالیٰ اور اُس کے حبیب کا منظورِ نظر تھا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی اس سعی جمیلہ کو منظور کر کے اُس کے درجات بلند کر دیئے ہیں۔

منظورِ نظر

ایک تاثر ایک کہانی

☆ حکیم مختار احمد ناز چکوال

صدقہ بلا کو کھا جاتا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''صدقہ دیا کرو، صدقہ مصیبتوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے لکڑی آگ کو''۔

صحابہ کرامؓ نے عرض کی یا رسولؐ کم از کم کتنی مقدار میں صدقہ دیا جانا چاہئے؟ فرمایا۔ اگر ایک دانہ کھجور کا بھی صدق دل سے کسی کو دے دو، کسی سے مسکرا کر مل لو تو یہ بھی صدقہ ہے۔ اگر اپنے کاموں سے گھر لوٹو یا بازار سے واپس آؤ اور اپنے گھر والوں کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور لاؤ۔ اگرچہ وہ چیز مقدار میں تھوڑی ہی کیوں نہ ہو، وہ بھی تمہاری طرف سے اللہ رب العزت کے ہاں صدقہ ہی کے طور پر منظور کی جاتی ہے۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یارسول اللہ صدقہ کے زیادہ حق دار کون ہیں۔ رحمت دو جہاںؐ نے فرمایا۔ تمہارے نادار اور مفلس عزیز رشتہ دار پھر تمہارے پڑوسی اور پھر دیگر مفلس و نادار لوگ۔

صحابہ کرامؓ میں اگر کوئی حضور خاتم النبیینؐ کی خدمت میں عرض کرتا کہ یارسول اللہؐ میں اکثر بیمار رہتا ہوں یا اتنا عرصہ ہوا میں نے شادی کی ہے لیکن اولاد کی نعمت سے محروم ہوں۔ آپؐ صدقہ دینے اور استغفار کرنے کی تلقین فرماتے۔

صدقہ کرنے کا ایک مختصر مگر پُرمغز واقعہ ایک عزیز نے سنایا۔ یہ واقعہ میں قارئین ''حکایت'' کے لئے پیش کر رہا ہوں۔

منظور احمد ایک فیکٹری میں ملازم تھا۔ بیوی سمیت گھر کے چار افراد کا کفیل تھا۔ اس کی اپنی کوئی جائیداد نہیں تھی سوائے چار مرلہ مکان کے۔ نہ ہی اس کا کوئی اور آمدنی کا ذریعہ تھا۔ تین بچے اور ایک بیوی تھی۔ فیکٹری کی تنخواہ سے اُن کی گزر بسر اچھی ہو رہی تھی۔ بیوی ایک سگھڑ اور صابر شاکر خاتون تھی، وہ ہر ماہ تنخواہ سے کچھ نہ کچھ بچا لیتی تھی۔ خاوند کو کہتی تھی کہ جب اتنی رقم اکٹھی ہو جائے گی تو تم موٹر سائیکل لے لینا۔ منظور احمد پہلے پہل چار کلومیٹر پیدل فیکٹری جاتا تھا، اب اس نے ایک سال قبل سائیکل لے لی تھی۔

فیکٹری کا مالک ایک خداترس انسان تھا، وہ

تقریباً ہر مذہبی تہوار اور دیگر کئی ایام میں فیکٹری میں لنگر نیاز کا اہتمام کرتا اور عیدین اور دیگر تہواروں پر تمام ملازمین کی حسب استطاعت مالی مدد بھی کرتا رہتا تھا جبکہ ہر سال فیکٹری کے ملازمین کے لئے حج کے لئے قرعہ اندازی بھی ہوتی تھی۔ خاکروب سے لے کر منیجر تک ہر بندہ بہت ہی دل لگا کر کام کرتا تھا۔ فیکٹری مالک تمام ورکروں سے خوش تھے اور تمام ورکر مالک سے مطمئن تھے۔

اس سال بھی فریضہ حج کے لئے قرعہ اندازی ہوئی اور منظور احمد کا نام نکل آیا۔ سب نے منظور احمد کو مبارکباد پیش کی۔ وہ مبارکبادیں تو وصول کر ہی رہا تھا لیکن وہ بجھا بجھا سا تھا۔

''لوگ تو حج کا نام سن کر خوش ہوتے ہیں لیکن پتہ نہیں اس کو کیا ہے چپ چپ سا ہے''۔ ایک ورکر نے دوسرے ورکر کے کان میں سرگوشی کی۔

''ہاں، ہے تو شریف آدمی اخلاق کا بھی اچھا ہے لیکن نماز کے قریب کم جاتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے کسمپرسی کا شکار ہے''۔ دوسرے نے کہا۔

''یہ بھی ٹھیک ہے لیکن جس روح نے عالم ارواح میں لبیک کہہ رکھی ہے وہ تو ضرور اس فریضہ سے بہرہ مند ہوں''۔

چہ میگوئیاں ہوتی رہیں اور فیکٹری مالک کو منظور احمد کے نام کی فائل بھجوا دی گئی۔ دوسرے دن مالک نے منظور احمد کو اپنے دفتر میں طلب کر لیا اور اسے مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ منظور احمد فلاں دن سے تم چھٹی پر ہو گے اور حج کی تیاری کرو۔

''صاحب! میں حج پر نہیں جاؤں گا''۔ منظور احمد کے یہ الفاظ مالک نے سنے تو حیران ہو گیا۔

''وجہ؟'' چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے پوچھا۔

''سر! وجہ کوئی نہیں ہے۔ آپ کسی اور کو بھیج دیں''۔

کافی بحث تکرار کے بعد بھی اس کے یہی الفاظ تھے سر میں حج پر نہیں جا سکتا۔ منظور احمد نے بغیر کوئی وجہ بتائے مالک پر واضح کر دیا۔

''بدنصیب ہے''۔ جس نے سنا یہی کہا۔ ''اسے کسی کی بددعا ہے''۔

فیکٹری کے مالک نے منیجر کو کہا کہ دوبارہ قرعہ اندازی کراؤ اور منظور احمد کا نام بھی شامل کرنا۔ دوبارہ قرعہ اندازی میں پھر منظور احمد کا نام آ گیا۔

اب تو سب کی زباں پر یہی الفاظ تھے کہ جب تم کو بلاوا آ چکا ہے تو اب تمہیں ضرور جانا پڑے گا۔ مالک نے دوبارہ منظور احمد کو بلوایا اور پوچھا کہ اب بتاؤ کیا کہو گے؟

''سر! میں دو گزارشات کرنا چاہتا ہوں''۔ منظور احمد نے کہا۔ ''ایک یہ کہ کیا میرے حج پر جانے کے لئے زادِ راہ مہیا کیا جائے گا اور کیا مجھے میری تنخواہ پوری ملے گی؟'' منظور احمد نے پوچھا۔

''آپ کو زادِ راہ بھی ملے گا اور پوری تنخواہ بھی ملے گی''۔ مالک نے کہا۔

''تو پھر ٹھیک ہے''۔ منظور احمد نے کہا۔

منظور احمد حج کے لئے روانہ ہو گیا۔ مکہ مکرمہ میں تمام ارکان پورے کرنے کے بعد حجاج کرام کی روانگی مدینہ منورہ ہونے والی تھی کہ اچانک اس کی طبیعت خراب ہو گئی۔ قبل اس کے ہسپتال پہنچ پاتا روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ بیت اللہ کے سامنے جنازہ پڑھ کر سپردِ خاک کر دیا گیا۔ منظور احمد جانا نہیں چاہتا تھا لیکن اللہ کے حکم پر ملک الموت نے اس کی روح کو اس مقدس مقام پر قبض کرنا تھا اور اس کو وہاں کی مٹی نصیب ہونی تھی۔

فیکٹری اور منظور احمد کے گھر اطلاع پہنچ چکی تھی۔ فیکٹری کے مالک نے فیکٹری کے اندر ہی غائبانہ نماز جنازہ کا اہتمام کروایا اور شام کو منظور احمد کے دو دوستوں اور منیجر کو ساتھ لیا اور منظور احمد کے گھر کی طرف تعزیت کے لئے روانہ ہو گئے۔ راستے میں ایک ورکر جو منظور احمد کا بہت قریبی دوست تھا، اُس نے مالک کو بتایا کہ سر آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ منظور احمد حج پر کیوں جانا نہیں چاہتا تھا۔

''بتاؤ کیا وجہ تھی؟'' مالک نے کہا۔

''سر جی! بات یہ ہے کہ منظور احمد کی میرے ساتھ بہت گہری دوستی تھی''۔ اس نے کہا۔ ''ہمارا ایک دوسرے کے گھر کھلا آنا جانا تھا۔ منظور احمد کے گھر کے عقب میں دو میاں بیوی تین بچوں کے ہمراہ رہائش پذیر ہیں۔ تقریباً ایک سال قبل خاوند ایک حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا۔ چونکہ وہ ایک ٹرک ڈرائیور تھا، گھر کی گزر بسر ہو رہی تھی، ٹرک مالکان نے کفن دفن کا اہتمام کر دیا اور اس کی بیوہ کو چند ہزار روپے دے کر یہ کہہ کر ٹرخا دیا کہ ہم تمہاری مدد امداد کرتے رہیں گے لیکن بعد میں کسی نے حال احوال بھی پوچھنا گوارہ نہیں کیا۔ بیوہ جوان تھی اور بہت خوبصورت تھی چنانچہ گاؤں کے کئی منچلے جوانوں اور چند ایک سفید پوش بزرگوں نے مدد امداد کی آڑ میں تعلقات بڑھانے کی کوشش شروع کر دی۔ ایک رات کھانا کھانے کے بعد منظور احمد اور اس کی بیوی حال احوال پوچھنے ان کے گھر چلے گئے۔ تعزیت کے لئے تو وہ پہلے بھی کئی دفعہ جا چکے تھے۔ مرحوم ڈرائیور کی بیوہ سے تعزیت کی اور اُن کا حال احوال اور گزر بسر کے بارے میں پوچھا تو ڈرائیور کی بیوہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ منظور کی بیوی اور منظور نے اُسے تسلی دلاسہ دیا اور کہا۔ بہن فکر نہ کرو، اللہ تعالیٰ بہترین رزق دینے والا ہے۔

> اگر آپ کا رب آپ سے ناراض ہو اور استغفار سے بھی کام نہ بنے تو اس کی مخلوق کو خوش کرنے کی کوشش کریں۔

''میں اس لئے نہیں رو رہی کہ میں بھوکی مر جاؤں گی''۔ بیوہ نے کہا۔ ''بلکہ میں تو اس لئے رو رہی ہوں کہ امداد کرنے کے لئے آنے والے مردوں کی زیادہ تعداد مجھے کسی اور نظر سے دیکھ رہی ہے۔ وہ میری امداد کرنے کے بہانے مجھ سے دوستی اور تعلقات بڑھانا چاہتے ہیں''۔

''بہن! تم فکر نہ کرو، تم اپنے آپ کو مضبوط کر لو تو کوئی تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا''۔ منظور احمد نے کہا اور اپنی بیوی کو گھر چلنے کا اشارہ کیا۔ اٹھتے ہوئے منظور احمد نے کہا ہم آپ کے پاس آتے رہیں گے۔ دونوں میاں بیوی گھر آ گئے۔ منظور احمد نے بیوی سے کہا کہ جو تم نے میرا موٹر سائیکل خریدنے کے لئے رقم رکھی ہوئی ہے وہ کتنی ہے؟

''کوئی پانچ چھ ہزار روپے ہوں گے''۔ بیوی نے کہا۔

''وہ رقم لے آؤ''۔ منظور بولا۔

بیوی اندر گئی اور ایک خاکی رنگ کا بڑا سا لفافہ پکڑے آ گئی اور منظور کے سامنے رکھ دیا اور کہا گنتی کر لو منظور احمد۔ گننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لفافہ اٹھاؤ اور اس میں جو بھی ہے وہ اس بیوہ کو دے آتے ہیں۔ منظور احمد نے کہا۔ بیوی نے کوئی پس و پیش نہ کی اور دونوں نے پھر جا دروازہ کھٹکھٹایا۔ بیوہ نے دروازہ کھولا، صحن میں جا کر منظور نے بیوہ کو لفافہ پکڑایا اور کہا۔ اس میں کچھ روپے ہیں، یہ اپنے ایک بھائی اور بہن کی طرف سے قبول کر لو۔ آئندہ بھی آپ کا یہ بھائی آپ کی مدد کرتا رہے گا۔ بیوہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے

فرمانِ رسول ﷺ

ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ اس پر ظلم نہ کرے، نہ ہونے دے۔ جو شخص اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت پوری کرے گا۔ جو کسی کی مصیبت دور کرے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کی مصیبتوں میں سے ایک مصیبت دور فرما دے گا اور جو کسی کے عیب چھپائے گا، اللہ قیامت کے دن اس کے عیب چھپائے گا۔

لگی۔ منظور احمد نے اس کے سر پر دونوں ہاتھ رکھ دیئے، سر پر بوسہ دیا اور اس کے سر کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ منظور کی بیوی بھی بیوہ سے بغلگیر ہو گئی۔

صاحب جی! اب منظور کا یہ معمول تھا کہ وہ ہر ماہ کی تنخواہ سے نصف رقم اپنی بیوی کے ہاتھ بیوہ کو بھجوا دیتا تھا۔ بیوی اور بیوہ کو سختی سے منع کر رکھا ہے کہ کسی کو بالکل اشارتاً بھی نہ بتانا۔ بیوی کو کہہ رکھا ہے کہ جب بھی تم بیوہ کے ہاں جاؤ میری طرف سے اس کے سر کا بوسہ لینا اور کہنا یہ بھائی کے حصے کا بوسہ ہے۔ خود روزانہ رات کو گلی سے گزرتے ہوئے اس کے گھر پر نظر رکھتا تھا کہ کوئی لوفر لفنگا اسے تنگ نہ کرے۔ اس طرح کرتے ہوئے منظور احمد کو دو سال ہونے کو ہیں۔

''یہ بات میرے، اُس کی بیوی اور بیوہ کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں''۔ ورکر نے واقعہ مالک کو سناتے ہوئے کہا۔ مالک رومال سے آنسو پونچھے جا رہا تھا اور اس کے منہ سے صرف یہ الفاظ نکل رہے تھے۔

''واہ، منظور احمد واہ..... تو کتنا خوش نصیب تھا، ہم کتنے بدنصیب ہیں''۔ پھر اس نے ورکر سے کہا۔ ''یہ تو بتا کہ یہ تو سب ٹھیک ہے لیکن منظور احمد حج پر جانے سے انکار کیوں کر رہا تھا؟'' مالک نے استفسار کیا۔

''اُس کا خیال تھا کہ حج پر جانے سے اس کی تنخواہ رک جائے گی۔ بیوہ کو جب رقم نہیں ملے گی تو بیوہ کی آس ٹوٹ جائے گی۔ دوسرا اس کے گھر کی نگہبانی کرنے والا کوئی نہ ہو گا۔ یہ بات منظور احمد نے مجھ سے کہی تھی اور میں نے اسے تسلی دی تھی''۔ ورکر نے مالک کو بتایا۔

اتنے میں منظور احمد کا گھر آ گیا تھا۔ منظور احمد کی بیوہ اور اس کا ایک رشتہ دار مالک کا انتظار کر رہے تھے انہیں اطلاع مل چکی تھی۔ مالک کو الگ چھوٹی سی بیٹھک میں بٹھایا۔ مالک نے تعزیت کی فاتحہ پڑھی اور منظور احمد کی بیوہ سے مخاطب ہو کر کہا۔

''بہن ہماری طرف سے یہ تھوڑی سی کاوش ہے قبول کیجئے''۔ ایک لفافہ منظور کی بیوہ کو دیا اور کہا۔ ''ہر ماہ منظور احمد کی تنخواہ پوری کی پوری مع عیدین، الاؤنس اور دیگر مراعات باقاعدگی سے ملتی رہیں گی..... اور اگر آپ کو ناگوار نہ گزرے تو ایک بات کرنی ہے؟'' مالک نے کہا۔

''جی فرمایئے؟'' منظور کی بیوہ بولی۔

''آپ کی کوئی ہمسائی ہے جو بیوہ ہو گئی ہے۔ جتنی مراعات آپ کو ملیں گی اتنی ہی اُس کو بھی دی جائیں گی۔ ہم منظور احمد کی روایات کو جاری رکھیں گے لیکن وہ آپ تک پہنچ جایا کرے گی اور آپ نے حسب روایت ان تک پہنچا دینی ہیں۔ منظور احمد تو اللہ تعالیٰ اور اُس کے حبیب ؐ کا منظورِ نظر تھا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی اس سعی جمیلہ کو منظور کر کے اُس کے درجات بلند کر دیئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری بھی یہ چھوٹی سی نیکی مقبول و منظور فرمائے''۔

❀❀❀

طنزومزاح

نہیں اُلٹی اُلٹی چال

ائرہوسٹس آئی اور مجھے کولڈ ڈرنک پیش کیا۔ گلے کے پرابلم کے باوجود میں یہ حسین آفر ٹھکرانہ
سکا۔ اتنے خلوص اور پیار سے تو ایسی نازنین چوعرقہ بھی پیش کرتی تو کس کافر کو جرأت انکار تھی۔

☆ محمد ادریس انور کہوٹ

چکوال

یہ غالباً 1980ء کے اوائل کی بات ہے۔ میں سندھ میں او جی ڈی سی میں جاب کر رہا تھا کہ میرے ایک کزن نے ابوظہبی سے میرے لئے ورک پرمٹ (ویزہ) بھیج دیا۔ جاری سروس کو لات مار کر فوری طور پر گھر پہنچ گیا۔ کاغذی کارروائی مکمل کر کے اپنے ایک دوست اور کزن مظہر کہوٹ کو ساتھ لیا اور ابوظہبی کے لئے ٹکٹ حاصل کرنے ایک ٹریول ایجنٹ کے ہاں جا دھمکے۔ مذکورہ ٹریول ایجنٹ جس کا نام ناصر ہے، ہمارا ایک نہایت بے تکلف دوست تھا۔

ناصر نے میز پر پڑے کاغذات کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا (اُس وقت کمپیوٹر کا دور نہ تھا)، پروازوں کا شیڈول چیک کیا اور ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''ابوظہبی کے لئے فوری طور پر ڈائریکٹ فلائٹ تو دستیاب نہیں ہے، البتہ کونیکٹنگ (Conecting) فلائٹ مل سکتی ہے''۔

''وہ کیا ہوتی ہے؟'' میں نے بے صبری سے پوچھا۔

''بجلی کا کنکشن سنا ہے؟'' ناصر نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ''گیس کا اور ٹیلیفون کا کنکشن سنا ہے؟''

''یار! یہ سب تو سنا ہے مگر ان باتوں کا فلائٹ سے کیا تعلق؟'' میں جھنجھلا کر پوچھا۔

''لفظ کنکشن پر زور دو تو تمہیں سب سمجھ آ جائے گا''۔ ناصر نے اطمینان سے جواب دیا۔

میں کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اس کا منہ تکنے لگا۔

''ارے بے وقوف آدمی''۔ ناصر نے تیز لہجے میں کہا۔ ''اسلام آباد سے کراچی اور کراچی میں کچھ قیام کے بعد وہاں سے ابوظہبی کے لئے جو فلائٹ ملے گی اسے کونیکٹنگ فلائٹ کہتے ہیں''۔

''اچھا اچھا ٹھیک ہے''۔ میں نے شرمندہ سے لہجے میں کہا۔ ''اسی میں سیٹ کنفرم کرا دو..... مگر ذرا جلدی''۔

ناصر نے مختصر سی کارروائی کر کے اسلام آباد، کراچی، ابوظہبی کا ٹکٹ بنا دیا اور کرائے کے پیسے وصول کر کے اپنی میز کی دراز میں محفوظ کر لئے۔

''پرسوں تیس تاریخ کو شام پانچ بجے تم نے اسلام آباد ائرپورٹ پہنچ جانا ہے''۔ مزید تفصیل بتاتے ہوئے ناصر گویا ہوا۔ ''فلائٹ نمبر PK....... سات بجے کراچی کے لئے روانہ ہو کر تقریباً 9 بجے کراچی ائرپورٹ (پرانے) پر لینڈ کرے گی۔ تم جوں ہی ارائیول لاؤنج میں پہنچو گے وہاں پی آئی اے کے ایک کاؤنٹر پر ایک لڑکی بیٹھی ہوگی''۔

''اچھا؟'' میں نے بے حد اشتیاق سے کہا۔

''اُسے تمہارا سلام دوں''۔ میری زبان نہ رک سکی۔

''یار! ایک تو تم فضولیات میں وقت بہت ضائع کر دیتے ہو''۔ ناصر تنگ آ کر بولا۔ مزید کہنے لگا۔ ''اُسے صرف یہ ٹکٹ دکھانا وہ تمہیں ایک واؤچر بنا کر دے گی۔ جس ہوٹل کا نام بتائے گی اُس ہوٹل کی گاڑی باہر کھڑی ہو گی۔ گاڑی میں بیٹھ کر مذکورہ ہوٹل چلے جانا۔ بیرا دوڑا آئے گا اور تمہارا سامان لے کر کاؤنٹر پر جا کر تمہیں کمرہ دلوائے گا۔ کمرے کی چابی لے کر تمہیں مؤدبانہ انداز میں کمرے تک چھوڑنے آئے گا۔ کمرے میں داخل ہو کر اسے کچھ ٹپ (TIP) دے دینا۔ رات کا کھانا تمہیں ہوٹل سے بغیر کسی ادائیگی کے مہیا کیا جائے گا۔ صبح تمہیں جگا کر پی آئی اے کے حوالے کر دیا جائے گا۔ ناشتہ جہاز میں ملے گا اور کچھ......؟''

''یار! ایسا نہیں ہو سکتا...... کہ......'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے مدھم سے لہجے میں کہا۔ ''کہ ہوٹل والے تین چار دن مزید میری میزبانی کا شرف حاصل کریں؟''

''بالکل نہیں''۔ ناصر خشک سے لہجے میں بولا۔ ''اب جاؤ، شاباش! مجھے دوسرے کلائنٹس کو بھی اٹینڈ کرنا ہے۔ جیسے کہا ہے ویسا ہی کرنا''۔

میں اور مظہر بھائی واپس آ گئے۔ روانگی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ مقررہ دن، مقررہ وقت پر مظہر مجھے اسلام آباد ائرپورٹ پر ڈراپ کرنے آیا اور وقت رخصت رازدارانہ انداز میں کہنے لگا۔

''بورڈنگ کارڈ لیتے وقت کاؤنٹر والی گڑی سے کہنا۔ 'پلیز! ونڈو سیٹ دے دیں''۔

''اس سے کیا ہو گا؟''

''بڑا مزہ آئے گا، باہر کے نظارے بھی Enjoy کرنا''۔

مظہر سے الوداعی ملاقات کر کے ڈیپاچر لاؤنج میں داخل ہوا۔ پی آئی اے کے کاؤنٹر پر واقعی ایک چندے آفتاب، چندے ماہتاب حسینہ براجمان تھی۔ مظہر والی نصیحت یاد آ گئی مگر ساتھ یہ دھڑکا بھی لگا کہ کہیں محترمہ بُرا نہ مان جائیں، ٹکٹ آگے بڑھایا اور ساتھ ہی جھجکتے ہوئے کہا۔

''پپ...... پلیز ونڈو سیٹ دے دیجئے گا''۔

محترمہ نے ایک لطیف سی مسکراہٹ میری طرف اچھالی، منہ سے کچھ نہ بولی۔ بقولِ ملکہ ترنم نور جہاں۔

''بھانویں بول تے بھانویں نہ بول چناں!
وِس اکھیاں دے کول چناں!''

بورڈنگ کارڈ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے جو کارڈ کو الٹ پلٹ کر دیکھا تو مجھے تو کہیں بھی ونڈو کا لفظ

نظر نہ آیا۔ بُرا سا منہ بنا کر انتظار گاہ میں آ کر بیٹھ گیا۔
مذکورہ فلائٹ کی روانگی کا اعلان ہوا تو تمام مسافروں نے ہمراہ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا اور تیزی سے مسافروں کی بھیڑ میں گھس گیا کہ کہیں پائلٹ مجھے یہاں چھوڑ کر جہاز اُڑا نہ لے جائے۔ باہر کھڑی بس میں سوار ہو کر جہاز کے قریب جا اترے۔

''باپ رے باپ......'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''اتنا بڑا جہاز...... بندے تو کیا اس کے نیچے سے تو گاڑی بھی گزاری جا سکتی ہے''۔

میں نے جہاز کے نیچے کچھ لوگوں کو اِدھر اُدھر جاتے دیکھ کر دل ہی دل میں کہا۔ میں نے جہاز کو اتنے قریب سے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

دیگر مسافروں کے ہمراہ میں بھی لائن میں لگ گیا۔ سیڑھیاں طے کر کے جہاز کے داخلی دروازے پر پہنچا تو ایک حورِ عرب نے ایک دلفریب سی مسکراہٹ کی پھوار برسا کر السلام علیکم کہا۔

''وعلیکم السلام...... ورحمتہ اللہ و برکاتہٗ......'' میں نے پورے طور پر اسلامی جذبے سے سرشار ہو کر سلام کا جواب دیا۔

محترمہ کے اس طرزِ استقبال سے میں بے حد متاثر ہوا۔ کرائے کے آدھے پیسے تو یہیں پورے ہو گئے۔ آگے بڑھا تو ایک اور حسینۂ عالم نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور مسکرا کر میرا بورڈنگ کارڈ طلب کیا۔ کارڈ دیکھ کر مجھے میری سیٹ تک پہنچایا اور ایک قاتلانہ سی مسکراہٹ لبوں پر بکھیرتے ہوئے بولی۔

''سر! یہ ہے آپ کی سیٹ''۔

سر نے بڑی عجلت میں اپنی سیٹ سنبھالی جو کہ واقعی جہاز کی کھڑکی سے منسلک تھی۔ محترمہ کا شکریہ ادا کیا۔ کرائے کے باقی پیسے بھی پورے ہو گئے اور بقیہ سفر مفت میں پڑ گیا۔

میں نے جہاز کا اندرونی ایٹ موس فیئر (سوری مجھے اس کا اردو متبادل لفظ نہیں مل رہا) بے حد خوشگوار سا محسوس کیا۔ زندگی میں پہلی بار یہ سعادت نصیب ہوئی تھی۔

میرے دماغ میں ایک پنجابی نغمے کے بول گونجنے لگے۔

''میں اُڈی اُڈی جاواں ہوا دے نال''

جہاز کے رسم و رواج پورے ہونے کے بعد جہاز نے اڑان بھری۔ مظہر نے صحیح کہا تھا باہر کے مناظر دیکھ کر میں بے حد محظوظ ہوا۔ میری مثال اس دیہاتی کی سی تھی جو پہلی بار شہر میں آیا ہو اور رنگا رنگ روشنیاں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا ہو۔

کچھ دیر بعد ایک اور ائرہوسٹس آئی اور مجھے کولڈ ڈرنک پیش کیا۔ گلے کے پرابلم کے باوجود میں یہ حسین آفر ٹھکرا نہ سکا۔ اتنے خلوص اور پیار سے تو ایسی نازنین چوعرقہ بھی پیش کرتی تو کس کافر کو جرأت انکار تھی، لہرا کے پی گیا۔

مذکورہ مشروب کی لذت ابھی منہ سے زائل بھی نہ ہوئی تھی کہ ایک اور کرینہ کپور قسم کی شے آ گئی۔ لہجے میں دنیا جہان کا شہد گھول کر مخاطب ہوئی۔

''سر! آپ چائے لیں گے یا کافی؟''

''چچ...... چائے ہی...... ٹھیک رہے گی''۔ سر نے سٹپٹا کر جواب دیا۔ کافی کا نام ہی سنا تھا کبھی پینے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ یہ سوچ کر چائے کو ترجیح دی کہ پتہ نہیں کافی کیسے پی جاتی ہے۔

کہاں گھر میں بیگم کے ہاتھ سے بنی ہوئی چائے، جسے چائے کی بجائے چرائتہ کہنا زیادہ موزوں ہو گا اور تیوری پر بل پڑے ہوئے انداز میں چائے کی پیالی وصول کرنا اور کہاں یہ مہمان نوازیاں۔ ایسا محسوس ہوا کہ اعمال کی کوئی نیکی اللہ پاک کو بھا گئی

ہے اور بہشتِ بریں کا یہ ٹریلر دکھایا جا رہا ہے۔

''پس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟''

چائے کے ساتھ ٹرے میں چینی کی پڑیا اور ایک چھوٹا سا پیکٹ دیکھا۔ پیکٹ کھولا تو سمجھ نہ آئی کہ یہ کیک ہے یا بسکٹ وغیرہ چلو جو بھی ہے قبول ہے۔ اس انداز کی میزبانی میں تو کوارگندل بھی چونسہ آم کی پھانک سے بڑھ کر شیریں لگتی ہے۔ ایسے محسوس ہوا محترمہ ابھی کہہ دے گی کہ یہ دل آپ کا ہوا۔ کھا پی کر بڑے خلوص سے پی آئی اے کو دعائیں دیں اور ان لوگوں کو دل میں کوسا جو اپنی قومی ائرلائن میں کیڑے نکالتے ہیں۔

اعلان ہوا کہ ہم کراچی ائرپورٹ پر لینڈ ہوا چاہتے ہیں۔ جہاز لینڈ ہوا، دروازے کھلے اور مسافر باہر نکلنا شروع ہو گئے۔

لاؤنج میں پہنچے۔ نگاہوں کو چاروں سمت گھمایا نور کے ایک ہالے پہ نگاہ جم گئی۔ پی آئی اے کے ایک کاؤنٹر پر ایک قیامت ایستادہ تھی۔ سرو قد، آہو چشم، قندھاری انار کی مثل دہکتے رخسار، مالٹے کی قاشوں جیسے لب... میرا خیال ہے اتنا ہی کافی ہے۔ علامہ اقبالؒ بقید حیات ہوتے تو یہی کہتے ''یہ چار عناصر ہوں تو بنتی ہے پی آئی اے کی گراؤنڈ ہوسٹس''۔ میں سحر زدہ انداز میں اس دہکتے شعلے کی جانب بڑھا۔ قرب پہنچا تو موصوفہ نے کاؤنٹر کی اوٹ سے اپنا دستِ حنائی نکال کر میری طرف بڑھایا۔ میں نے بھی جواب آں غزل کے طور پر ایسا ہی کیا۔ محترمہ کے درخشاں چہرے سے مسکراہٹ کی لہریں معدوم ہو گئیں اور قہر و غضب کی بجلیاں لپکنا شروع ہو گئیں۔

''یااللہ، خیر!'' میں نے دل میں کہا۔ ''مجھ سے کیا خطا سرزد ہو گئی؟''

''ٹکٹ پلیز!'' محترمہ نے ایک خنک سی سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ایسا محسوس ہوا محترمہ سیاچن کے محاذ سے تازہ تازہ وارد ہوئی ہیں۔

''اوہو..... اچھا!'' میں نے سٹپٹا کر کہا۔ کم بخت زبان پھسل گئی۔ ''میں سمجھا آپ نے ہاتھ مانگا ہے''۔ میں زیرِلب بڑبڑایا۔

''کیا کہا آپ نے؟'' اس نے خشمگین نظروں سے گھور کر پوچھا۔

''کک..... کچھ..... کچھ نہیں''۔ میں نے بوکھلا کر جواب دیا اور جلدی سے ٹکٹ کے ساتھ پاسپورٹ بھی آگے بڑھا دیا۔

''اس کی ضرورت نہیں''۔ اس نے پاسپورٹ واپس دھکیلا، لہجہ بدستور جارحانہ ہی تھا۔

ٹکٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پاس پڑی ہوئی ایک ٹیب پر کچھ لکھنا شروع کر دیا۔ لکھائی مکمل ہوئی تو مبینہ واؤچر میری طرف بڑھاتی ہوئی بولی۔

''باہر ہوٹل مڈوے کی گاڑی کھڑی ہے، اس میں بیٹھ کر ہوٹل جائیں اور صبح بروقت ڈیپارچر لاؤنج میں پہنچ جائیں''۔ لہجے میں بدستور مارشل لاء کی مہک رچی بسی تھی۔

میں ایک ٹھنڈی سی سانس لے کر رہ گیا۔ عادت سے مجبور ہو کر خود ہی جو پنگا لیا تھا۔ میری مثال اُس خچر کی طرح بن گئی جس نے ایک بم کو دولتی جھاڑ دی تھی۔ میں نے اس ہدایت نامے پر حرف بحرف عمل کیا۔ ٹریول ایجنٹ ناصر نے بھی کچھ اسی قسم کے پند و نصائح کئے تھے۔ مذکورہ ہوٹل پہنچ کر استقبالیہ پر ''رپورٹ'' کی۔ کمرے کی چابی لی، بیرے سے بیگ اٹھوایا اور کمرہ نمبر 302 کے روبرو پہنچے۔

''یااللہ خیر!'' کمرے کا نمبر دیکھ کر لرزہ سا طاری ہو گیا۔ بیگ کمرے میں رکھا بیرے کو دس کا نوٹ پیش

کیا۔

"سر! کھانا ڈائننگ ہال میں کھائیں گے یا کمرے میں لے کر آؤں؟" بیرا نوٹ جیب میں ٹھونس کر مؤدبانہ انداز میں بولا۔

"ہال میں ہی ٹھیک رہے گا"۔ میں نے پُر وقار انداز میں جواب دیا۔

گراؤنڈ ہوسٹس کے مسموم اثرات زائل کرنے کی کوشش کی اور بیرے کی معیت میں ڈائننگ ہال میں داخل ہوا۔ ایسے محسوس ہوا جیسے کسی عربی شہزادہ کا ولیمہ ہے۔ انواع واقسام کے کھانوں سے پُر میزیں سجی ہوئی ہیں۔ مہمان بڑے صبر وتحمل سے اپنی اپنی پسند کے کھانے پلیٹوں میں ڈال کر پُر وقار انداز میں کھا رہے ہیں۔ میں نے بھی ایک میز سے پلیٹ اٹھائی اور اپنی پسند کا سالن ڈال کر ایک میز پر بیٹھ کر کھانا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی کولڈ ڈرنک بھی۔ کھانا کھا کر لمبی لائن لگی سویٹ ڈشز کے پاس جا کر پسندیدہ ڈش کے ساتھ بھرپور انصاف کیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ پتہ نہیں کب آنکھ لگ گئی۔

صبح بیرے نے دروازہ بجا کر آواز دی۔

"سر! اٹھ جائیں، آپ کی فلائٹ کا ٹائم ہو گیا ہے"۔

فوری طور تیار ہو کر ہوٹل کی گاڑی میں سوار ہو کر ائرپورٹ کے انٹرنیشنل ڈیپارچر لاؤنج میں پہنچ گیا۔ کل والا سبق دہرایا گیا۔ بورڈنگ کارڈ حاصل کرنے، امریگریشن کا دریا عبور کیا اور دیگر مسافروں کے ہمراہ انتظارگاہ میں بیٹھ گیا۔ کافی دیر بعد ہماری فلائٹ کی روانگی کا اعلان ہوا۔ حسب سابق ایک بس میں بیٹھ کر جہاز کے قریب پہنچے۔ یہ کم بخت جہاز تو گزشتہ روز والے سے بھی جسامت میں بڑا تھا۔ انسانی عقل پر دنگ رہ گیا کہ اتنی بڑی بلا کیسے ہوا میں تیرتی ہے۔ پہلے کی طرح مسکراہٹوں کی گل پاشی سے ہوتا ہوا اپنی سیٹ پر جو کہ ونڈو سیٹ تھی، براجمان ہو گیا۔ روانگی کے ضروری مراحل طے ہوئے اور جہاز نے اڑان بھری۔

دور ہوتی ہوئی ارضِ پاک پر نمناک آنکھوں سے آخری نگاہ ڈال کر آنکھیں بند کر لیں۔ کیا پتہ یہ پاک سرزمین دوبارہ دیکھنا نصیب ہو یا نہ ہو اور اگر نصیب میں ہو تو اپنے تمام پیاروں کے چہرے دیکھنے کو ملیں یا کچھ خاک کی چادر اوڑھ کر سو چکے ہوں۔ کل والا چلبلا پن آنکھوں کی نمی میں ڈوب گیا۔ ائرلائن کا بہترین ناشتہ بھی بے مزہ سا محسوس ہوا۔

تقریباً دو گھنٹے کی پرواز کے بعد جہاز نے ابوظہبی کے ائرپورٹ پر لینڈ کیا۔ باہر نکل کر سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے پہلی بار ایک غیر ملکی فضا میں ایک لمبی سی سانس لی۔ ایسے محسوس ہوا جیسے کوئی کہہ رہا ہو۔

"سہانی رات ڈھل چکی، نہ جانے تم کب آؤ گے؟"

پی آئی اے

طیارہ حادثہ کی رپورٹ جب اسمبلی میں پیش ہوئی تو انکشاف ہوا کہ پی آئی اے کیسے برباد ہوا۔

کل جہاز 32 اور پائلٹ 856 عدد۔ ان میں 262 پائلٹ میٹرک پاس اور جعلی لائسنس والے۔ 256 پائلٹس نے خود امتحان نہیں دیا بلکہ کسی اور نے ان کی جگہ امتحان دیا۔

یہ سب بھرتیاں سابقہ دور میں خورشید شاہ اور مشاہد اللہ خان کی سفارش پر ہوئیں۔ اب وہ کہتے ہیں کسی پائلٹ کو نہ نکالیں بلکہ ان کی تنخواہ آدھی کر دیں۔ واہ تیرے صدقے!

المیہ

شرافت ضیاء- اسلام آباد

کرپشن نے گرانی نے ہمیں اس طور لوٹا ہے
کوئی جتنا بھی سچ بولے یہی لگتا ہے جھوٹا ہے
بڑا جتنا لٹیرا ہے وہ اتنا ہی سیانا ہے
اسے معلوم ہے کہ کس طرح پیسہ بنانا ہے
کلرکوں بادشاہوں کے وہ سارے رنگ سمجھتا ہے
کسی سے کام کروانے کے سارے ڈھنگ سمجھتا ہے
تعلق مقتدر حلقوں سے کچھ ایسے بناتا ہے
انہی کے ساتھ عیدیں اور شبراتیں مناتا ہے
لٹیروں کا یہی ماٹو ہے کہ قسمت کھری کر لو
تجوری لوٹ کے اموال سے اسباب سے بھر لو
کہیں چینی کا چکر ہے کہیں بحران آٹے کا
انہیں کرنا نہیں آتا ہے سودا کوئی گھاٹے کا
انہیں یہ بھی خبر نہ تھی کہ کورونا سب کو آ لے گا
ہزاروں لوگ یوں بیٹھے بٹھائے مار ڈالے گا
بظاہر سرکشوں کے واسطے اک تازیانہ ہے
مگر اب زد میں اس کی آ چکا سارا زمانہ ہے
کسی کو بھی نہیں معلوم کب یہ جان چھوڑے گا
نہ جانے اور کتنوں کی ابھی گردن مروڑے گا
تمنا ہے کہ عصیاں کار نیکو کار بن جائیں
خزانہ لوٹنے والے دیانت دار بن جائیں

تنہائیاں

تنہائیوں کا مارا ہوا بوڑھا اقبال نہ جانے رات کے کس لمحے اپنی شمع کے پاس چلا گیا تھا۔ اپنی تنہائیاں آباد کرنے، اپنے دکھوں کا مداوا کرنے یا پھر اپنے اللہ سے یہ پوچھنے کہ اے خالق، اے مالک میری تخلیق میں ایسا کون سا راز تھا، تیری ایسی کون سی رضا شامل تھی کہ میں ساری زندگی تنہائیوں اور محرومیوں کا شکار رہا۔ یہ تنہائیاں میرے مقدر کے ماتھے کا جھومر کیوں بنی رہیں۔

جہلم

وہ ایک سرد ترین رات تھی۔ آسمان پر چھائے ہوئے سیاہ بادلوں نے اس سرد ترین رات کی سیاہی میں خوفناک حد تک اضافہ کر دیا تھا۔ اچانک ایک زوردار کڑاکے کے ساتھ بجلی چمکی جس نے کائنات پر چھائی ہوئی خاموشی اور تاریکی کا سینہ پل بھر کے لئے چاک کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی بادلوں کی مہیب گڑگڑاہٹ کے ساتھ ایک خوفناک دھماکہ ہوا۔ شاید کہیں قریب ہی کسی شجر، کسی حجر پر بجلی گری تھی۔ اس کے ساتھ ہی موسلادھار بارش شروع ہو گئی۔

''شمع لاج'' کے ایک سجے سجائے کمرے میں ستر سالہ اقبال، ماحول کی تمام تر ہولناکی سے بے نیاز اور بے خبر ایک صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے میز پر ایک بڑا سا کیک رکھا ہوا تھا جس کے گرد موم بتیاں روشن تھیں۔ وہ گاہے بگاہے نظریں اٹھا کر دیوار پر لگے ہوئے کلاک کو بھی دیکھ لیتا تھا۔ کچھ دیر کے بعد دیوارگیر کلاک کی سوئیوں نے بارہ کے ہندسے کو چھو لیا تو رات کے سناٹے میں کلاک کی ٹن ٹن نے رات کے بارہ بجنے کا اعلان کیا۔ بوڑھے اقبال نے نحیف و ناتواں آواز میں ''ہیپی نیو ایئر، ہیپی میرج میری اینورسری ٹو می'' کو ایک لے کی صورت میں بڑے سُر سے گایا۔ پھر ایک ایک موم بتی کو پھونک مار کر بجھاتے ہوئے قریب ہی پلیٹ میں رکھی ہوئی چھری سے کیک کاٹنا شروع کر دیا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے کٹے ہوئے کیک کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور دیوار پر لگی ہوئی ایک قد آور فریم والی تصویر کی طرف بڑھا۔

''شمع!'' اس نے کیک کا ٹکڑا اس کے منہ کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ ''شادی کی سالگرہ مبارک ہو۔ دیکھ لو میں باوجود تنہا رہ جانے کے ابھی تک اس خوبصورت دن کو نہیں بھولا۔ جب تم نے بہار بن کر میری ازدواجی زندگی میں رعنائیاں بھر دی تھیں۔ تمہیں یاد ہے ناں، آج ہی کے دن ہم نے اپنی ازدواجی زندگی کی شروعات کی تھیں۔ برس ہا برس پہلے وہ اکتیس دسمبر ہی کی رات تھی جب حجلۂ عروسی میں ہم نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر زندگی بھر ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے کے عہد و پیماں کئے تھے۔ ایک دوسرے کے سنگ سنگ جینے مرنے کے قول و قرار کئے تھے۔ مگر پھر تم ایک روز مجھ سے اچانک ناطہ توڑ کر دور بہت دور نیلے آسمانوں کے اس پار، اس دیس کو چلی گئیں جہاں سے لوٹ کر کوئی بھی نہیں آیا کرتا۔ شمع! تمہارے بغیر میرا دل نہیں لگتا اس بھری دنیا میں۔ تمہارے بغیر میری زندگی ویران ہو چکی ہے۔ میں زیست کے تپتے ہوئے لق و دق صحرا میں تنہا رہ گیا ہوں۔ تم کیوں مجھ سے اتنی دور چلی گئی ہو...... کیوں چلی گئی ہو؟'' اتنا کہہ کر وہ واپس صوفے کی طرف مڑا، کیک کا ٹکڑا پلیٹ میں رکھا اور صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

☆❀☆

محبتیں تاوان مانگتی ہیں، خراج چاہتی ہیں، قربانیاں طلب کرتی ہیں اور اقبال نے بھی اس راہِ محبت میں اپنے عمر بھر کے رشتوں کا بھرپور تاوان دیا تھا۔ خراج کے نام پر اپنے گھر کی چاردیواری کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔ قربانیوں کے نام پر ماں باپ، بہن بھائی، عزیز و اقارب سب کچھ درگاہِ محبت کی بھینٹ چڑھا دیئے تھے اور شادی کے تیسرے مہینے ہی شمع کا ہاتھ تھام کر تن کے تین کپڑوں کے ساتھ اپنے والدین کے حکم پر وہ گھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا تھا جس گھر کے چپے چپے سے اس کی یادیں وابستہ تھیں۔ گھر سے باہر نکلتے وقت اس نے مڑ کر اس گھر اور گھر کے مکینوں کی طرف آخری بار دیکھا تھا۔ جن کے چہروں پر فتح مندی کی چمک تھی۔ اپنے مقاصد کی کامیابی کی روشن

مسکراہٹیں تھیں۔ سوائے اس کی بڑی بہن ساجدہ اور ماں کے جن کی ڈبڈبائی آنکھوں اور اداس چہرے پر ایک ہی التجا تھی۔

"نہ جاؤ، اقبال! اس گھر سے یوں نہ منہ موڑو کہ ہم تمہاری شکل کو بھی ترس جائیں"۔ ایک لمحے کے لئے وہ ڈگمگا بھی گیا مگر اپنے والد کے تلخ الفاظ اس کے کانوں میں گرم گرم پگھلے ہوئے سیسے کی طرح آگ لگا رہے تھے۔

"دفع ہو جاؤ اس گھر سے اور جب زمانے بھر کی اور در در کی ٹھوکریں کھا کر واپس لوٹنے کی کوشش کرو گے تو یہ سوچ لینا کہ اس گھر کے دروازے تم پر آج کے بعد ہمیشہ کے لئے بند ہو چکے ہیں"۔ ان الفاظ نے اس کے عزم کو اور بھی پختہ کر دیا اور اس نے دل ہی دل میں یہ عہد کر لیا کہ وہ مرتے مر جائے گا مگر اپنی لاش کو بھی اس گھر واپس نہ لانے کی وصیت کر جائے گا اور اس نے تھکے تھکے قدموں سے شمع کے ہمراہ اس گھر کی دہلیز پار کر لی تھی۔

اقبال کی کہانی بھی عجیب تھی۔ بہن بھائیوں میں وہ تیسرے نمبر پر تھا۔ وہ جب پیدا ہوا تو بتانے والے بتاتے ہیں کہ اس کی ماں دردِ زچگی سے بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کی رنگت اپنے بہن بھائی کی نسبت کالی تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی اور سرخی مائل تھیں۔ وہ عام بچوں کی طرح پیدائش کے وقت رویا نہیں تھا بلکہ ٹکر ٹکر ہر ایک کو دیکھ رہا تھا۔ یہ کیس زچگی اگرچہ سرکاری ہسپتال میں ہوا تھا، جہاں تجربہ کار اور پڑھی لکھی لیڈی ڈاکٹرز اور نرسیں وغیرہ تھیں۔ پڑھے لکھے لوگ عام طور پر توہم پرست نہیں ہوتے، وہ عملی لوگ ہوا کرتے ہیں اور ہر بات کی اللہ کے بعد سائنسی توجیہات پیش کیا کرتے ہیں۔ مگر اقبال کی غیر معمولی پیدائش اور حرکات و سکنات کو مدِنظر رکھتے ہوئے تمام میڈیکل سٹاف جو وہاں موجود تھا، اپنی تمام تر روشن خیالی اور عملی نظریات کو بھول کر اس بات پر متفق تھا کہ یہ بچہ عادات و اطوار کے لحاظ سے ایک غیر معمولی بچہ ہے۔ کسی نے کہا۔ اس کی ماں اس کو جنم دیتے ہوئے شدتِ دردِ زہ سے بے ہوش ہو گئی ہے۔ یہ بچہ ساری زندگی پیار و محبت کے لئے ترستا رہے گا۔ بعض نے یہ فتویٰ صادر کر دیا کہ یہ بچہ پیدائش کے وقت خلافِ معمول رویا نہیں اس لئے یہ تاعمر آزردہ اور پریشان پریشان رہے گا۔ کچھ نے متفقہ طور پر یہ رائے دے دی کہ یہ بچہ تاعمر عدم توجہ تنہائیوں اور محرومی محبت کا شکار رہے گا۔ یوں وہ ننھا منا سا اقبال جسے دنیا میں آئے ابھی گھنٹہ بھر بھی نہ ہوا تھا، اس کے متعلق منفی پروپیگنڈا شروع ہو گیا اور وہ معصوم سا بچہ گرد و پیش سے بے نیاز اردگرد کے ماحول اور لوگوں کو ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔

وہاں پر موجود لوگوں کی باتوں، ان کی سوچوں، ان کے خیالات میں کس حد تک سچائی تھی، وہ تو مستقبل کے دھندلکوں کی دبیز تہہ میں چھپی ہوئی تھی۔ مگر میڈیکل کی تاریخ میں ایسی غیر معمولی پیدائش کے ہزارہا واقعات اور کیس ہوتے ہیں اور بعد میں آنے والے حالات یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ ان تمام غیر معمولی صورتِ حال میں جنم لینے والوں نے بھی بالکل نارمل انسانوں کی طرح ہی بھرپور زندگی گزاریں غیر معمولی پیدائش کی "نحوست" ان کے مستقبل پر کسی طور پر بھی اثر انداز نہیں ہوئی۔

اقبال نفرتوں اور محرومیوں کے اس گھٹے ہوئے حبس زدہ ماحول میں کسی خودرو پودے کی طرح پروان چڑھنے لگا۔ شیر خواری کے دور میں ہی اسے نظر انداز کیا جانے لگا۔ وہ سارا سارا دن بستر پر لیٹا اپنے ننھے منے ہاتھ پاؤں چلا چلا کر کھیلتا رہتا۔ بھوک لگتی تو رو رو کر اپنی بھوک کا اعلان کرتا۔ ماں کے کانوں میں اس کے رونے کی آواز پڑتی تو وہ گھر کے کام کاج میں مصروف

بھوک بھی ہوتی اُڑ کر پہنچ جاتی اور اسے بڑے پیار سے چپکے چپکے سے لگا کر اس کی بھوک مٹانے کا انتظام کرتی۔ دیکھ کر یہ سب جو بہن بھائی اس کے رونے سے بے زار ہوئے رہتے۔ مگر ماں کہیں دور ہوتی تو وہ روتا رہتا مگر کسی کے کانوں پر جوں تک نہ رینگتی۔ بسا اوقات وہ بستر پر اپنی گندگی میں لتھڑا ہوا پڑا رہتا، مکھیاں اس پر بھنبھناتی رہتیں مگر پاس سے گزرتی ہوئی بہن یا بھائی اس پر ایک نفرت بھری نگاہ ڈال کر آگے بڑھ جاتے۔ باپ کی نفرت تو پہلے دن سے ہی عیاں تھی۔ پیدائش سے لے کر اب تک باپ نے اُسے اٹھانا تو درکنار اس پر شفقت اور پیار کی نظر بھی ڈالنا گوارہ نہ کیا تھا۔ کالی رنگت اور واجبی سے نقوش ہی اس بے چارے کے لئے وبال بن گئے تھے۔ پورے گھر میں صرف ماں کی محبت بھری گود ہی تھی جو اس کی جائے پناہ تھی۔ باپ، بہن اور بھائی اسے انتہائی تمسخرانہ انداز میں دیکھتے ہوئے اس پر پھبتیاں کستے رہتے، مگر ماں کے لئے تو اقبال اس کی آنکھوں کا تارا تھا۔ دنیا جہاں سے زیادہ خوبصورت تھا۔ مائیں ایسی ہی ہوا کرتی ہیں۔ اولاد کے لئے ان کے حقوق کے لئے زمانے بھر سے لڑ بھڑ جایا کرتی ہیں۔ اپنے لہو کے رشتوں کے سامنے سینہ سپر ہو جایا کرتی ہیں۔

نفرت اور محرومیوں کے اس ماحول میں اقبال پروان چڑھتا ہوا زندگی کے مدارج طے کرتا رہا۔ سکول جانے کا وقت آیا تو اسے ایک سرکاری سکول میں داخل کروا دیا گیا جبکہ اس کی بہن اور بھائی شہر کے معروف ترین اور مہنگے پرائیویٹ سکول میں پڑھ رہے تھے۔ بہترین یونیفارم میں ملبوس جب وہ بڑھیا قسم کے سکول بیگ شانوں پر لٹکائے ہاتھوں میں ٹفن اور پانی کی بوتلیں لئے ایک شانِ تفاخر سے گھر سے نکلتے تو ملگجے سے یونیفارم میں ملبوس، ایک بڑے سے کپڑے کے تھیلے میں سکول کی کتابیں ڈالے جس میں رومال میں بندھی ہوئی روٹی اور اس پر رکھا ہوا اچار لے کر سکول جاتا ہوا اقبال انہیں بڑی معصوم اور عجیب سی نظروں سے دیکھا کرتا۔ جب تک اس کا شعور بیدار نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے، ایک ہی ماں باپ کی اولاد کے درمیان ہونے والے اس امتیازی سلوک کو بالکل بھی نہ سمجھ پایا۔ مگر بڑھتی ہوئی عمر اور ہر سال طے کرتے ہوئے تعلیمی مدارج کے ساتھ ساتھ جب اس کا پختہ ہوتا شعور بھی بھرپور انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا تو اس کو اس امتیازی سلوک کا کچھ کچھ ادراک ہونے لگا۔ آٹھویں کلاس تک پہنچتے پہنچتے اس کے مزید دو بھائی اور دو بہنیں بھی اس دنیا میں آ چکے تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اقبال کے علاوہ اس کے سارے بہن بھائیوں کی رنگت صاف اور نقوش انتہائی جاذب نظر تھے جبکہ اقبال کی رنگت کالی اور نقوش بھی بس واجبی سے تھے۔ گھر میں آنے والا ہر فرد جب اقبال کو نظرانداز کر کے اس کے بہن بھائیوں کو پیار کرتا تو وہ دل مسوس کر رہ جاتا۔ اگر کبھی فرطِ محبت سے بے تاب ہو کر چھوٹے بہن بھائیوں کو پیار کرنے کی کوشش کرتا تو اس کی بڑی بہن، بھائی اور دوسرے چیل کی طرح اس پر ٹوٹ پڑتے۔

”چھوڑ دے اس کو کہیں اپنی سیاہ رنگت کا داغ اس کو بھی نہ لگا دینا“۔ کہتے ہوئے اسے پرے دھکیل دیتے۔

اس امتیازی اور دہرے سلوک نے اسے بے حد حساس بنا دیا۔ جب تک اس کا شعور ابھی اتنا پختہ نہیں ہوا تھا کہ نفرتوں کے ان توہین آمیز رویوں کو سمجھ سکتا، وہ یوں ہی تنہا تنہا اور بولایا بولایا ہر اُس رشتے کی طرف لپکتا رہا، دوڑتا رہا، کھنچا چلا جاتا رہا جہاں سے اسے محبت اور پیار کی ذرا سی بھی امید کی کرن دکھائی دیتی۔

مگر جب اس کا شعور بیدار ہوا تو اسے احساس ہو گیا کہ رشتوں اور انسانوں کے بحر بیکراں میں وہ تنہا تنہا اور لاوارث سا انسان ہے جس کے نصیبوں میں تنہائیاں ہی تنہائیاں ہیں، محرومیاں ہی محرومیاں ہیں اور اس کے نصیبوں میں پیار و محبت کا امرت ہے ہی نہیں۔ اسے انسانوں کے سیل رواں میں زندگی کا یہ سفر یوں ہی تشنہ تشنہ اور سب سے کٹ کر گھٹ گھٹ کر طے کرنا ہو گا۔

اقبال نے اپنی ان تشنگیوں، اپنی ان محرومیوں کا مداوا یوں کر لیا کہ اس نے کہانیوں کے اصنام تراشنا شروع کر دیئے۔ حساسیت، درد اور حد سے بڑھی ہوئی محرومیاں انسان کو یا تو مایوسیوں کے ان اندھیروں میں دھکیل دیا کرتی ہیں۔ جہاں وہ اپنے تمام تر دکھوں کا مداوا کرنے کے لئے اپنے آپ کو مختلف منشیات کے نشے میں یوں غرق کر دیتا ہے کہ سب غم، سب درد سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور یا پھر انتقام کی اندھی راہ پر چلتے چلتے وہ جرائم پیشہ استاد بن جاتا ہے۔ جو اپنی ہر محرومی، اپنے ہر درد کا ازالہ بندوق اور ریوالور کی گولی کے زور سے کرنا چاہتا ہے۔ مگر اقبال نے ان دونوں میں سے کوئی بھی راہ نہ چنی بلکہ آٹھویں جماعت سے ہی قلم کا تیشہ سنبھال لیا اور کہانیوں کے اصنام تراشنا شروع کر دیئے۔ بس گھر کے ایک تنہا گوشے میں بنی ہوئی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں اپنے تصورات کی دنیا آباد کر لی۔ اس خیالی دنیا میں وہ اپنے آپ کو دنیا کا خوبصورت ترین اور طاقتور ترین انسان سمجھتا جو ایک مافوق البشر مخلوق کی طرح ہر کس و ناکس کے دکھ درد دور کرنے کے لئے ہر شے کے سامنے سینہ سپر ہو جایا کرتا ہے۔ وہ اپنی اس خیالی دنیا میں اپنی ہر محرومی، اپنی ہر تشنگی، اپنے ہر دکھ کا مداوا فرضی اور افسانوی انداز میں سوچتا اور پھر انہیں الفاظ کا پیراہن پہنا کر صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا کرتا۔

اتنی چھوٹی سی عمر میں اور محبتوں اور پیار کی پیاس نے اس کے قلم میں وہ درد سمو دیا تھا کہ جب اس کی کہانیاں ملک کے مشہور جرائد میں شائع ہوتیں تو ایک تہلکہ مچ جاتا۔ لوگ اپنے اس محبوب قلمکار کو روبرو دیکھنا چاہتے تھے، اس سے ملنا چاہتے تھے۔ اس کے ہاتھ، اس کا وہ قلم چومنا چاہتے تھے جن سے ایسے ایسے شاہکار تخلیق ہوا کرتے تھے۔ مگر اپنے سگے بہن بھائیوں، اپنے باپ کے تمسخرانہ رویوں، آتے جاتے، اٹھتے بیٹھتے اس پر طرح طرح کی پھبتیاں کسنے، اس پر توہین آمیز جملے اور آوازے کسنے کی بدولت وہ احساسِ کمتری کا شکار ہو چکا تھا۔ اسے انسانوں سے خوف آنے لگا تھا۔ اس کے دل میں یہ وہم اور ڈر بیٹھ چکا تھا کہ وہ دنیا کا بدصورت ترین انسان ہے۔ جسے دیکھ کر بچے خوف کھا جاتے ہیں۔ بڑے، جوان، بوڑھے سب کے سب اپنی تفننِ طبع کے لئے اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ تضحیک کا نشانہ بناتے ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ کسی بھی فنکار کے پرستاروں، اس کے چاہنے والوں نے اپنے محبوب فنکار کا ایک خیالی پیکر، ایک تخیل بنایا ہوتا ہے جو انتہائی خوبصورت، بے حد حسین ہوا کرتا ہے۔ اس کی کہانیوں کے پرستاروں نے بھی اس کا ایک خیالی پیکر تراشا ہو گا اور وہ اپنی کہانیوں کے ہیروز کا جو خاکہ پیش کیا کرتا تھا ان کو پڑھ پڑھ کر تو لوگوں نے اسے کسی یونانی سنگتراش کا انتہائی حسین و جمیل مجسمہ سمجھ لیا ہو گا۔

وہ اپنے پڑھنے والوں کا یہ حسین بھرم ہمیشہ قائم رکھنا چاہتا تھا۔ وہ اس خوبصورت پیکر کو کرچی کرچی نہیں ہونے دینا چاہتا تھا جو اس کے مداحوں، اس کے پڑھنے والوں، اس کے پرستاروں نے اس کا تراش رکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جس دن اس کے مداحوں نے اسے روبرو دیکھ لیا، ان کے تصورات میں تراشا ہوا خوبصورت بت ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔ اس کے مداح،

پیار اور محبت سے معانقہ کرنے لگا جیسے وہ برسوں کے شناسا ہوں۔ اس کے گروپ میں تقریباً پچاس لڑکے تھے جو پاکستان کے مختلف صوبوں اور علاقوں کے باسی تھے وہ ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے، غیر شناسا تھے، اس سے پہلے وہ کبھی ملے بھی نہ تھے، مگر ایک ہی دن میں ایک دوسرے سے یوں گھل مل گئے تھے جیسے برسوں کے شناسا ہوں، مدتوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں، برسا برس سے ایک ساتھ رہ رہے ہوں۔

دوسرے دن ان کی عسکری ٹریننگ شروع ہو گئی۔ انہیں چار پانچ انسٹرکٹرز مختلف قسم کے حربی ضربی اور عسکری فنون سکھایا کرتے۔ ایک آدھ انہیں چست، پھرتیلے اور چاق و چوبند بنانے کے لئے پریڈ (جسے فوجی زبان میں ڈرل کہا جاتا ہے) اور فزیکل ٹریننگ جسے فوجی زبان میں (پی ٹی) کہا جاتا ہے، کروایا کرتے۔ فارغ وقت میں وہ مختلف کھیلوں میں حصہ لیتے۔ رات کو کھانے سے فارغ ہو کر وہ دن بھر کی محنت مشقت اور بھاگ دوڑ سے تھک کر چُور چُور بدن سے بستر پر لیٹتے اور پھر اگلے دن علی الصبح ہی اٹھ کر تیار ہو جاتے۔ اقبال کو جو چیز سب سے اچھی لگی وہ یہاں کا ڈسپلن اور آپس میں اتفاق اور پیار تھا۔ یہاں ہر کوئی اپنا کام خود کرتا تھا۔ کوئی کسی کو ملازم یا نوکر نہیں سمجھتا تھا۔ کوئی کسی کا مذاق نہیں اڑایا کرتا تھا۔ سب ایک دوسرے سے انتہائی عزت اور پیار سے پیش آتے تھے۔ اقبال کو یوں لگا جیسے وہ گھر کے دوزخ سے نکل کر جنت میں آ گیا ہو۔ چھٹی والے دن تمام لڑکے دو دو، چار چار کے گروپ میں اجازت لے کر قریبی شہر یا مارکیٹ چلے جاتے۔ کچھ ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ کرتے، بعض لڑکے ٹریننگ سینٹر کی کینٹین پر چلے جاتے اور چائے پینے کے ساتھ ساتھ اپنی پسند کے گانے سنتے رہتے۔ مطالعہ کے شوقین لڑکے سینٹر کے ریکریشن روم میں چلے جاتے جہاں اخبارات، رسائل اور دیگر کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے۔ ٹی وی کے شوقین ٹی وی سے دل بہلاتے مگر اقبال چھٹی والے دن اپنے لکھنے لکھانے کا شوق پورا کرتا رہتا۔

محبتیں اور پیار انسان میں اعتماد پیدا کیا کرتے ہیں۔ اقبال گھر والوں کی نفرت اور گھٹے ہوئے ماحول کی وجہ سے احساسِ کمتری کا شکار ہو چکا تھا۔ باپ کی شفقت اور بہن بھائیوں کے تضحیک اور توہین آمیز رویے نے اس سے اس کا اعتماد چھین لیا تھا۔ مگر آرمی کے ماحول، عسکری ساتھیوں کے پیار و محبت، اساتذہ اور دیگر سینئر آفیسرز کی طرف سے دی جانے والی عزت سے اس کا اپنی ذات پر اعتماد بحال ہونے لگا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جب ایک سال کی کڑی اور تھکا دینے والی ٹریننگ سے فارغ ہو کر اپنی مقرر کردہ یونٹ میں پہنچا تو وہ ایک بااعتماد سپاہی، ایک باوقار انسان اور بالکل ہی بدلا ہوا اقبال تھا۔ اس کی بکھری ہوئی مسخ شخصیت کہیں دور بہت ہی دور گم ہو چکی تھی۔ اب وہ ایک بارعب شخصیت والا آرمی کا تربیت یافتہ سپاہی تھا۔

ٹریننگ کے دوران وہ ایک دن کے لئے بھی گھر نہیں گیا تھا۔ نہ ہی اس نے تنخواہ کے پیسے گھر بھجوائے تھے۔ اس کا باپ ایک دو دفعہ اس کے ٹریننگ سینٹر میں آیا تھا اور پیسوں کا تقاضا کیا تھا مگر اس نے طریقے سے ٹال دیا تھا۔ نئی یونٹ میں پوسٹ کرنے سے قبل ٹریننگ سینٹر والوں نے انہیں ایک ایک ماہ کی چھٹی دی تھی۔

دن کے دو بج رہے تھے جب اقبال گھر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ہینڈ بیگ تھا۔ صاف ستھرے استری شدہ کپڑے پہنے، عسکری ٹریننگ کے مطابق گردن اکڑائے، سینہ تانے وہ بڑی شان سے چل رہا تھا۔ ماں اسے صحن میں ہی مل گئی۔ اس نے یوں

اچانک اقبال کو دیکھا تو فرطِ مسرت سے گنگ ہوگئی۔
''ماں!'' اس نے بیگ زمین پر رکھا اور آگے بڑھ کر تیزی سے ماں کے نحیف و ناتواں جسم کو اپنے بازوؤں میں لے لیا اور اس کے بوڑھے رخساروں پر بوسوں کی برسات کردی۔ ماں نے بھی اپنے کمزور بازو اقبال کے گرد حمائل کردیئے۔

اقبال کی آواز سن کر اس کا باپ اور دیگر بہن بھائی بھی اپنے اپنے کمروں سے باہر نکل آئے تھے۔ سب رسمی طور پر اقبال سے ملے۔ اقبال بھی ان سے سلام دعا کرنے کے بعد ماں کو لے کر اس کے کمرے میں چلا آیا۔

''ماں!'' اس نے ماں کے قدموں میں بیٹھتے ہوئے جیب سے پرس نکالا اور ماں کو دیتے ہوئے بولا۔ ''یہ میری پورے سال کی کمائی ہے۔ میں نے یہاں سے جاتے ہوئے یہ عہد کیا تھا کہ میں اپنی کمائی ہمیشہ آپ کے ہاتھ پر رکھا کروں گا۔ یہی وجہ تھی کہ ابو نے جب سینٹر میں آ کر مجھ سے پیسوں کا مطالبہ کیا تھا تو میں نے انہیں ٹال دیا''۔ ماں کی آنکھیں خوشی و مسرت سے بھر آئیں اور اس نے بیٹے کو ساتھ لپٹا لیا۔

اقبال ایک ماہ کی چھٹی گزار کر واپس اپنی یونٹ چلا گیا۔ اس ایک ماہ میں ہی ان کے باپ اور بہن بھائیوں کو احساس ہو گیا تھا کہ اب وہ پہلے والا اقبال نہیں رہا تھا جو ہمہ وقت ان کا ملازم بنا ایک مشین کی طرح ان کے حکم کی تعمیل میں جتا رہتا تھا۔ نہ بڑے بہن بھائی اس سے محبت اور شفقت کا برتاؤ کرتے تھے، نہ چھوٹے بہن بھائیوں کی نظروں میں اس کا احترام تھا... باپ کی نفرت اور بہن بھائیوں کے برتاؤ نے اس کی خوداعتمادی چھین کر اسے احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا تھا۔ مگر آرمی نے اسے احساسِ کمتری کے دباؤ سے نکال کر اعتماد کی دولت سے مالا مال کر دیا تھا۔ اب اقبال

ایک خود اعتماد انسان بن چکا تھا۔ اسے اپنی بات منوانے اور کرنے کا سلیقہ آ گیا تھا۔ چھٹیوں میں اقبال کے بہن بھائیوں نے اس پر پہلے کی طرح رعب اور حکم چلانے کی کوشش کی تھی مگر اس نے بڑے اعتماد اور پُروقار طریقے سے سمجھا دیا تھا کہ وہ اپنا کام خود کرنے کی عادت ڈالیں اور بڑے چھوٹے کا احترام سیکھیں۔

باپ تو پہلے ہی ناراض تھا کہ اس نے پیسے اسے دینے کی بجائے ماں کو کیوں دیئے۔ باپ کی ناراضی کا اقبال نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا۔ اس کی کل کائنات تو اس کی ماں تھی۔ ماں جس نے اسے جنم دیا تھا، ماں جو اس وقت بھی اس سے ٹوٹ کر پیار کرتی تھی جب وہ ابھی شیرخوار تھا اور غلاظت میں لتھڑا پڑا روتا رہتا، مکھیاں اس پر بھنبھنا رہی ہوتیں اور بہن بھائی اس سے نفرت سے گھورتے ہوئے وہاں سے گزر جاتے۔ ماں تو اس وقت بھی اس سے محبت کرتی تھی جب باپ اور بہن بھائیوں سمیت ہر کوئی اس سے نفرت کرتا تھا اور اب جبکہ وہ معاشرے کا ایک قابل عزت فرد بن چکا تھا، اب بھی ماں اس سے اور وہ ماں سے دنیا جہان سے بڑھ کر پیار کرتا تھا۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ وہ ماں کی پرستش کرتا تھا تو بے جا نہ ہوگا۔ اپنے بچپن کی طرح اس بار بھی اپنی ساری چھٹیاں وہ اپنی ماں کے کمرے میں ہی سوتا رہا تھا۔ رات کو اس کی آنکھ کھل جاتی تو ماں کے پاؤں کی طرف چلا جاتا۔ اس کے پاؤں چومتا، آنکھوں سے لگاتا، ماں کی آنکھ کھل جاتی تو وہ بڑے دلار سے کہتی۔ ''بالو! پتر سو جا''۔ اور وہ دھیرے دھیرے مسکراتا ہوا اپنے بستر پر چلا جاتا۔ گہری نیند میں اگر اسے ماں کی ہلکی سی بھی کھانسی کی آواز سنائی دیتی تو تڑپ کر اٹھتا اور پانی کا گلاس لے کر ماں کے سرہانے کھڑا ہو جاتا۔ بہن بھائی اور باپ اس کی اس کایا کلپ پر حیران تھے۔ مگر ماں اس کی اس تبدیلی پر بے حد خوش تھی۔ اس کے

> جن لوگوں کو ہم نے اپنی موت کا غم دے کر جانا ہے، کیوں نا ان کو زندگی میں کوئی خوشی دی جائے۔
> (واصف علی واصف)

بالو کو بالآخر جینے کا قرینہ آ گیا۔

وقت کا کارواں دھیرے دھیرے ماہ و سال کی طرف رواں دواں رہا اور کئی تبدیلیوں کے سنگ میل عبور کرتا رہا۔ اقبال کی بڑی بہن اور بھائی کی شادی ہو چکی تھی۔ اقبال بھی عسکری امتحانات پاس کرتا ہوا اب لانس نائیک بن چکا تھا۔ اس کا قلمی سفر بھی جاری و ساری تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ پہلے درد و الم کا سفیر تھا مگر اب اس کے قلم کا نشتر سماج کی جراحی کرنے لگا تھا۔ وہ ہر اس موضوع پر بڑے اعتماد سے قلم اٹھانے لگا تھا جس پر بہت کم مصنفین اٹھایا کرتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے مذکور ہوا کہ اقبال کی بڑی بہن ساجدہ اور بھائی تنویر کی شادی ہو چکی تھی۔ ساجدہ تو بیاہ کر اپنے گھر چلی گئی تھی اور تنویر کی بیوی فردوس اس گھر کی بڑی بہو کی حیثیت سے آ چکی تھی۔ جب تک ساجدہ کی شادی نہیں ہوئی تھی وہ ماں کے ساتھ گھریلو کام کاج سنبھالے ہوئے تھی۔ اس سے پہلے یہ سارے گھریلو کام اقبال کے ذمے تھے۔ اقبال آرمی میں چلا گیا اور ساجدہ اپنے گھر چلی گئی تو گھر کے سارے کام کاج کا بوجھ اقبال کی ماں فاخرہ پر آن پڑا، فردوس تو برائے نام ہی اس گھر کی ذمہ داری اٹھاتی تھی۔ دن چڑھے دیر سے اٹھنا صرف اپنے شوہر تنویر کا ناشتہ تیار کرنا اور اس کے کام پر جاتے ہی دوبارہ بستر میں گھس جانا۔ یہی اس کا روزمرہ کا معمول تھا۔ بعض اوقات تو تنویر بھوکا پیاسا ہی کام پر چلا جاتا۔ اقبال کے سارے چھوٹے بہن بھائی سکول کالج جانے والے تھے۔ اس لئے ان کے لئے اور اقبال کے والد شبیر کے لئے ناشتہ وغیرہ فاخرہ کو

ہی تیار کرنا پڑتا۔ اس کے بعد برتن دھونا، گھر کی صفائی ستھرائی، ہانڈی روٹی سب کچھ فاخرہ کو ہی کرنا پڑتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کام کے بوجھ سے فاخرہ بیمار رہنے لگی چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ اقبال کی شادی کر دی جائے۔

یہ 31 دسمبر کا دن تھا جب شمع بہار بن کر اقبال کی زندگی میں داخل ہوئی۔ اقبال اور شمع نے ایک دوسرے کو شادی سے پہلے دیکھا تک نہیں تھا۔ بس تصویروں کا دونوں گھرانوں نے تبادلہ کیا تھا اور تصویریں تو بس تصویریں ہوا کرتی ہیں۔ بے جان گونگی بہری تصویریں جنہیں فوٹوگرافر اپنے ہنر سے یوں رنگ حسن دے دیا کرتے ہیں کہ چاہیں تو کسی بھوت چڑیل کو بھی یوسفِ ثانی اور قلوپطرہ بنا دیا کرتے ہیں۔

اقبال اگرچہ بچپن والا عدم اعتماد اور احساسِ کمتری کا شکار اقبال نہیں تھا۔ عسکری ماحول اور ٹریننگ نے اسے انتہائی پُراعتماد اور سلجھا ہوا انسان بنا دیا تھا۔ مگر حجلۂ عروسی میں جانے سے ڈر رہا تھا۔ بچپن کی بھول بھلیوں میں کہیں دبکا ہوا عدم اعتماد کا خوف اسے اب بھی ایک خوفناک عفریت کی طرح ڈرا رہا تھا۔ ”اگر شمع نے بھی اس کی کالی رنگت، اس کے بھدے نقوش دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیا تو؟“ یہ وہ سوال تھا جو اسے حجلۂ عروسی میں جانے سے روک رہا تھا۔ پھر اچانک اس کے ذہن میں اس کے انسٹرکٹر کے الفاظ گونجے۔

”میرے عزیزو!“ ٹریننگ کے دوران ایک روز ان کا استاد ان کے گروپ کو کہہ رہا تھا۔ ”عروسِ وطن کا پیار، اس کی محبت اتنی بے لوث، اتنی بے غرض ہوتی ہے کہ وہ اپنے محبت کرنے والوں کے صرف جذبات دیکھا کرتی ہے، اس کو کسی کی رنگت، کسی کے نقوش، کسی کے قد و قامت سے قطعاً کوئی غرض نہیں ہوتی۔ وہ ہر اس شخص کے لئے اپنی بانہیں، اپنی آغوش وا کر دیا کرتی ہے جو اس کے تحفظ، اس کی عزت، اس کی حرمت کے لئے موت کے سامنے بھی سینہ سپر ہو جایا کرتا ہے۔ اسے نہ کسی کے عہدوں سے غرض ہوتی ہے، نہ خوبصورتی سے پیار۔ اسے نہ کسی کی بدصورتی کی پروا ہوتی ہے اور نہ ہی کسی کے حسن و جمال کی ہوس۔ اسے صرف اور صرف غرض اس سے ہوا کرتی ہے جو اس کی حفاظت کے لئے جان پر کھیل جایا کرے۔ اس لئے میرے عزیزو! اپنی رنگت، اپنی نسل، اپنے خدوخال پر کبھی بھی مت اترانا۔ صرف اور صرف سچا پیار، بے لوث جذبے ہی پائیدار بندھن کے حامل ہوا کرتے ہیں۔ ورنہ ایک سیاہ فام اور موٹے نقوش والے حبشی حضرت بلالؓ کبھی بھی بارگاہ رسالتؐ اور کائنات عرشِ معلیٰ کے مالک کی بارگاہ میں اتنے معتبر نہ ہوتے کہ اگر انہوں نے اذان نہیں دی تو مالک ارض و سما نے صبح کو طلوع ہونے سے روک دیا“۔

یہ وہ الفاظ تھے جنہوں نے اقبال کے اعتماد کی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دیا اور وہ حجلۂ عروسی میں داخل ہو گیا۔ اس عزم، اس عہد کے ساتھ کہ شمع اس سے محبت کرے نہ کرے، اسے چاہے یا نہ چاہے، وہ ہمیشہ اس سے محبت کرتا رہے گا، اس کی عزت کرتا رہے گا، اسے بھرپور تحفظ دیتا رہے گا اور اگر خدانخواستہ اس کی حرمت پر کبھی کوئی حرف آیا تو وہ اس کی حرمت کی خاطر ہر کس و ناکس کے سامنے سینہ سپر ہو جایا کرے گا۔

سرخ عروسی جوڑے میں ملبوس شمع پلنگ پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے شرم و حیا سے سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ اقبال نے ایک نظر اسے دیکھا تو دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ وہ تو اس کے خوابوں اس کے خیالوں سے بھی زیادہ حسین تھی۔ معصوم سا چہرہ، پتلے پتلے گلاب کی پنکھڑیوں جیسے نرم و نازک ہونٹ، میدے اور سیندور سے گندھی ہوئی رنگت، ستواں ناک، موٹی موٹی خوابیدہ سی آنکھیں جنہیں وہ حیا کے بوجھ تلے جھکائے بیٹھی

تھی۔ ''سبحان اللہ!'' بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ ''شمع! میں اپنے رب کی اس عطا کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے کہ اس نے تمہاری صورت میں مجھے کسی بہت بڑی نیکی کا اتنا خوبصورت انعام دیا۔ میں اپنے رب کے حضور شکرانے کے دو نفل ادا کرلوں پھر ہم اپنی اس خوبصورت زندگی کا آغاز کریں گے''۔ اتنا کہہ کر اقبال واپس مڑا اور وضو کرنے چلا گیا۔

اس نے حجلۂ عروسی میں ہی شکرانے کے نوافل ادا کیے۔ اپنی خوشگوار اور پُرمسرت ازدواجی زندگی کے لئے دعا مانگی اور جائے نماز کو تہہ کر کے ایک طرف رکھتے ہوئے سمٹی سمٹائی شمع کے پاس آ بیٹھا جو اس کی آہٹ پا کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی حیا آلود آنکھیں ابھی تک جھکی ہوئی تھیں۔

''شمع!'' اقبال نے اس کے نرم و نازک حنائی ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے انتہائی سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''میں ایک سیدھا سادہ فوجی ہوں اور فوجی ہمیشہ سیدھی، سچی اور کھری بات کیا کرتے ہیں۔ وہ منافق اور دوغلے نہیں ہوا کرتے، جو بات دل میں ہوتی ہے اس کا برملا اظہار کر دیا کرتے ہیں۔ تم نے شاید میری تصویر دیکھی ہوگی، روبرو ہم پہلی بار ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔ تصاویر اکثر جھوٹ بولا کرتی ہیں۔ پروفیشنل فوٹوگرافرز اپنے فن کے زور سے کسی بھی بدصورت سے بدصورت چہرے کو یوسف ثانی اور قلوپطرہ بنا سکتے ہیں اور چاہیں تو کسی بھی مونالیزا اور یونانی دیوتاؤں جیسے شاہکاروں کو بدصورتی کا وہ چلتا پھرتا اشتہار بنا دیں کہ لوگ نفرت سے اس پر تھوتھو کریں۔ آج اگر تم شرم و حیا کی وجہ سے مجھے نظر بھر کر نہیں دیکھ رہیں تو اتنا ضرور کہوں گا کہ ذرا سی ہمت کر کے مجھے صرف ایک سرسری سی نظر دیکھ لو تو تمہیں احساس ہو جائے گا کہ میں کسی صورت میں تمہارے قابل نہیں تھا۔

تم مجھ سے محبت کرو یا نہ کرو، میں تمہیں کبھی بھی مجبور نہیں کروں گا۔ اس لئے کہ محبتیں خیرات یا بھیک میں نہیں ملا کرتیں۔ یہ محبت کی توہین ہوا کرتی ہے۔ پیار اور محبت تو ایک بے اختیار اور آفاقی جذبہ ہوا کرتا ہے جو رنگ، روپ، نسل، عمر غرضیکہ ہر شے سے بالاتر ہوتا ہے۔ تم اس رشتے کو نہ نبھانا چاہو گی تو بھی میں تم سے زور زبردستی نہیں کروں گا۔ میں ساری باتیں، ساری وجوہات اپنے اوپر لے کر تمہیں اس رشتے سے آزاد کر دوں گا لیکن جب تک ہمارا رشتہ قائم ہے، میں ہر سانس، ہر پل تمہارا ساتھ نبھاہوں گا۔ تمہاری عزت کروں گا اور ہر کس و ناکس سے تمہاری عزت کراؤں گا۔ ہم فوجی اپنے وطن کی مٹی سے بے حد پیار کرتے ہیں۔ اتنا پیار کہ اس کی حفاظت کے لئے ہنستے کھیلتے جان ہار جایا کرتے ہیں۔ میں بھی تم سے بے حد پیار کرتا ہوں، تمہیں اپنے آپ سے زیادہ چاہتا ہوں، ٹوٹ کر تم سے محبت کرتا ہوں۔ بیشک تم میری زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دور بہت دور بھی چلی جاؤ گی۔ تب بھی میں تم سے پیار کرتا رہوں گا۔ ناتہ نہ ہونے کے باوجود زندگی کی آخری سانسوں تک تمہیں چاہتا رہوں گا اور تمہاری عزت، تمہاری حرمت کے لئے اگر جان پر کھیلنا پڑا تو کھیل جاؤں گا۔ یہ ایک فوجی کا تم سے وعدہ ہے سچا اور بے لوث وعدہ''۔

شمع نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تو نہیں مگر جھجکتے شرماتے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور بولی۔ ''اقبال! میں نے آپ کا ہاتھ تھام لیا ہے اور اسے اب موت ہی چھڑا پائے گی''۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے احمریں لب اقبال کے ہاتھ کی پشت پر رکھ دیئے۔ اس رات وہ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ایک دوسرے سے حال دل کہتے رہے۔ اقبال نے پیدائش سے لے کر اب تک کی کوئی بات، کوئی راز کچھ

بھی تو نہیں چھپایا تھا۔ گھر والوں کا نفرت آمیز سلوک، باپ، بہن بھائیوں کے ہوتے ہوئے تنہائیوں کا سفر، ماں کی مجبور محبت اپنی خیالی دنیا میں کھو کر کہانیوں کے اصنام تراشنا غرضیکہ اس نے اپنی زندگی کا ہر ہر گوشہ، ہر ہر پہلو اس کے سامنے آشکار کر دیا تھا۔ شمع نے بھی اس سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں رکھا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کی ماں بچپن ہی میں فوت ہو گئی تھی۔ وہ سوتیلی ماں اور سوتیلے بہن بھائیوں کے زیر سایہ پلی بڑھی جوان ہوئی۔ باپ اپنی دوسری بیوی بچوں میں یوں گم ہوا کہ اسے یہ یاد بھی نہ رہا کہ اس کی پہلی بیوی سے اس کی اکلوتی اولاد، اس کی بیٹی شمع نام کے وجود کا کوئی بشر بھی تھا۔ سوتیلی ماں اور سوتیلے بہن بھائیوں نے اس کے ساتھ اگر سوتیلے پن کا سا سلوک نہ کیا تھا تو اسے محبت اور پیار بھی نہ دیا۔ نتیجتاً وہ تنہائی پسند ہو گئی۔ اسے نصابی کتابوں کے ساتھ ساتھ رسالوں سے بھی دلچسپی ہو گئی۔ اس کے پاس پیسے تو ہوتے نہیں تھے کہ رسالے خرید سکتی، اس کی سہیلی افشاں کے ابو کی سٹیشنری کی ایک بہت بڑی دکان تھی جہاں ملک بھر سے شائع ہونے والے معیاری رسالے بھی آیا کرتے تھے۔ افشاں وہاں سے پڑھنے کے لئے رسالے لے آیا کرتی، خود بھی پڑھتی اور اسے بھی پڑھنے کے لئے دیتی۔ شمع نے شرماتے ہوئے یہ بھی بتا دیا کہ ان میں سے کئی رسالوں میں اقبال کی کہانیاں بھی شائع ہوا کرتی تھیں۔ چنانچہ اسے اقبال کی درد میں ڈوبی ہوئی کہانیاں اچھی لگنے لگیں۔ اتنی اچھی کہ وہ نہ صرف اس کی پرستار بن گئی بلکہ اس سے خاموش محبت بھی کرنے لگی۔ مگر مشرقی لڑکی ہونے کے سبب وہ اپنی یک طرفہ محبت کا اظہار نہ کر سکی۔

شمع نے یہ انکشاف بھی کیا کہ اقبال کی ڈاک جس دُکان کی معرفت آیا کرتی تھی وہ افشاں کے والد

کی دُکان تھی اور ایک روز وہ اپنی سہیلی افشاں کے ساتھ دُکان میں ہی تھی، جب اقبال وہاں اپنی ڈاک دیکھنے آیا تھا۔ تب افشاں نے اسے کہنی سے ٹہوکا دیتے ہوئے بتایا تھا کہ یہ اقبال ہے شہر کا مشہور و معروف رائٹر۔ شمع جو اس کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر اس کی خاموش پرستار تھی، اسے رُوبرو دیکھ کر ایک انجانے سحر میں گرفتار ہوگئی۔ اس کی سیاہ رنگت اور بھدے سے نقوش ہونے کے باوجود اس کو اپنے من مندر کا دیوتا مان لیا۔ اس کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر اس سے محبت تو وہ پہلے ہی کرتی تھی، اب رُوبرو دیکھ کر اپنے دل کے سنگھاسن پر بٹھا لیا۔ یہی تو محبت کا فلسفہ ہوا کرتا ہے۔ یہی تو پیار کے کلیے قانون ہوتے ہیں۔ کوئی حسین اور خوبصورت ترین چہرہ بھی آنکھوں کو نہیں جچتا اور کوئی بدصورت، سیاہ فام اور واجبی سے نین نقوش والی صورت آنکھوں میں یوں سماتی ہے کہ پہلی ہی نظر میں دل اور روح کی گہرائیوں میں یوں اتر جاتی ہے کہ انسان ساری زندگی کے لئے اس سے روح کے بندھن باندھ لیا کرتا ہے۔

باتیں کرتے کرتے، ایک دوسرے کی سنگت میں انہیں وقت گزرنے کا احساس تک نہیں ہو رہا تھا۔ دیوار گیر گھڑی نے رات بارہ بجنے کا اعلان کیا تو وہ چونکے۔ ''شمع!'' اقبال نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''آج سال کا اختتام ہو چکا ہے اور نئے سال نے اپنا آغاز کر دیا ہے اور آج سے ہماری نئی زندگی شروع ہوئی ہے۔ ہمارا دونوں کا ماضی ایک دکھ بھرا اور محرومیوں سے لتھڑا ہوا دور تھا۔ آؤ آج ماضی کے ہر دکھ، ہر آسیب کو ذہن سے جھٹک دیں اور اپنی خوشیوں بھری زندگی کا آغاز کریں۔ اس عہد کے ساتھ کہ جو محرومیاں جو حسرتیں جو دکھ ہم نے جھیلے ہم اپنی اولاد پر ان کا سایہ تک پڑنے نہیں دیں گے۔ ہم انہیں اتنی محبتیں، اتنی شفقتیں، اتنا پیار دیں گے کہ ہماری طرح تنہائیاں کبھی

قابلیت

اصل ڈگریوں والے ''کریم'' اور ''اوبر'' کار چلا رہے ہیں، جعلی ڈگریوں والے جہاز اُڑا رہے ہیں اور بغیر ڈگریوں والے اسمبلیاں چلا رہے ہیں۔

بھی ان کا مقدر نہیں بنیں گی۔ ہم ان سے ہمیشہ ہمیشہ محبت کرتے رہیں گے۔ اپنے گھنیرے سائے تلے انہیں ہمیشہ یوں رکھیں گے کہ وہ کبھی بھی اپنے آپ کو تنہا اور لاوارث نہیں سمجھیں گے۔

شمع نے اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے گویا اس کی باتوں پر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ بسا اوقات اظہارِ جذبات کے لئے قوتِ گویائی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ حرکات و سکنات ہی بزبانِ خامشی سب کچھ کہہ دیا کرتی ہیں۔

اقبال چھٹی کاٹ کر واپس یونٹ چلا گیا۔ اب اس کے قلم، جس سے درد اور رنج و الم کے سوتے ابلتے تھے، ابھی اسی قلم سے محبت کی خمار آلود اور رومان انگیز شبنم کی پھواریں پڑھنے والوں کے جذبات میں ہلچل مچانے لگیں۔ اس کے پرستار، اس کے قارئین اس کایا کلپ پر بہت حیران تھے۔ بہت کم لوگوں کو علم تھا کہ اس کی ویران اور تنہا زندگی میں شمع ایک بہار بن کر یوں داخل ہوئی ہے کہ اس کی ویرانیاں شمع کے دم سے آباد ہو چکی ہیں۔ اس کی تنہائیوں کی ساتھی اس کی ہم دم اس کی ساتھی بن چکی ہے۔

☆۞☆

اولاد والدین کے لئے وہ مضبوط اور کبھی بھی نہ ٹوٹنے والا بندھن ہوا کرتی ہے جو زندگی کی آخری سانسوں تک ایک دوسرے کو جوڑے رکھتی ہے۔ اولاد والدین کے احسانات بھول کر، ان کی محبتوں، ان کی

شفقتوں کو تارِ عنکبوت کی طرح توڑ کر اپنی اپنی دنیائیں تو آباد کر لیا کرتی ہے۔ مگر ماں باپ ہمیشہ اپنے بچوں کی خاطر اپنی خوشیاں، اپنی امنگیں، اپنی خواہشات حتیٰ کہ بسا اوقات اپنی جان بھی ہار جایا کرتے ہیں۔ مگر اقبال وہ بدنصیب انسان تھا جو ساری زندگی باپ کے پیار اور بہن بھائیوں کی محبت سے محروم تنہا تنہا اور اکیلا اکیلا ہی زندگی کا سفر طے کرتا رہا۔ ایک ماں ہی وہ سرمایۂ زیست تھی جس کے سہارے وہ زندگی کی تمام تر کٹھنائیاں جھیل رہا تھا۔ پھر شمع اس کی زندگی میں بہار بن کر داخل ہوئی تو اس کی تنہائیوں میں مراسم کی خوشبو بکھر گئی۔ اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اب اس کے گلشن میں کبھی خزاں نہیں آئے گی۔ مگر اسے کیا خبر تھی کہ اصلی امتحان تو اب شروع ہوا ہے۔ اقبال کے جاتے ہی اقبال کا باپ اور بہن بھائی اپنی اصلی جون میں آ گئے۔ ہمارے سماج میں ساس بہو کا بیر (دشمنی) ایک ضرب المثل بن چکی ہے۔ مگر یہاں کا یہ سوتیلے پن والا کردار اقبال کا باپ اور اس کے بہن بھائی بخوبی نبھا رہے تھے۔

اقبال کی یونٹ ان دنوں منگلا تعینات تھی جہاں سے وہ ہر ہفتے ''ویک اینڈ'' آ جایا کرتا تھا۔ اگر کسی ہفتے وہ سرکاری ڈیوٹی کی وجہ سے ویک اینڈ نہ آ سکتا تو اتوار کی صبح صبح وہ اجازت نامہ (جسے فوجی زبان میں آؤٹ پاس کہا جاتا ہے) لے کر گھر آ جاتا۔ شمع اگرچہ عام بیویوں کی طرح کوئی بھی گھریلو شکوہ شکایت اس سے نہیں کرتی تھی اور نہ ہی وہ ان بیویوں میں سے تھی جو شادی کے دوسرے دن ہی شوہر کو لے کر الگ ہو جایا کرتی ہیں۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ جو ان بیٹوں کے علیحدہ ہو جانے سے وہ والدین بالکل بے سہارا اور لاوارث رہ جائیں گے۔ جنہیں اس بڑھاپے میں جوان بیٹوں کے سہاروں کی ضرورت تھی۔

شمع نے اقبال سے کبھی بھی اس کے باپ اور بہن بھائیوں کے ناروا سلوک کا شکوہ تو در کنار اشارہ تک نہیں دیا تھا۔ مگر وہ شمع کے کملائے ہوئے چہرے، اور دن بدن گرتی ہوئی صحت کی بدولت سب کچھ سمجھ رہا تھا۔ اس نے شمع کو کریدنے کی بڑی کوشش کی مگر شمع ہنس کر ٹال دیتی۔

ایک روز وہ ویک اینڈ آیا تو گھر میں داخل ہوتے ہی اسے اپنے باپ کی گرجدار آواز سنائی دی۔ وہ کسی بات پر شمع پر بُری طرح برس رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ دیگر بہن بھائی بھی شمع پر چیخ چلا رہے تھے۔ اقبال تڑپ اٹھا۔ اس نے بیگ زمین پر رکھ کر معاملہ جاننے اور سمجھنے کی کوشش کی تو باپ نے بغیر سوچے سمجھے کہ وہ اپنی بیوی کے سامنے کھڑا ہے، پوری قوت سے اس کے منہ پر تھپڑ دے مارا۔ سب ہکا بکا رہ گئے۔ شمع نے تڑپ کر آگے بڑھنا چاہا تو اقبال کے بہن بھائی درمیان میں کود پڑے۔ یوں معاملہ بڑھتے بڑھتے اس حد تک بگڑ گیا کہ اس کے باپ نے اسی وقت اسے اور شمع کو گھر چھوڑنے کا حکم دے دیا۔ زندگی میں پہلی بار ماں اپنے شوہر کے سامنے سراپا احتجاج بن گئی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ اتفاق سے اس کی بڑی شادی شدہ بہن راشدہ بھی آئی ہوئی تھی۔ وہ اقبال کی ضدی اور ہٹیلی طبیعت سے واقف تھی۔ اس نے باپ سے بڑے ملتجی لہجے میں کہا۔

''ابا! اقبال کو روک لیجئے، آپ اس کی ہٹیلی طبیعت سے واقف ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ اگر اس نے ایک دفعہ گھر چھوڑ دیا تو پھر وہ کبھی بھی واپس نہیں آئے گا''۔ تب باپ نے بڑی رعونت سے ساجدہ کی بات سنی اَن سنی کرتے ہوئے کہا تھا۔

''اقبال! دفع ہو جاؤ اس گھر سے کہ جب زمانے بھر کی اور در در کی ٹھوکریں کھا کر واپس لوٹنے کی کوشش کرو گے تو یہ سوچ لینا کہ اس گھر کے دروازے آج

کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو چکے ہیں''۔

اور اس نے دل ہی دل میں عہد کر لیا کہ وہ ...تے مر جائے گا۔ مگر اپنی لاش کو بھی اس گھر واپس نہ ...نے کی وصیت کر جائے گا۔ اس نے شمع کا ہاتھ تھاما۔ ایک نظر سب بہن بھائیوں اور ماں کے چہرے پر ... والد ... بھائیوں کے چہروں پر فتح مندی کی مسکراہٹ تھی جبکہ بہن ساجدہ اور ماں کی پُرنم آنکھوں میں خاموش التجائیں تھیں۔ ''نہ جاؤ بالق اس گھر سے یوں منہ موڑ کر نہ جاؤ کہ تمہاری شکل کو ہم دیکھنے کے لئے ترس جائیں''۔ ایک لمحے کے لئے وہ ڈگمگا بھی گیا مگر باپ کے تلخ الفاظ اس کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح آگ لگا رہے تھے۔ چنانچہ اس نے شمع کا ہاتھ تھاما اور تھکے تھکے قدموں کے ساتھ گھر کی دہلیز پار کر گیا۔

گھر سے نکل کر ان دونوں نے رات کہاں گزاری، کس طرح اپنی زندگی کو رواں دواں رکھنے کے لئے جدوجہد کی۔ اس سے قطع نظر اقبال نے شمع کو اس کے میکے چھوڑا اور دوسرے روز واپس اپنی یونٹ میں چلا گیا۔ یونٹ کمانڈر سے مل کر اسے ساری کہانی سنائی۔ آرمی کا ادارہ اپنے عسکریوں کو کبھی بھی تنہا اور لاوارث نہیں چھوڑا کرتا۔ حاضر سروس ہو تو اس کے حقوق کا مکمل تحفظ کرتا ہے۔ وقت پر کھانا، وقت پر تنخواہ، وقت پر دیگر مراعات اور جب ریٹائر ہو جائے تو معقول اور بروقت واجبات کی ادائیگی ہر ماہ پنشن۔ بیمار ہو تو فیملی سمیت فری علاج معالجے کی سہولت۔ فوت ہو جائے تو بیوہ کی کفالت کے لئے عسکری کی پنشن و واجبات بیوہ کے نام۔ غرضیکہ یہ باوقار ادارہ اپنے عسکریوں کو کبھی بھی تنہا اور لاوارث نہیں چھوڑتا۔ یونٹ کمانڈر نے جب اقبال کی داستان سنی تو فوری طور پر اس کے لئے نہ صرف سرکاری کوارٹر کا بندوبست کر دیا بلکہ اسے یونٹ سے ایک ماہ کا فری راشن بھی دے دیا۔ ساتھ ہی اس پر خصوصی عنایت کی گئی کہ اس کی چھٹی بحال رکھی گئی۔ اقبال اسی روز اپنے سسرال جا کر شمع کو لے آیا۔ یوں زندگی ایک ڈگر پر چل نکلی۔

اقبال کو اللہ تعالیٰ نے دو بیٹے عطا کئے۔ اس نے اور شمع نے ان کی تعلیم و تربیت پر بھرپور توجہ دی۔ جو جو محرومیاں اور تشنگیاں ان کو ملی تھیں انہوں نے اس کا منحوس سایہ ان پر نہ پڑنے دیا۔ انہیں بھرپور محبت دی۔ دونوں بچے حیرت انگیز طور پر انتہائی خوبصورت اور شفاف رنگت کے حامل تھے جو ماں کی طرف سے ان کے حصے میں آئی تھی۔ عسکری قوانین کے مطابق اقبال کی ٹرانسفر جہاں بھی ہوتی تو اس کے یونٹ کمانڈر کو اقبال کے لئے رہائش کا لکھ دیا جاتا۔ اگر سرکاری طور پر کوارٹر کا حصول ممکن نہ ہوتا تو اس کو خصوصی طور پر یہ اجازت دی جاتی کہ وہ یونٹ کے نزدیک ترین کسی بھی جگہ پرائیویٹ رہائش گاہ حاصل کر سکتا ہے (فوجی زبان میں اس کو آؤٹ لیونگ (Out Living) کہا جاتا ہے)۔ جس کا کرایہ الاؤنس کی صورت میں اسے سرکاری طور پر ادا کیا جاتا۔

وقت گزرتا رہا، اقبال کی سروس اور ٹرانسفر کا سلسلہ جاری رہا۔ اقبال اب ترقی پا کر حوالدار بن چکا تھا۔ اس کے دونوں بیٹے اب ہائی سکول کے طالب علم تھے۔ اسی دوران اقبال کی ریٹائرمنٹ کے آرڈر آ گئے۔ ریٹائرمنٹ کے وقت اقبال کو واجبات اور سرکاری پنشن کی مد میں ایک اچھی خاصی رقم ملی جس سے اس نے ایک مناسب سا کشادہ گھر خرید لیا۔ کیونکہ جب تک وہ آرمی میں تھا اسے رہائش کا کوئی خاص مسئلہ نہ تھا، مگر ریٹائرمنٹ کے بعد اصل مسئلہ رہائش کا بنتا تھا۔ چنانچہ وہ گھر خرید کر اس نئے گھر میں شفٹ ہو گئے۔ بقایا پیسوں سے اس نے بچت سکیم میں سیونگ سرٹیفکیٹس

خرید لئے۔ ساتھ ہی اس نے ایک پرائیویٹ فرم میں نوکری کر لی۔ یوں پنشن، سیونگ سرٹیفکیٹس سے ہر ماہ ہونے والے منافعے اور فرم کی تنخواہ سے گھر کا نظام بہ احسن وخوبی چل نکلا۔ اسے اپنا آبائی گھر چھوڑے طویل عرصہ ہو چکا تھا۔ اس نے پلٹ کر خبر نہ لی تھی اور نہ ہی اس کے گھر والوں نے اس کی خیر خبر لی تھی۔ اقبال زندگی کی مصروفیات میں اپنے آپ کو یوں گم کر چکا تھا کہ اپنے آبائی گھر، اپنے بہن بھائیوں اپنا باپ سب کچھ بھول چکا تھا۔ اگر نہیں بھولا تھا تو اپنی ماں اور بہن راشدہ کو نہیں بھولا تھا۔ آخری بار جب وہ گھر سے نکل رہا تھا تو اس نے آخری نظر ان کے ستے ہوئے چہروں پر ڈالی تھی۔ ان کی اشکبار آنکھیں ہمہ وقت اس کے ذہن کی سکرین پر تھرتھراتی رہتی تھیں۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی وہ ان آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آنکھوں کو نہ بھول پایا تھا۔ اس نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک روز اپنے گھر اور گھر والوں کا پتہ کرایا تو پتہ چلا کہ ماں تو اس کے گھر چھوڑ کر جانے کے تقریباً چھ ماہ بعد ہی فوت ہوگئی تھی۔ وہ ہر وقت اسے یاد کر کے روتی رہتی تھی۔ اس کی چھوڑی ہوئی چیزوں کو ہمہ وقت چومتی رہتی۔ انہیں سینے سے لگاتی اور ہر ملنے والے سے کہتی۔ ”میرے بالو کو بلا دو، میں اس کے بغیر مر جاؤں گی۔ نہ جانے میرا بالو کس حال میں ہوگا“۔

بڑی بہن راشدہ بھی اس کے گھر سے چلے جانے کے بعد اگلے ہی دن واپس اپنے سسرال چلی گئی تھی اور پھر دوبارہ واپس اپنے میکے نہیں آئی۔ ماں کے مرنے پر وہ آئی تھی اور قل کے بعد واپس چلی گئی تھی۔ دیگر بہن بھائی بھی شادی شدہ ہو چکے تھے اور باپ کی زندگی میں ہی مکان کے بٹوارے کر لئے تھے۔ باپ کو انہوں نے کسی ”اولڈ ایج ہوم“ میں داخل کروا دیا تھا۔ اسے گھر کے حالات سن کر بے حد دکھ ہوا تھا۔ خاص کر ماں کی وفات، راشدہ کے گھر کبھی نہ آنے کا سن کر تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا۔

☆❀☆

انسان پیدا ہوتا ہے، بڑھتا ہے پھلتا پھولتا ہے۔ جوان ہوتا ہے۔ پھر بوڑھا ہو کر پیوند خاک ہو جایا کرتا ہے۔ ایسا روزِ اوّل سے ہوتا چلا آیا ہے اور تاقیامت ہوتا رہے گا۔ ہر جانے والا اپنے آنے والوں کے لئے جگہ خالی کرتا چلا جاتا ہے اور آنے والے اپنا وقت پورا کر کے اپنے نئے آنے والوں کے لئے جگہ خالی کر دیتے ہیں۔ اقبال اور شمع بھی بڑھاپے کے خشک سفر کا آغاز کر چکے تھے۔ ان کے بیٹے بلال اور جمال اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اچھے اچھے عہدوں پر فائز تھے۔ ان کی شادیاں ہو چکی تھیں، وہ خود بھی بال بچے دار ہو چکے تھے۔ یہ گھر اب چھوٹا پڑ رہا تھا۔ ایک دو دفعہ دبے دبے لفظوں میں انہوں نے یہ گھر بیچ کر کوئی بڑا گھر خریدنے کی بات بھی کی تھی۔ اقبال اور شمع جہاندیدہ تھے۔ وہ اپنے گھر سے ہجرت کے اغراض و مقاصد اور نتائج سے بخوبی آگاہ تھے۔ وہ سمجھ گئے کہ اصل مسئلہ گھر چھوٹے ہونے کا نہیں بلکہ اصلی وجہ بہوؤں کی علیحدہ آزادانہ زندگی گزارنے کی خواہش ہے نئے دور کی نئی بہویں جو گھر سے پہلا سبق پڑھ کر اور مقصد لے کر آتی ہیں کہ جاتے ہی اپنے شوہروں کو لے کر ساس سسر کو اللہ کے آسرے پر چھوڑ دیتے ہوئے اپنی اپنی دنیائیں آباد کر لیں۔ جو ذرا دنیادار قسم کی بہویں ہوتی ہیں وہ اپنے ساس سسر کے آبائی گھر بکوا کر اپنے ساتھ لے جاتی ہیں۔ جہاں ساس کا کام پوتیاں پوتے سنبھالنا، گھریلو کام کاج کرنا اور ہانڈی روٹی کرنا رہ جاتا ہے جبکہ سسر بیچارہ بڑھاپے کی حالت میں کھانستے کھانستے سودا سلف لانا، پانی بھرنا، بچوں کو سکول لانا لے جانا اپنے ذمے لے لیتا ہے۔ یوں ان کو گھریلو

کام کاج اور بازار کے کام سنبھالنے کے لئے مفت کی ملازمہ اور ملازم مل جاتے ہیں جو صرف دو وقت کی روٹی کے عوض چوبیس گھنٹے کی ڈیوٹی دیتے رہتے ہیں۔

شمع اور اقبال کو اپنے پوتے پوتیوں سے بے حد محبت تھی، وہ انہیں دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ وہ معصوم بچے بھی اپنے دادا دادی سے بے حد پیار کرتے تھے۔ ہمہ وقت اُن کے پاس ہی گھسے رہتے۔ وہ اپنی بہوؤں کے عزائم سن کر بے حد پریشان ہو گئے تھے۔ ابھی وہ اس مسئلے کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کر ہی رہے تھے کہ ایک دن بلال اور جمال نے یہ گھر چھوڑ دیا کہ اگر وہ یہ گھر نہیں بیچنا چاہتے تو نہ بیچیں۔ تاہم وہ یہ گھر چھوڑ کر جا رہے ہیں کیونکہ اس گھر میں اُن کا گزارا مشکل ہے

بوڑھا اقبال اور شمع انہیں روک بھی نہ سکے۔ روکا تو انہیں جاتا ہے جو رکنا چاہیں۔ جو فیصلہ ہی علیحدہ ہونے کا کر لیں انہیں روکا جا ہی نہیں سکتا۔ یوں وہ روتے بلکتے اپنے پوتے پوتیوں جو ان کے لئے جیتے جاگتے پیارے سے کھلونے تھے۔ جن کے ساتھ وہ پہروں کھیلا کرتے تھے۔ اب ان سے جدا ہو رہے تھے۔ اگرچہ دونوں بیٹوں اور بہوؤں نے انہیں تسلیاں دی تھیں کہ وہ انہیں ملنے آتے رہیں گے۔ مگر وہ ان کے چہروں سے چھلکتی ہوئی سنگین سفاکی سے جان چکے تھے کہ جو بچے والدین کو بڑھاپے میں بے آسرا اور لا وارث چھوڑ کر اپنی دنیائیں آباد کر لیں وہ کبھی پلٹ کر واپس نہیں آیا کرتے اور اگر کبھی آ بھی جائیں تو اتنی مختصر مدت کے لئے کہ جیسے کوئی راہ چلتا مسافر تھک ہار کر کہیں سستانے کے لئے بیٹھ جائے اور دم لے کر پھر اٹھ کر چل دے۔

اقبال کی ماں اقبال کی جدائی میں صرف چھ ماہ ہی زندہ رہ سکی تھی۔ شاید اپنے باقی بچوں کی بدولت تھوڑی بہت بہل گئی ہوگی مگر شمع تو تین ماہ ہی بمشکل نکال سکی۔ اس کی اولاد، اس کی پوتیاں پوتے ہی تو اس کی کل کائنات تھی۔ چنانچہ تیسرے ہی ماہ وہ ایک رات چپ چاپ اقبال کا ہاتھ تھامے روتی آنکھوں سے دیکھتی رہی اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آنکھیں موند کر ابدی نیند سو گئی۔ مرتے وقت اس کی چھم چھم آنسو بہاتی آنکھوں میں ایک ہی سوال تھا کہ اس کے بیٹوں، اس کے پوتے پوتیوں کو ایک نظر اسے دکھا دیا جائے مگر سنگدل بیٹے بہوئیں تو اپنے اپنے بچوں کے ساتھ ناران، کاغان، سوات، ایوبیہ اور نہ جانے کون کون سے تفریحی مقامات پر ایک لمبے ٹور (Tour) پر نکلے ہوئے تھے۔ ماں باپ کے آشیانے سے نکل کر وہ آزاد پنچھیوں کی طرح پاکستان کے تفریحی مقامات کی سیاحت سے بھرپور لطف اندوز ہو رہے تھے۔

اقبال ایک بار پھر اس بھری پُری دنیا میں تنہا رہ گیا تھا۔ شمع جو اس کی تنہائیوں کی ساتھی تھی، جس کے دم سے اس کی ویران زندگی میں بہار رقصاں رہتی تھی جس کی محبت میں اس نے اپنے آپ کو کبھی بھی تنہا محسوس نہیں کیا تھا۔ اس وقت بھی نہیں جب باپ، بہن بھائی عزیز و اقارب سب اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ اس نے اپنے آپ کو اکیلا اس وقت بھی نہیں سمجھا تھا۔ جب اس کے دونوں بیٹے، اس کی متاعِ زیست بچے اپنے اپنے بیوی بچوں کو لے کر اسے تنہا کر گئے تھے۔ مگر آج شمع بھی جب دارِ فانی سے کوچ کر گئی تو وہ اپنے آپ کو شدت سے تنہا محسوس کرنے لگا۔ قرطاس و قلم سے ناطہ تو وہ پہلے ہی توڑ چکا تھا کہ اب لکھنے کی طرف طبیعت مائل ہی نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنی تنہائیاں شمع کے تصور سے آباد کر لیں۔ وہ ہر روز شمع کی قبر پر جاتا۔ اس کی صفائی ستھرائی کرتا۔ قبر پر بیٹھ کر فاتحہ خوانی اور قرآن خوانی کرتا رہتا اور رات کو شمع کی تصویر سے باتیں کرتا رہتا۔ لوگ اسے پاگل، مجنوں، سودائی

اور نہ جانے کیا کیا کہتے تھے۔ مگر اسے کسی بات کی پروا نہیں تھی۔ شمع کے بغیر اس کا دل ویسے ہی دنیا سے اچاٹ ہو چکا تھا۔

البتہ 31 دسمبر کو وہ گویا ہوش میں آ جاتا۔ علی الصبح اٹھ کر شمع کی قبر پر جاتا، پھولوں اور اگربتیوں سے قبر کو سجاتا مہکاتا، قرآن خوانی کرتا، فاتحہ پڑھتا، سہ پہر کو سج دھج کر تیار ہوتا، مارکیٹ سے کیک اور موم بتیوں کا پیکٹ لاتا اور اپنے کمرے میں بیٹھ جاتا۔ بارہ بجنے سے کچھ دیر پہلے وہ کیک میز پر رکھتا۔ موم بتیاں روشن کرتا اور جیسے ہی کلاک بارہ بجاتا وہ رندھی ہوئی آواز میں ہیپی نیو ایئر، ہیپی میرج انورسری ٹو می کہتے ہوئے کیک کاٹتا اور کیک کا ایک ٹکڑا لے کر دیوار پر لگی ہوئی قدِ آدم تصویر کی جانب چل پڑتا اور کیک کا ٹکڑا تصویر کے ہونٹوں کو مس کرتا اور پھر کیک منہ میں ڈال لیتا۔ بالکل اسی طرح جیسے برس ہا برس پہلے جب حجلۂ عروسی میں شرمائی شرمائی شمع کے ساتھ رات بارہ بجے نئے سال اور شادی کے پہلے دن کو منایا تھا۔ وہ ہر سال اسی طرح اس یادگار دن کو منایا کرتا تھا۔ شمع کی زندگی میں بھی اور شمع کے مرنے کے بعد بھی فرق صرف یہ تھا کہ شمع زندگی میں وہ کیک کا ٹکڑا منہ میں ڈال کر جواباً دوسرا ٹکڑا اقبال کے منہ میں ڈال دیا کرتی تھی۔ مگر اب اقبال اکیلا ہی یہ سب کچھ کر لیتا تھا۔ شمع کی تصویر کے ہونٹوں سے کیک کا ٹکڑا مس کر کے باقی کیک وہ خود کھا لیا کرتا تھا۔

شمع کے مرنے کے بعد جمال اور جلال نے پلٹ کر بوڑھے اور تنہا رہ جانے والے باپ کی خبر بھی نہ لی تھی۔ وہ جب اپنے طویل سیاحتی دورے سے واپس لوٹے تھے تو اس وقت تک شمع کا چہلم بھی ہو چکا تھا۔ انہوں نے غیروں کی طرح رسمی طور پر باپ سے تعزیت کی تھی پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی زندگی سے نکل گئے تھے۔ مبادا تنہا رہ جانے والا باپ کہیں تنہائیوں کے خوف سے گھبرا کر اُن کے پاس رہنے کے لئے نہ چلا آئے۔

☆❁☆

یہ اُسی طوفانی رات کا ذکر ہے جس رات کا ذکر اس کہانی کے شروع میں ہوا ہے۔ کیک کاٹ کر واپس صوفے پر بیٹھتے ہوئے وہ شمع کو یاد کر کے پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ آج شدت سے اسے اپنی تنہائیوں کا احساس ہو رہا تھا۔ روتے روتے نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ صوفے پر ہی لیٹ کر سو گیا۔ اگلی صبح سات بجے جب کام والی آئی تو اس نے کال بیل بجائی۔ کافی دیر کے بعد بھی جب کوئی نہ آیا تو اس نے دوسری دفعہ پھر تیسری دفعہ بیل بجائی کوئی جواب نہ پا کر اس نے ڈپلی کیٹ چابی جو اسے اقبال نے خود ہی دی ہوئی تھی کہ اگر کسی وجہ سے دروازہ نہ کھل پائے تو وہ اس چابی سے گھر داخل ہو سکے۔ اس نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوئی تو اقبال کے کمرے میں گئی جہاں اقبال صوفے پر آڑا ترچھا لیٹا ہوا تھا۔ موم بتیاں کبھی کی پگھل پگھل کر ختم ہو چکی تھیں۔ ملازمہ کو اقبال کا یہ انداز غیر فطری سا لگا اس نے قریب جا کر اقبال کو چھوا تو اس کے سرد جسم نے اس کے مُردہ ہونے کی گواہی دے دی۔ تنہائیوں کا مارا ہوا بوڑھا اقبال نہ جانے رات کے کس لمحے اپنی شمع کے پاس چلا گیا تھا۔ اپنی تنہائیاں آباد کرنے، اپنے دکھوں کا مداوا کرنے یا پھر اپنے اللہ سے یہ پوچھنے کہ اے خالق، اے مالک میری تخلیق میں ایسا کون سا راز تھا، تیری ایسی کون سی رضا شامل تھی کہ میں ساری زندگی تنہائیوں اور محرومیوں کا شکار رہا۔ یہ تنہائیاں میرے مقدر کے ماتھے کا جھومر کیوں بنی رہیں۔

ملازمہ نے روتے ہوئے اقبال کی ادھ کھلی آنکھیں بند کیں اور پڑوسیوں کو اطلاع کرنے چلی گئی۔

❁❁❁

ایک تاثر ایک کہانی

میری التجا ہے کہ اگر کوئی ایسا موقع آ جائے تو ان ''پیشہ ورضرورت مندوں'' سے بچ کر رہیں اور ان سفید پوش لوگوں کو خود ڈھونڈ کر رات کے اندھیرے میں امداد ان کے گھروں تک پہنچائیں تا کہ ان کی عزتِ نفس بھی مجروح نہ ہو۔

نیکی برباد......

☆ محمد رضوان قیوم

راوی: حاجی علی حبیب

راولپنڈی

کورونا وائرس نے دیکھتے ہی دیکھتے دنیا بھر میں اپنے نادیدہ پنجے گاڑ لئے اور ہر طرف موت کا بازار گرم کر دیا۔ ہر طرف خوف اور دہشت کا راج ہو گیا۔ انسان کی معاشرتی اور معاشی زندگی کو تلپٹ کر کے رکھ دیا۔ خوشحال اور ترقی یافتہ ممالک نے تو اپنی رعایا کے لئے خزانوں کے منہ کھول دیئے اور ان کو مالی مسائل اور خوراک کی کمی کا مسئلہ نہ ہونے دیا لیکن ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک کے عوام کی شامت آ گئی اور لاک ڈاؤن کی وجہ سے لوگ کورونا کی بجائے بھوکے مرنے لگے۔ پاکستان بھی انہی ممالک میں شامل ہے جو ہر مشکل وقت میں بڑے ممالک سے امداد کے لئے مجبور ہوتے ہیں حالانکہ پاکستان کا حکمران طبقہ بادشاہوں جیسی زندگی گزارتا ہے اور عوام کے دیئے ہوئے ٹیکسوں پر عیش کرتا ہے لیکن عوام کی خدمت کے دعوے کرنے والے سب لیڈروں اور سیاستدانوں کو ان حالات میں سانپ سونگھ جاتا ہے۔

ان ارب پتی لوگوں کو توفیق نہیں ہوتی کہ اپنے خزانوں سے ضرورت مندوں کے لئے حصہ نکال سکیں۔ ان کو بس حکومت کرنے کا شوق اور نشہ ہوتا ہے۔ ان حالات میں اللہ کے نیک بندے حرکت میں آتے ہیں اور بغیر کسی نام ونمود کی خواہش کے اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے ضرورت مند لوگوں کا حصہ نکالتے ہیں۔ حالیہ بحران میں بھی ایسا ہی ہوا اور بیرون ممالک میں مقیم پاکستانیوں نے دکھول کر اپنے غریب بھائیوں کی مدد کی۔

میرے ایک دوست حاجی علی حبیب ہیں۔ انہوں نے مجھے ایسے ہی دردِ دل رکھنے والے برطانیہ میں مقیم ایک پاکستانی کے بارے میں بتایا۔ وہ مالدار ہونے کے ساتھ سخی بھی ہیں اور ضرورت مندوں کی مدد بھی کرتے رہتے ہیں۔

آیئے ان کی بات حاجی علی حبیب کی زبان سنیں۔

نیکی برباد گناہ لازم والا محاورہ سب نے سنا اور پڑھا ہوگا۔ میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ وہ مالدار پاکستانی ہر سال مجھے ایک مخصوص رقم غریبوں کی مالی اعانت کے لئے بھیجتے ہیں۔ اس مرتبہ انہوں نے معمول سے زیادہ رقم بھیجی اور فون پر مجھے تاکید کی کہ اس رقم سے راشن کے بڑے کارٹن بنوا لینا اور اتنے ہی آٹے کے 20 کلو والے توڑے لے لینا اور کوشش کر کے سفید پوش لوگوں تک پہنچا دینا۔

میں نے ان کی ہدایت کے مطابق راشن کے تقریباً 50 کارٹن تیار کرا لئے۔ ان میں چینی، پتی، دالیں، چاول اور گھی وغیرہ شامل تھے۔ اس کے بعد بھی کچھ رقم بچ گئی تو میں نے فی کس ایک ہزار روپے کے لفافے بھی نقد امداد کے لئے تیار کر لئے۔

میں جہاں رہتا ہوں وہاں ایک چوک میں دیہاڑی دار مزدوروں کا ہجوم ہوتا ہے۔ ان میں ہر طرح کا کام کرنے والے کاریگر شامل ہوتے ہیں۔ میں نے شکل وصورت سے شریف نظر آنے والے ایک مستری کو اعتماد میں لے کر اس سے کہا کہ وہ مجھے ان مزدوروں کاریگروں میں سے ایسے لوگوں کی فہرست بنا دے جو واقعی ضرورت مند اور امداد کے مستحق ہیں۔ سفید پوش لوگوں کا خاص خیال رکھے۔

اس مستری کا نام رزاق تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ اس نیک کام میں بھرپور حصہ لے گا اور جلد ہی مجھے حقدار لوگوں کی فہرست بنا دے گا۔ میں نے اس سے قسم لی کہ وہ کسی بھی ضرورت مند کو میرا گھر نہیں دکھائے گا اور نہ میرا نام بتائے گا۔

''ٹھیک ہے حاجی صاحب!'' رزاق نے کہا۔ ''جیسا آپ کا حکم ہے ویسے ہی ہوگا''۔

دو دن بعد اس نے مجھے مستحق لوگوں کی ایک طویل فہرست تھما دی۔ میں اتنے لوگوں کے نام دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ میرے پاس اتنا راشن اور نقد رقم نہیں تھی کہ ہر بندے کی مدد کر سکتا۔ میرے پاس صرف پچاس بندوں کے لئے راشن اور نقد رقم تھی۔ میں نے اس لسٹ میں سے بہت سارے نام حذف کر دیئے۔ یہ میری مجبوری تھی۔ میں نے وہ لسٹ فائنل کر کے مستری رزاق سے کہا کہ وہ میرے گھر سے راشن کے ڈبے، آٹے کے توڑے اور نقد رقم کے لفافے لے کر ضرورت مندوں میں تقسیم کر دے۔

''میں تم سے کچھ دور موجود رہوں گا رزاق!'' میں نے اس سے کہا۔ ''تم میرے سامنے ضرورت مندوں کو راشن اور نقد رقم دینا۔ اس طرح میری تسلی ہو جائے گی کہ مستحق افراد تک راشن اور رقم پہنچ گئی ہے''۔

رزاق نے سینے پر ہاتھ رکھ کر بڑے ادب سے کہا۔ ''ایسا ہی ہوگا حاجی صاحب!''

اگلے دن میں مقررہ جگہ پہنچ گیا جہاں راشن تقسیم کرنے کے لئے لوگوں کو بلایا گیا تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران اور پریشان رہ گیا کہ وہاں سینکڑوں لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جن کا لسٹ میں نام شامل نہیں تھا۔ بالکل اس طرح کا ماحول بن گیا تھا جیسے وہاں کسی سیاستدان نے تقریر کرنی ہو اور بعد میں راشن تقسیم کرنا ہو۔ صرف میڈیا کے نمائندوں کی کمی تھی۔

ایک ایک کر کے نام پکار کر راشن تقسیم ہونے لگا مگر پھر اچانک ہی وہاں افراتفری مچ گئی۔ لوگ رزاق سے اس طرح چمٹ گئے جیسے مکھیاں گڑ کی ڈلی پر چمٹ جاتی ہیں۔ ایسے لگ رہا تھا کہ اسے شہد لگا ہوا ہے اور سینکڑوں چیونٹیاں اسے چوسنے کو بے تاب ہیں۔

پھر وہاں چھینا جھپٹی اور لوٹ مار شروع ہو گئی۔ لوگوں نے آٹے کے تھیلے اور راشن کے کارٹن لینے کے

لئے دھکم پیل شروع کر دی۔ ایک دوسرے سے گتھم گتھا لوگ، ایک دوسرے کے کپڑے پھاڑنے لگے، جس کے ہاتھ جو لگا وہ لے بھاگا۔ گھبرا کے رزاق وہاں سے بھاگ نکلا۔ نہ جانے ہجوم کو کس نے یہ بات بتا دی کہ میں ان لوگوں کی مدد کر رہا ہوں، رزاق نے ہی یہ بات پھیلا دی ہوگی۔

لوگوں نے میری طرف دیکھا اور ہجوم کی صورت آگے آنے لگے۔ یہ دیکھ کر میں نے بھی وہاں سے دوڑ لگا دی۔ ہجوم بھی میرے تعاقب میں بھاگنے لگا۔ میرا رُخ اپنے گھر کی طرف تھا۔ نام نہاد مستحق اور ضرورت مندوں کا ہجوم میرے گھر تک پیچھے آیا اور میں اپنے ہی گھر میں کسی مفرور کی طرح پناہ گزین ہو گیا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں نے ان غریبوں کو راشن تقسیم کرنے کی ذمہ داری لے کر کوئی جرم کیا تھا۔

ہجوم نے میرے گھر کا داخلی دروازہ دھڑ دھڑانا شروع کر دیا اور ''باہر نکلو'' کے نعرے لگانے لگے۔ ایک دو آوازیں تو بہت شرمناک تھیں جو کہہ رہے تھے۔ ''ہمارے حصے کی امداد ہضم نہیں ہو گی''۔ پھر وہ لوگ داخلی گیٹ توڑنے کی کوشش کرنے لگے۔ وہ تو شکر ہے کہ گیٹ مضبوط تھا۔ پھر ان لوگوں نے طیش کے عالم میں میرے گھر کی دیواروں پر میرے خلاف مختلف نعرے اور گالیاں لکھ دیں۔

میری عجیب پوزیشن ہو گئی تھی۔ محلے کے لوگ بھی مجھے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔ کس کس کو وضاحت کرتا کہ نیکی میرے گلے پڑ گئی ہے۔ گھر کی دیواروں کو دھلوایا اور چند دن گھر میں ہی محصور رہا۔ چند روز بعد جب معاملہ ٹھنڈا ہوا تو میں منہ چھپا کر اس چوک میں پہنچا جہاں مجھے رزاق مستری ملا تھا، وہ وہاں نہیں تھا۔

میں نے ایک بوڑھے سے مزدور سے اس کے

انتخاب

دوسروں کو خوشی دے کر خود دکھ رکھ لو۔ کیونکہ خوشی میں تم رب کو بھول جاتے ہو اور غم اور تکالیف میں تم ہمیشہ اپنے رب کو یاد رکھو گے اور رب کو ہمیشہ اپنے پاس پاؤ گے۔

متعلق پوچھا تو اس بوڑھے نے بتایا کہ رزاق تو پکا فراڈیا ہے۔

''آپ نے اس فراڈیے کے ذمہ یہ کام کیوں لگایا جناب؟'' اس نے کہا۔ ''آپ نے اس کو غریب اور مستحق لوگوں کے انتخاب کے لئے کہا تھا وہ بذاتِ خود دھوکے باز اور بے ایمان شخص ہے۔ کرونا کی وبا کی وجہ سے جس علاقے میں بھی غریبوں کو راشن ملتا ہے تو یہ لوگ دھونس دھاندلی سے کئی کئی بار راشن وصول کر لیتے ہیں جو ان کی ضرورت سے زیادہ ہو جاتا ہے۔ رزاق ایسے لوگوں سے اونے پونے داموں یہ راشن خرید لیتا ہے اور کریانے کی دُکانوں پر فروخت کر دیتا ہے۔ اس فراڈیے کے دو ذاتی مکان ہیں جو اس نے کرائے پر دے رکھے ہیں''۔

بوڑھے نے اور بھی بہت کچھ بتایا جسے سن کر میرا دماغ گھومنے لگا کہ لوگوں کا کوئی کردار ہی نہیں رہا۔ لوگ مصیبت اور وبا کے اس دور میں بھی دھوکا بازی اور فراڈ سے باز نہیں آتے۔ اگر عذاب بھی آ جائے تو یہ لوگ تائب نہیں ہوتے۔

میری التجا ہے کہ اگر کوئی ایسا موقع آ جائے تو ان ''پیشہ ور ضرورت مندوں'' سے بچ کر رہیں اور ان سفید پوش لوگوں کو خود ڈھونڈ کر رات کے اندھیرے میں امداد ان کے گھروں تک پہنچائیں تا کہ ان کی عزتِ نفس بھی مجروح نہ ہو۔ یہی اللہ کو پسند ہے۔

❀❀❀

برادرم عارف صاحب! ''قلمی دوستی'' کے عنوان سے ایک پرانے زمانے کی کہانی بھجوا رہا ہوں۔ یہی دوستی آج کل ''فیس بک فرینڈ'' میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اس دوستی کی آڑ میں مقدس رشتوں کی تذلیل و تضحیک کی جاتی ہے۔ نئی نسل اسلام کا سیدھا اور روشن راستہ چھوڑ کر گمراہی کے راستے پر چل نکلی ہے اور تباہی سے دوچار ہے۔ یہ اس دور کا المیہ ہے۔ آپ نے معاشرے کی اصلاح کا جو بیڑا اٹھایا ہے، میں بھی اس میں اپنا کردار ادا کرتا رہوں گا۔

0302-5962009
راہوالی، گوجرانوالہ

جگ بیتی

قلمی دوستی

لاہور شہر کو روشنیوں میں ڈوبا ہوا چھوڑ کر میں راہوالی چلا آیا۔ یہ 14 اگست 1977ء کی شام تھی۔ پاکستان کی تیسویں سالگرہ تھی اور یوم آزادی کی شام۔ میں یہ شام منانے لاہور گیا تھا۔ رات کے دس بجے تک رشید مجھے اپنی ٹیکسی میں لاہور کی مختلف جگہوں اور پارکوں میں گھماتا رہا۔ رات کے دس بجے میں لاہور کو بجلی کے جگمگاتے قمقموں میں دلہن بنا چھوڑ کر راولپنڈی جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔ گوجرانوالہ سے چھ سات میل آگے جی ٹی روڈ پر واقع چھوٹا سا قصبہ میرا شہر ہے۔ ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے بس نے مجھے میرے گھر کے سامنے اتار دیا۔ چونکہ میں دن بھر کا تھکا ہوا تھا۔ یوم آزادی کے ہنگاموں میں گھوم پھر کر نڈھال ہو چکا تھا لہٰذا بستر پر گرتے ہی مجھے انتہائی گہری نیند آ گئی۔

دروازے پر بے تحاشا پیٹے جانے کا شور اور شور میں ابھرتی ہوئی اپنے نام کی آواز سن کر میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کے تین بجے چکے تھے۔ ابھی رات کا کافی حصہ باقی تھا مگر نہ جانے کس کو اس وقت میری ضرورت پڑ گئی تھی۔ بستر سے اٹھ کر میں آنکھیں ملتا ہوا باہر کے دروازے تک گیا۔ دروازہ کھولا تو سامنے رشید کو کھڑے پا کر میں حیران رہ گیا۔ رشید تم اور اس وقت؟ میں اپنی حیرت اور تجسس کو غیر ارادی طور پر ہونٹوں پہ لے آیا۔

"ہاں مرزا یار۔ یہ میں ہی ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ بے وقت تمہیں تکلیف دی۔ دراصل....." وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا اور ساتھ ہی اس کی نظریں جی ٹی روڈ پر کھڑی اس ٹیکسی پر جا کر رک گئیں۔ اس کی نظروں کے تعاقب خود میری نظریں بھی۔ ہم دونوں ٹیکسی کی طرف چل دیئے تو رشید کہنے لگا۔

دس بجے تمہیں بس میں سوار کر کے جب میں اڈہ لاریاں سے نکلا تو مجھے باغبانپورہ کی چند سواریاں مل گئیں۔ وہاں سے واپسی پر ریلوے سٹیشن چند سواریاں اور سٹیشن سے سمن آباد کی۔ سمن آباد سے واپسی پر میں چوبرجی کے قریب ایک موڑ مڑ رہا تھا کہ ٹیکسی کے سامنے مجھے ایک چہرہ نظر آیا، نسوانی چہرہ۔ وہ ایک دم سے میری گاڑی کی زد میں آ گئی تھی۔ میں نے پوری قوت سے بریک لگا دیئے۔ ٹائر زور سے چرچرائے اور گاڑی رک گئی۔ بریک لگ جانے سے وہ موت کے منہ سے بچ گئی تھی۔ وہ تو بچ گئی مگر میں سوچنے لگا کہ اگر وہ میری گاڑی کے نیچے آ کر کچلی جاتی تو میرا کیا بنتا۔ میں غصے کے عالم میں گاڑی سے باہر نکل آیا۔ میں اسے کوئی موٹی سی گال دینا چاہتا تھا۔ وفورِ جذبات سے میرے ہونٹ کپکپا رہے تھے اور...... اب وہ فٹ پاتھ پر یوں کھڑی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

"مجھے راوی روڈ جانا ہے۔ اس نے میرے غصے کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا۔ چلیں، میں نے کرخت لہجے میں کہا اور پچھلا دروازہ کھول دیا۔ وہ گاڑی میں بیٹھ گئی تو میں نے دروازہ بند کیا اور ڈرائیونگ سیٹ پہ آن بیٹھا۔ "اگر مجھ سے تھوڑی سی بھی کوتاہی ہو جاتی تو کتنا ہولناک ایکسیڈنٹ ہو جاتا"۔ میں نے سٹیئرنگ گھماتے ہوئے اس کو مخاطب کیا مگر وہ خاموش رہی۔ میں نے پیچھے گردن گھما کر دیکھا تو وہ میرے سوال سے بے نیاز اپنے خیالوں میں گم تھی۔ میں کئی لمحے گردن گھما گھما کر اس کو گھورتا رہا مگر وہ جیسے کہیں دور خیالوں کے بھنور میں گم تھی اور...... "پاگل!" میں نے اس کی کیفیت کو بھانپتے ہوئے خود سے کہا۔

"جی کیا کہا، کچھ مجھ سے کہا آپ نے؟"

"خودکشی کا ارادہ ہو تو راوی میں کود کر مر جانا چاہئے۔ کسی غریب ٹیکسی ڈرائیور کو پھانسی لگوانے سے آخر کیا حاصل؟"

''اوہ!'' اس نے مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے مسکراہٹ افسردگی میں بدل گئی۔ ''آپ نے بجا فرمایا مگر یقین کریں کہ میں ارادتاً آپ کی گاڑی کے سامنے نہیں آئی تھی''۔

''تاہم آپ کا ارادہ ضرور مرنے کا تھا''۔ میری اس بات کا اس نے برا نہیں مانا تھا بلکہ خاموش ہو گئی۔ وہ خاموش تھی اور ٹیکسی سڑک پر دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہم راوی روڈ پر آ گئے۔ راوی روڈ پر پہنچ کر میں نے گاڑی کی رفتار قصداً کم کر دی اور اس کی طرف دیکھا۔ میرے کان پیچھے کی طرف لگے ہوئے تھے تاکہ اس کی حسبِ خواہش جگہ پر میں جلدی بریک لگا لوں۔

گاڑی قصور پورہ سے کافی بڑھ آئی تھی مگر وہ خاموش تھی۔ آخر میں نے گردن گھما کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ شاید وہ میرا مطلب سمجھ گئی تھی، اس نے مجھے ٹیکسی روک لینے کو کہا۔ ٹیکسی رک گئی اور وہ نیچے اتر گئی۔ اس نے سامنے نظر ڈالی تو سامنے بند روڈ تھی اور بند روڈ کے پار دریائے راوی۔ اس نے اپنا چھوٹا سا پرس کھولا اور پانچ سو روپے کا نوٹ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے میٹر دیکھا اور اس کو بقایا دینے کے لئے پتلون میں ہاتھ ڈالا مگر اس نے مجھے اشارے سے منع کر دیا۔ گویا وہ بقایا نہیں لینا چاہتی تھی۔ میں نے گاڑی کو ریورس لگایا اور راوی روڈ پر واپس ہو لیا۔ پھر نہ جانے کیوں میں نے گردن گھما کر اس کے تعاقب میں دیکھا تو...... وہ بند روڈ عبور کر کے بند پر چڑھ رہی تھی۔

دفعتہً سوچ کی ایک لہر میرے ذہن کے مدوجزر کو چھو گئی۔ میں نے گاڑی کی بتیاں بجھا کر گاڑی کو فٹ پاتھ کے ساتھ کھڑا کیا اور اس لڑکی کے پیچھے ہو لیا۔ میں درختوں کی اوٹ میں ہو کر آگے بڑھ رہا تھا۔ اس نے دریا کے کنارے کھڑے ہو کر ایک نظر ادھر اُدھر دیکھا بھی لیکن شاید وہ مجھے نہ دیکھ سکی تھی۔ پھر اس کے قدم تیز تیز پانی کی طرف اٹھنے لگے تھے۔ کوئی ساٹھ ستر قدم وہ دریا کے کنارے کنارے آگے بڑھتی رہی اور پھر گہرے پانی میں داخل ہو گئی۔ میں بڑی تیزی سے اس کے پیچھے پہنچا تھا۔

''ٹھہرو!'' پیشتر اس کے وہ گہرے پانی میں کود جاتی میں نے زور سے پکارا اور وہ رک گئی اور پیچھے مڑ کر دیکھنے لگی۔ میں اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔

''کون ہو تم اور کیوں مر رہی ہو؟''

''انسان ہوں اور مر اس لئے رہی ہوں کہ جی نہیں سکتی''۔ وہ گھمبیر لہجے میں بولی۔

''مرنے کے لئے یہ جواز کافی نہیں''۔ میں نے جواباً کہا۔

''آپ نے دوسری مرتبہ مجھے موت کے منہ میں کودنے سے روکا ہے۔ کون ہوتے ہیں آپ میرے معاملے میں دخل دینے والے؟ خدارا، مجھے مر جانے دیجئے''۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا تھا۔

''میرے ساتھ آؤ۔ اگر میں آپ کو جینے کا حق نہ دلا سکا تو مرنے کے لئے اسی جگہ چھوڑ جاؤں گا''۔ میں نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ میرے اس ایک جملے پر وہ میرے پیچھے کنارے پر نکل آئی۔ پھر ٹیکسی کی طرف بڑھتے ہوئے مختصراً اس نے مجھے اپنی بپتا سنا دی۔ دکھ اور درد میں ڈوبی ہوئی بپتا۔ وہ مظالم کا شکار ہوتی رہی ہے مرزا بھائی! میں اس کی داستان سن کر زار زار رویا ہوں۔ مرزا صاحب! اگر میں جوان بیوی کا شوہر اور دو بچوں کا باپ نہ ہوتا تو خدا کی قسم، اسے ضرور اپنا لیتا مگر اب تو میں اسے اپنے گھر بھی نہیں لے جا سکا۔ اس لئے کہ وہ بیس بائیس سال کی خوبصورت لڑکی ہے اور اس کو

گھر لے جانے پر میری بیوی میرے متعلق کوئی غلط رائے بھی قائم کر سکتی ہے۔ میرے ذہن میں آیا تھا کہ میں اسے دارالامان تک پہنچا دوں مگر نہ ہی اس پہ وہ راضی ہے اور نہ میں مطمئن ہوں کیونکہ اخبار میں جب اس کی داستان منظرِ عام پہ آئے گی تو اس کے والدین کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہیں گے۔ میں نے بہت سوچا آخر اس فیصلے پر پہنچا ہوں کہ اس کے بارے میں تم سوچو''۔ دروازے سے چند قدم ہٹ کر رشید نے مجھ سے یہ سب کچھ کہہ دیا اور میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''تو کیا تم اسے اپنے ہمراہ لے آئے ہو؟'' میں نے استفسار کیا۔

''ہاں میں اسے ساتھ لے آیا ہوں''۔

''گھبراؤ نہیں دوست کہ تم اسے صحیح جگہ پہ لے آئے ہو۔ میرے گھر میں وہ بیٹی اور بہن بن کر رہے گی''۔ میں نے رشید کے ہمراہ ٹیکسی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

رشید نے اس سے میرا مختصر تعارف کرایا۔ اس کے بعد میں اسے ٹیکسی سے نکال کر اپنے گھر لے آیا۔ گھر والوں سے میں نے اس کے بارے میں مختصراً اس کا ذکر کیا۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا جب امی نے اسے بہ خوشی اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ صبح ناشتہ کر کے رشید ٹیکسی لے کر لاہور چلا گیا اور میں سوچنے لگا کہ معاشرے نے جس لڑکی سے اس کا سب کچھ چھین لیا ہے اس معاشرے کو اس لڑکی کے بارے سوچنے پر مجبور کرنا اور لوگوں سے اس کے لئے عزت کی زندگی گزارنے کا حق مانگنا یقیناً میرے فرائض میں داخل ہو چکا ہے۔ میں نے نائلہ کی کہانی سنتے ہی یہ تہیہ کر لیا تھا کہ میں اس کی خوشیاں واپس لانے کے لئے پوری کوشش کروں گا۔ لیجئے نائلہ کی کہانی اس کی زبانی سنئے۔

وہ کہنے لگی۔

یہ تین سال پہلے کی کہانی ہے۔ میں میٹرک کا امتحان دے کر فارغ ہو چکی تھی۔ چونکہ نتیجے کا انتظار تھا لہٰذا زندگی بڑی بے کیف سی گزر رہی تھی۔ وہ تھی اور اس کی نوجوانی کی سوچیں۔ عجیب عجیب سوچیں۔ مستقبل کے سہانے سپنے۔ کسی ان دیکھے شہزادے کی بانہوں میں سمٹ جانے کا تصور۔ معصوم قہقہوں کی گونج۔ مستقبل کی خیالی جنت کے خاکے یا پھر شب و روز مختلف اخبارو ں اور رسالوں کا مطالعہ۔ یہ تھی ایک بھولی بھالی اور معصوم نائلہ کی دنیا۔ اسے کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ ماں باپ، بہن بھائیوں کا پیار بھی تھا اور پیاری پیاری سہیلیوں کا خلوص بھی۔

کوئی کمی نہ ہونے کے باوجود بھی اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کی زندگی میں کوئی خلا ہے۔ تعلیمی سلسلہ منقطع ہو جانے کی وجہ سے کوئی کام وغیرہ تو تھا نہیں اس لئے اس کا اکثر وقت رسائل کے مطالعہ میں گزرتا تھا۔

اس دور میں موبائل نہیں آیا تھا۔ ایک روز ایک رسالے میں ''قلمی دوستی'' کے کالم میں قلمی دوستی کے خواہشمند بہن بھائیوں کا تعارف پڑھتے پڑھتے وہ چونک سی گئی۔ یہ کسی لڑکی کا تعارف تھا۔ لکھا تھا۔ ''میرا عقیدہ ہے کہ اولادِ آدم کو اس دنیا میں محض اس لئے بھیجا گیا ہے کہ وہ دیکھے اور ان دیکھے لوگوں کے لئے پہچانِ وفا بن کر زندہ رہے۔ میرے پاس سہیلیوں کی کمی نہیں ہے پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے ایک ایسی سہیلی کی تلاش ہے جو میرے لئے صحیح معنوں میں بہن ثابت ہو اور جسے میں خلوصِ دل سے پیار کروں''۔ غزالہ کراچی۔

غزالہ کے تعارف نے مجھے بہت متاثر کیا۔ دو دن اور دو راتیں وہ متواتر غزالہ کے خیالی پیکر کو ایک بے لوث سہیلی کے روپ میں دیکھتی رہی اور پھر میں

نے غزالہ کو خط لکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ اپنی زندگی کا منحوس ترین فیصلہ۔ ایک ایسا فیصلہ جس نے اس کی زندگی کو جیتے جی جہنم زار بنا دیا۔ اس نے غزالہ کو خط لکھ دیا۔ چند روز بعد اس کے خط کا جواب آ گیا۔ خلوص، چاہت اور اپنائیت میں ڈوبی ہوئی تحریر۔ غزالہ کے خط سے سب ہی متاثر ہوئے تھے۔ نغمہ، نصرت اور عندلیب اس کی سب سہیلیوں نے غزالہ کے لئے اچھے جذبات کا اظہار کیا تھا اور ان سہیلیوں نے حسرت سے سوچا تھا کہ کاش وہ بھی غزالہ کو خط لکھ سکتیں لیکن وہ غزالہ کو خط نہیں لکھ سکتی تھیں کیونکہ ان کو اجازت نہیں تھی۔ اس کی ان سہیلیوں کے خاندانوں میں لڑکی کا کسی بھی انجان لڑکی کو خط لکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔

نائلہ نے غزالہ کے اس خط کا جواب دے دیا اور پھر ان دونوں میں بڑی تیزی کے ساتھ خطوط کا تبادلہ ہونے لگا۔ وہ دونوں ایک ہی شہر میں ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھیں۔ ان دیکھی تھیں مگر ایک دوسرے کو ملنے اور دیکھنے کے لئے بے تاب۔ غزالہ نے اس کو اپنے گھر بلایا مگر اس نے پہلے غزالہ کو آنے کے لئے کہا اور پھر ایک روز غزالہ سچ مچ اس کے گھر آ گئی۔ غزالہ کو دیکھ کر تو نائلہ نے خود کو آسمان پر اڑتے ہوئے محسوس کیا۔ نائلہ بہت خوش تھی جیسے اسے قارون کا خزانہ مل گیا ہو۔ غزالہ بیس بائیس سال کی ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ جب نائلہ کے گھر آ کر اس نے اپنا تعارف کرایا تو نائلہ غزالہ باجی کہہ کر اس سے چمٹ گئی۔ غزالہ نے اسے یوں سینے سے لگا لیا جیسے سچ مچ وہ اس کی سگی بہن ہو۔ غزالہ شام تک نائلہ کے گھر رہی اور پھر چلی گئی۔ چند گھنٹوں کی ملاقات میں وہ دونوں یوں گھل مل گئیں جیسے برسوں کی شناسا ہوں۔ جیسے وہ ایک ہی گھر اور ایک ہی ماحول کی پروردہ ہوں۔

غزالہ کے تعارف کے مطابق وہ سیکنڈ ایئر کی طالبہ تھی اس کے ابا فوت ہو چکے تھے اور وہ اپنی والدہ اور بڑے بھائی کے ساتھ رہ رہی تھی۔ اس کے بھیا فوٹوگرافی کا کام کرتے تھے اور امی سلائی وغیرہ کر کے گھریلو اخراجات پورے کر رہی تھی۔ غزالہ کے تعارف کا یہ رخ نائلہ کے گھر انتہائی قدر و منزلت سے دیکھا گیا۔ اس دن واپسی پہ نائلہ بس سٹاپ تک اس کو رخصت کرنے گئی اور اس نے نائلہ سے اپنے گھر آنے کا وعدہ بھی لے لیا۔ نائلہ کے مان جانے کے بعد غزالہ نے نائلہ کو جو خط لکھا اس میں اس نے بہت سی دوسری باتوں کے علاوہ نائلہ کو اس کے وعدے کی یاددہانی بھی کروادی تھی۔ دن گزرتے رہے، پھر ایک دن نائلہ اپنی والدہ سے اجازت لے کر غزالہ کے ہاں چلی گئی۔

غزالہ اس روز اپنے گھر میں اکیلی تھی۔ اس کی امی کہیں گئی ہوئی تھی اور اس کے بھیا اپنے کمرے میں موجود تھے۔ غزالہ نے اس کا تعارف اپنے بھیا پرویز سے کرایا۔ وہ نائلہ کو پرویز کے کمرے ہی میں لے گئی تھی۔ مکان کے اندر سب سے آخری کمرہ جس میں چاروں طرف جابجا دیواروں پر عورتوں کی نیم عریاں تصاویر آویزاں تھیں، ہیجان انگیز تصویریں جس سے نائلہ کو خوف سا آنے لگا۔ نائلہ نے غزالہ سے اس کے بھیا کے اس ذوق کے بارے میں پوچھا۔ غزالہ نے مسکرا کر اس کو ٹال دیا۔ اب وہ دونوں وہیں تھیں کہ پرویز کوک کی دو بوتلیں لے آیا۔ جب وہ دونوں بوتلیں پی چکیں تو پرویز نے غزالہ کو پڑوسیوں کے ہاں سے امی کو بلانے کے لئے بھیج دیا۔ میں ذرا امی کو بلا لاؤں۔ غزالہ نے مسکرا کر کہا اور نائلہ کو پرویز کے ساتھ تنہا چھوڑ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ نائلہ کو غزالہ کا یہ طرز عمل کچھ پسند نہ آیا مگر وہ بے بس ہو کر بیٹھی رہی۔ دفعتہً دروازے کے پٹ بند ہونے کی آواز نے نائلہ کو چونکا دیا۔ پرویز اندر سے دروازے کی کنڈی چڑھا رہا تھا۔ خوف کی ایک لہر نائلہ کے تن بدن میں دوڑ گئی، وہ بدحواس ہو کر کھڑی ہو گئی۔

اس نے پرویز سے احتجاج کرنا چاہا مگر اس کو اپنے حلق میں سیٹیاں سی بجتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ پرویز کی آنکھوں میں وحشت ناچ رہی تھی اور لبوں پر شیطانی مسکراہٹ لئے وہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ تم کتنی سندر ہو نائلہ! پرویز نے اس کے کندھوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور نائلہ کا ہاتھ طمانچہ بن کر پرویز کے گال پہ پڑا اور ساتھ ہی وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ پرویز نے بھرپور قہقہہ لگایا۔ نائلہ نے دروازہ کھولنا چاہا مگر دروازہ باہر سے بند تھا۔ غزالہ باجی! اس نے چیخ کر پکارا مگر اس کی آواز اتنی دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی جیسے کسی کنوئیں کے اندر سے آ رہی ہو۔

''اپنے طمانچے کا مزہ چکھے بغیر تم یہاں سے نہیں جا سکتیں میری جان!'' پرویز نے اس کو بازو سے کھینچتے ہوئے کہا۔ نائلہ نے چیخنا چاہا مگر پرویز کے مضبوط ہاتھوں نے اس کی آواز کو اس کے حلق ہی میں دبا دیا۔ بے بس نائلہ ہوس کی سولی چڑھا دی گئی۔ دفعتہً دوازہ کھلا اور غزالہ مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں فلش کیمرہ تھا۔ نائلہ نے خدا اور رسول کے نام پر غزالہ سے التجا کی۔ اپنی عزت کے لئے، اپنے خاندانی وقار اور ناموس کے لئے مگر غزالہ تو عورت کے روپ میں ڈائن ثابت ہوئی۔

کمرے میں بجلی کوندتی رہی اور نائلہ کے جسم کی مختلف زاویوں سے تصویریں لی جاتی رہیں۔ نائلہ لٹ گئی، اس کا مستقبل تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ اس اچانک سانحہ سے وہ اپنے حواس کھو بیٹھی اور جب اسے ہوش آیا تو کمرے میں سناٹا تھا۔ پرویز اور غزالہ کمرے سے باہر جا چکے تھے۔ اس نے اپنی بے بسی کا یہ عالم

دیکھا تو دھاڑیں مار مار کر روئی۔ اس نے اپنے کپڑے درست کیئے اور دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازہ اب بھی باہر سے بند تھا۔ وہ بے ہوش ہو کر فرش پر گر پڑی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ غزالہ اتنی مکار ثابت ہو گی۔ اتنی کم ظرف اور نیچ بھی ہو گی۔ اس کو خلوص نے ڈس لیا تھا۔ قلمی دوستی نے اس کو برباد کر دیا تھا۔ آہ کتنا بڑا فریب کھایا تھا اس نے دوستی کے نام پر۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور غزالہ کمرے میں داخل ہوئی۔ نائلہ نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔

''نائلہ!'' اس نے نائلہ کو مخاطب کیا۔

''ذلیل عورت تُو انسانیت کے نام پر بدنما داغ ہے''۔ نائلہ نے نفرت سے غزالہ کے منہ پر تھوک دیا۔

''پیدائشی طور پر کوئی بھی بُرا نہیں ہوتا نائلہ! حالات اور مجبوریاں ہی انسان کو بُرا بنا دیتی ہیں۔ میں بھی کبھی تمہاری طرح ایک پاکباز لڑکی تھی مگر...... آہ میرا کوئی بھائی نہیں تھا۔ پرویز کا قلمی دوستی کے لئے تعارف شائع ہوا تھا۔ اسے بہن کی تمنا تھی۔ میں نے اس کو خط لکھ دیا اور پھر ایک دن یہی دھوکہ میرے ساتھ بھی ہوا۔ پرویز نے میری عصمت لوٹی تو میں نے گھر واپس جانے کی بجائے زمانے سے اپنی لٹی ہوئی عصمت کا انتقام لینے کا فیصلہ کر لیا۔ میں پرویز کی ساتھی بن گئی اور اس کے ساتھ گھر سے بھاگ آئی۔ اب تم بتاؤ کیا ارادہ ہے؟''

''غزالہ! میرا ضمیر زندہ ہے اور بے داغ بھی۔ میں اپنے گھر جاؤں گی''۔

''تم گھر جا سکتی ہو مگر کبھی کبھار یہاں آتے رہنے کے لئے''۔ پرویز نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ نائلہ نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ ''دیکھو اگر تم نے ہمارے کہنے پہ عمل نہ کیا تو تمہاری تصویریں تمہارے رشتہ داروں اور اہل محلہ تک پہنچا دی جائیں گی''۔ پرویز نے دھمکی دی اور پھر نائلہ کو ٹیکسی میں بٹھا کر چلا گیا۔

نائلہ اپنے گھر پہنچ کر چپ چاپ اپنی بے بسی پہ آنسو بہاتی رہی۔ اس نے کیا سوچا تھا اور کیا ہو گیا تھا۔ تیسرے روز وہ پھر غزالہ کے ہاں چلی گئی۔ غزالہ اور پرویز سے انسانیت کے نام پہ التجا کرنے مگر پرویز نے اس کی التجا کی قیمت پانچ ہزار روپے لکھ دی۔ پانچ ہزار روپے اس کی ان تصویروں کی قیمت جن کے منظر عام پر آنے سے ان کا خاندانی وقار ملیا میٹ ہو سکتا تھا مگر وہ پانچ ہزار کہاں سے لاتی۔ اس کے والدین اتنے امیر کہاں تھے اور پھر وہ یہ روپے کس طرح مانگتی۔

''میں یہ رقم کہاں سے لاؤں؟'' اس نے پرویز سے التجا کی۔

''یہ رقم اکٹھی کرنا تمہارے لئے چنداں مشکل نہیں ہے''۔ پرویز نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور یوں وہ در پردہ پرویز کے اشاروں پہ ناچنے لگی۔ وہ ایسا کرنے پہ مجبور تھی۔

ایک عرصہ تک وہ گناہ کی اس دلدل میں ڈوبی رہی۔ آخر اس کے والدین کو اس کے معمولات پہ شک ہونے لگا اور یوں اسے گھر کی چاردیواری میں محصور کر دیا گیا۔ یوں والدین کے شبہات کافی حد تک اور پختہ ہو گئے۔ نیز اس عرصہ میں اسے غزالہ کے چند خطوط ملے جن میں اسے ملنے کی تاکید کی گئی تھی۔ آخری خط تو خاصا دھمکی آمیز تھا۔ اس دوران غزالہ اور پرویز نے اپنا مکان بھی بدل لیا تھا۔ بہرحال وہ پھر مجبوراً ان سے ملی اور پھر سے پرویز کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن گئی۔

پرویز نے رفتہ رفتہ اسے عورت سے طوائف بنا دیا تھا۔ وہ اس کی عصمت نیلام کر کے پورے کئی ہزار کما چکا تھا مگر ابھی تک اس کے پانچ ہزار روپے نہیں ہوئے تھے۔ پھر ایک روز ایک عجیب حادثہ پیش آ گیا۔ نائلہ کا

خالہ زاد بھائی سہیل جو کہ اس کا منگیتر بھی تھا ایک روز پرویز کے اڈے پر اس کا گاہک بن کر آ گیا۔ سہیل نے جب نائلہ کو اس روپ میں دیکھا تو نفرت سے منہ پھیر کر چلا گیا۔ سہیل تو چلا گیا تھا مگر نائلہ فرطِ غم سے بے ہوش ہو گئی۔ وہ ماں باپ کی جس عزت کے لئے پرویز کے مظالم سہہ رہی تھی آج اس عزت کا بھرم کھل گیا تھا۔ اس نے روتے روتے پرویز سے کہہ دیا اور پرویز نے چند گھنٹوں کے اندر اندر وہ مکان بھی بدل لیا۔ اب نائلہ نے بھی گھر نہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ آخر وہ کیا منہ لے کر والدین کے گھر جاتی۔ غزالہ اور نائلہ کے علاوہ بھی چند ایک لڑکیاں پرویز کی سیاہ کاریوں کا نشانہ بن کر اس کے ظلم کے جال میں الجھی ہوئی تھیں۔ چند ہی روز بعد وہ ان سب کو لے کر کراچی سے لاہور آ گیا۔ لاہور آ کر اس نے غزالہ کے علاوہ باقی سب کو کوٹھے والوں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ نائلہ سب سے آخر میں فروخت ہوئی۔ نائلہ کوٹھے پہ پہنچ کر دن رات بکتی رہی۔ ڈیڑھ سال تک وہ کراچی میں پرویز کے ظلم کا نشانہ بنتی رہی اور ڈیڑھ سال سے ہی وہ یہاں مختلف کوٹھوں پر فروخت ہوتی رہی۔

جس رات وہ میرے دوست ٹیکسی ڈرائیور رشید کو ملی تھی اس رات وہ ایک بڑے لیڈر کے لئے بک ہو کر کوٹھے سے کوٹھی میں لے جائی گئی تھی۔ اس روز یوم آزادی تھا نا اور اس یوم آزادی کی یاد میں اس لیڈر نے ایک دھواں دھار تقریر کی تھی اور اب شام آزادی منانے کے لئے اسے عورت کی ضرورت تھی اور وہ عورت نائلہ تھی مگر نائلہ موقع ملتے ہی وہاں سے بھاگ نکلی تھی۔ وہ گناہوں کی اس زندگی سے تنگ آ چکی تھی۔ اس زندگی سے اسے مر جانا زیادہ عزیز تھا مگر کوٹھے پہ اسے مرنے بھی نہیں دیا جاتا تھا۔ وہ ایک شریف خاندان کی بیٹی تھی۔ حالات نے اگرچہ اس کو گناہوں کی دلدل میں دھکیل دیا تھا لیکن اس کے باوجود بھی اس کے ضمیر میں نیکی کی چنگاری سلگتی رہتی تھی۔ وہ تنہائیوں میں اکثر جب اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتی تو اس کے اندر کی نائلہ پھر سے بیدار ہو جاتی۔ وہ نائلہ جو زمانے کے ظلم و ستم کے ہاتھوں اپنی آرزوؤں کا قبرستان بن چکی تھی۔

اب جونہی اسے موقعہ ملا تو آرزوؤں کے قبرستان میں زندہ درگور اس کے ضمیر کی چنگاری پھر سے بھڑک اٹھی تھی۔ وہ گزشتہ تین سال سے گناہوں کی آگ میں جل رہی تھی لیکن اس کے باوجود اس کے اندر کی عورت زندہ تھی۔ لہٰذا جونہی اسے موقعہ ملا بھاگ نکلی مگر اس نے زندہ رہنے پر موت کو ترجیح دینے کا عزم کر لیا۔ وہ مرنے جا رہی تھی لیکن قدرت نے اسے رشید سے ملا دیا۔ رشید انسان تھا۔ اس نے انسانیت کا فرض ادا کیا اور اسے موت کے منہ سے چھین کر لے آیا۔

نائلہ سسکیاں بھرتی ہوئی خاموش ہو گئی۔ میری آنکھیں بھی برس رہی تھیں۔ رشید رو رہا تھا۔ میری والدہ آنسو بہا رہی تھی۔ عجیب طرح کی سوگواریت طاری تھی ماحول پر۔ میرے اندر کی دنیا تہہ و بالا ہو رہی تھی لیکن میں قہر درویش بر جانِ درویش کے مصداق کچھ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ میں نے کئی ایک معززین سے یہ مشورہ کیا لیکن ایک خوبصورت عورت کے لئے کسی کے دل میں وہ جذبہ نہیں تھا جسے انسانیت کہا جاتا ہے۔ پھر بھی میں اس کی ڈھارس بندھاتا رہا۔ والدہ اس کو دلاسے دیتیں، اسے صبر کی تلقین کرتیں اور نائلہ فرطِ جذبات سے میری امی کے گلے لگ کر رونے لگتی۔

کہتے ہیں کہ نیت نیک ہو تو اللہ کوئی نہ کوئی سبیل پیدا کر دیتا ہے۔ میں نائلہ کے لئے بہت پریشان تھا کہ اگلی صبح اچانک ایک زوردار دستک کی آواز پر میں دروازہ کھولنے گیا تو سامنے حارث کو کھڑے دیکھ کر

حیران رہ گیا۔ حارث تم اور بغیر اطلاع کے۔
''جی ہاں مرزا جی اسے کہتے ہیں سرپرائز۔ ابا کی تبدیلی گوجرانوالہ ہوگئی ہے۔ وہ دو ایک روز میں چارج لے لیں گے۔ میں صرف آپ کو یہ خوشخبری دینے آیا ہوں''۔

''حارث میرے بھائی!'' میں نے فرط جذبات سے حارث کو بانہوں میں بھر لیا۔ حارث میرے جگری دوستوں میں سے تھا اور پڑوسی بھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں ہر طرح کی مشاورت اسی سے کیا کرتا تھا۔ اس کے والد گوجرانوالہ پولیس میں بڑے آفیسر تھے اور ان کی دیانت اور فرض شناسی کے بڑے چرچے تھے۔ کوئی راہ نہ پاکر میں نے یہ سب کچھ حارث سے کہہ دیا۔ رات نو بجے کے قریب حارث اپنے والد کے ہمراہ ہمارے گھر آ گیا۔ نائلہ سے پوری داستان سننے کے بعد اور غزالہ اور پرویز کی کارگزاریاں جان کر غصے سے ان کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں نائلہ سے مخاطب ہوئے۔

''بیٹی! میں تمہاری لٹی ہوئی عزت تو واپس نہیں کر سکوں گا تاہم ان ہاتھوں کو ضرور توڑ دوں گا جو تم پر ظلم کرتے رہے ہیں۔ میں پرویز اور غزالہ کو زمین کی تہوں سے کھینچ لوں گا۔ نشانِ عبرت بنا دوں گا دنیا والوں کے لئے۔ یہاں تم ہر طرح سے محفوظ ہو، سکون سے رہو اور دعا کرو کہ اللہ مجھے مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کی ہمت دے''۔ وہ رومال سے آنکھیں پونچھتے اٹھ کر گھر چلے گئے۔

اور پھر وعدے کے مطابق اس نیک نفس پولیس آفسر نے بہت جلد پرویز اور اس کے پورے گینگ کو گرفتار کرلیا۔ ملزمان کی نشاندہی پر ہیرا منڈی سے پانچ چھ لڑکیاں بھی برآمد کرلیں۔ بہت جلد جرائم کی لمبی چوڑی فہرست کے ساتھ مجرموں کا چالان کر کے عدالت میں پیش کر دیا گیا اور تیسری ہی پیشی میں انہیں دس دس سال قید بامشقت کی سزا سنا دی گئی۔ پرویز کا ان کے خلاف کیس بنیادی طور پر اس قدر مضبوط تھا کہ قید کے آخری دن تک اس میں ضمانت کی گنجائش نہیں تھی۔ نائلہ کے علاوہ سب لڑکیوں کو دارالامان بھجوا دیا گیا۔ پھر اس فرشتہ سیرت تھانیدار نے ایک ایک کر کے بچیوں کے لواحقین سے رابطے کئے۔ کسی کو اپنے پاس بلایا تو کسی کے پاس خود چلے گئے۔ یوں مہینے ڈیڑھ کے اندر اندر سب لڑکیاں اپنے اپنے والدین کے گھر پہنچ گئیں۔

نائلہ کے والدین سب سے آخر میں آئے۔ سہیل (نائلہ کا منگیتر) بھی ساتھ ہی تھا۔ نائلہ سے مل کر سب ہی جی بھر کے روئے۔ رات کے کھانے کے بعد خالد صاحب بھی تشریف لے آئے۔ رسمی سی خیر خیریت کے بعد وہ ان لوگوں سے مخاطب ہوئے۔ سارے حالات سنانے کے بعد وہ سہیل سے کہنے لگے۔

''سہیل بیٹے! اس دھرتی پہ رشتے نہیں انسان بستے ہیں اور غلطی انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ سہیل! اگر تم اپنی سفلی خواہشات کے قدموں پر چل کر کسی کے جسم سے کھیلنے پرویز کے اڈے تک جا سکتے ہو تو تمہاری منگیتر کا کردار تمہاری نسبت انتہائی اجلا اور شفاف ہے کیونکہ اس بے چاری کو تو قدم قدم پر اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف لٹنا پڑا تھا۔ نائلہ نے یہ سب کچھ جان بوجھ کر نہیں کیا۔ بلاشبہ یہ دنیا کا سب سے بڑا سچ ہے کہ حالات کی شکست و ریخت میں انسان کے مقدر کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ کسی بھی حادثے کو جب رونما ہونا ہوتا ہے تو اس کے اسباب خود بخود پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ انسان لاکھ سنبھلنے کی کوشش کرے لیکن ...... یہ وہ ہوتی ہے جو ہو کر رہے گی ہر بہانے سے۔

کے مصداق وہ کچھ ہو کر رہتا ہے جو اللہ کو منظور ہو۔۔۔

"سہیل بیٹے! تقدیر تمہاری بہن کو بھی اس مقام تک لے جا سکتی تھی۔" میں نے دیکھا کہ یہ سن کر سہیل پورے جسم سے کانپ گیا۔ اس کے چہرے کی رنگت یکدم تبدیل ہو گئی اور وہ حلق کے بل چیخا۔

"بس کریں انکل خدارا بس کریں ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ انکل! اور میں آپ سب لوگوں سے معذرت خواہ ہوں۔ اپنے کئے پر شرمندہ ہوں۔ میں اللہ سے اپنے کئے معافی مانگتا ہوں"۔ وہ سر محفل دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ محفل پر سناٹا چھا گیا تھا۔ جب اچھی طرح سہیل کے دل کا غبار نکل گیا تو خالد صاحب نے اٹھ کر اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"شاباش بیٹے! تم نے بہت اچھا کیا کہ اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا۔ اٹھو! اور اپنی عزت کی دھجیاں سمیٹ لو کہ یہی تمہارے گناہوں کا کفارہ بھی ہے اور اللہ کی رضا بھی۔ اٹھو اور صدق دل سے ایک نئی اور خوبصورت زندگی کا آغاز کرو"۔ سہیل نے نائلہ کے پاؤں پکڑتے ہوئے کہا۔

"خدا کے لئے مجھے معاف کر دو کہ میں زندگی بھر تمہارے پاؤں دھو دھو کر پیتا رہوں گا"۔

"نہیں میرے آقا! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں"۔ نائلہ نے پاؤں سمیٹتے ہوئے کہا۔ "یہ سب میرا مقدر تھا آپ پریشان نہ ہوں۔ میں ان شاء اللہ زندگی بھر آپ کی دل و جان سے خدمت کرتی رہوں گی۔ آپ کی زندگی میں خوشیوں کے رنگ بھرتی رہوں گی۔" شدت جذبات سے دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔

اگلے روز جمعتہ المبارک تھا۔ نماز جمعہ کے فوراً بعد ایک سادہ سی تقریب میں نائلہ اور سہیل کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیا گیا۔ خالد صاحب کے علاوہ میں نے بھی بطور گواہ نکاح نامے پر دستخط کئے۔ پھر خالد مجھ سے کہنے لگے شبیر بیٹے! اب ہفتہ دس دن مہمانوں کی خدمت کرو۔ دولہا دلہن کی دعوتیں کرو اور یہ کل میرے گھر سے شروع کرو۔ انہیں لاہور دکھاؤ، گوجرانوالہ کے چڑے کھلاؤ۔ اس ضمن میں حارث آپ کی ہر ممکن مدد کرے گا"۔

خالد صاحب جانے لگے تو نائلہ کے والدین ان کے پاؤں سے لپٹ گئے۔ "خالد بھائی! یقین نہیں آتا کہ انسان دوسروں کے لئے اتنا ہمدرد بھی ہو سکتا ہے"۔

"بزرگوار! مجھے گنہگار نہ کرو کہ میں نے آپ لوگوں کے لئے کچھ نہیں کیا"۔ وہ نائلہ کے والدین کو اوپر اٹھاتے ہوئے کہنے لگے۔ "میں نے جو کچھ بھی کیا اس ذات پاک کی خوشنودی کے لئے کیا ہے جس کے سامنے ہم سب کو جوابدہ ہونا ہے۔ اللہ کا شکر کرو کہ اس نے، آپ لوگوں کو کسی لمبی آزمائش میں نہیں ڈال دیا"۔ وہ باہر نکل گئے اور ہم دیر تک دروازے کی ہلتی ہوئی زنجیر کو دیکھتے رہے۔

کوئی دس بارہ روز بعد خالد صاحب نے انہیں کراچی کے ٹکٹ اور دیگر ڈھیروں تحائف دے کر گوجرانوالہ سٹیشن سے رخصت کیا۔ گاڑی تیز ہوتے ہوتے نظروں سے اوجھل ہو گئی اور میں بہ چشم نم دیر تک فضا میں گزرے حالات کی بنتی بگڑتی تصویریں دیکھتا رہا کہ اچانک حارث نے میرا کندھا جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"رو نہیں دوست کہ تم نے بہت بڑی نیکی کی ہے اور پھر اللہ نے اس نیکی کو قبول بھی کر لیا ہے"۔ میں شدت جذبات سے حارث کے گلے لگ گیا۔

❀❀❀

سلسلہ وار ناول

قسط: 2

لاڈو رانی

دعا نے بھی محمود کے چہرے پر خفگی دیکھ لی تھی، مگر وہ ایسی باتوں کو خاطر میں لانے والی نہیں تھی۔ اس کے نزدیک خفا ہونا صرف اس کا حق بنتا تھا اور آج تک وہ اس حق کا بے دریغ استعمال کرتی آرہی تھی۔

(aqibkohlar@gmail.com)

محبت کئی رنگ بدلتی ہے، لیکن جب شفقت وعقیدت، محبت کے روپ میں ڈھلتی ہے تو ایسی ہی کہانیاں جنم لیتی ہیں

''محمود بیٹا!..... کھانا لگ گیا ہے۔'' شاہینہ ماسی کی آواز اُسے ماضی کی یادوں سے واپس کھینچ لائی۔

''طبیعت ٹھیک نہیں ہے ماسی، میں تھوڑی دیر آرام کروں گا۔'' اس نے کمبل میں منھ چھپالیا۔

شاہینہ ماسی نے پوچھا۔''یہیں لے آؤں بیٹا۔''

''نہیں، بھوک لگی تو بعد میں کھالوں گا۔''

اور وہ ''ٹھیک ہے بیٹا!'' کہہ کر خواب گاہ سے نکل گئی۔

تھوڑی دیر بعد رضوان اور رخسانہ وہاں پہنچ گئے۔''کیا ہوا بیٹا۔'' رضوان نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

''چچا جان!..... پریشانی کی کوئی بات نہیں۔سر میں ذرا سادرد تھا۔''

''دوائی لے لی۔'' رخسانہ نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر ٹمپریچر دیکھا۔

وہ پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔''ایسی بھی کوئی بات نہیں چچی جان!..... ہلکا پھلکا درد تو چلتا رہتا ہے۔''

''ویسے ہلکے پھلکے درد کی وجہ سے بھی کھانا نہیں کھایا ہے۔'' رضوان معنی خیز لہجے میں بولا۔ رخسانہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

''اب تک ناراض ہے۔''محمود نے لہجے میں مصنوعی حیرانی پیدا کی۔

رضوان ہنسا۔''یہ بھی خوب کہی۔''

''آپ نے لڑائی کی وجہ نہیں بتلائی؟'' رخسانہ، شوہر سے پوچھنے لگی۔

''پہلے بھی کبھی مناسب وجہ پر لاڈورانی خفا ہوئی ہے۔'' رضوان نے منھ بنایا۔

''ملازمہ، جگ گلاس کے ٹوٹنے کا کچھ کہہ رہی تھی۔'' رخسانہ نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

محمود سرعت سے بولا۔''مجھ سے گر گیا تھا چچی جان!''

''یقیناً سچ کہہ رہے ہو، بہت بے پروا اور نکمے ہو تم۔'' رخسانہ نے اس انداز میں کہا کہ رضوان کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''آپ نے تو ہنسنے کا ٹھیکا لے رکھا ہے۔جوان بیٹی کی حرکتوں کے بارے نہ سوچنا۔'' رخسانہ جلے کٹے انداز میں بولی۔

''دیکھو بیگم،ہوا کچھ یوں ہے کہ میں نے محمود میاں کو کسی کام سے دفتر بھیجا اور ہماری بٹیا بھی ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئی۔محمود میاں کا کوئی ضروری کام تھا اس نے ہلکی سی معذرت کی۔اس کے بعد جگ گلاس کیسے ٹوٹا یہ مجھے کوئی خاص معلوم نہیں، بس چھناکے کی آواز میں نے سنی تھی۔اس کے بعد محمود میاں کو باورچی خانے میں نیا جگ گلاس اٹھا کر وہاں رکھتے بھی میں نے گناہ گار آنکھوں سے دیکھا ہے یہ ہے کل کہانی۔اب آپ خود انصاف کریں۔کیا محمود میاں کو اتنی بڑی زیادتی کرنا روا تھا۔'' رضوان نے دونوں ہاتھ پھیلا کر گویا اس زیادتی کا حجم بھی بتا دیا تھا۔

''چچ..... چچ..... چچ۔اتنی بڑی زیادتی۔'' رخسانہ نے بھی افسوس بھرے انداز میں سر ہلایا۔''اس بات پر تو بھوک ہڑتال بنتی ہے نا لاڈو کی۔''

''چچا جان!.....وہ سوئی ہوئی تھی۔کیا اسے کھانے کے لیے جگایا بھی تھا یا ویسے ہی آپ دونوں ہمارا مذاق اڑائے جا رہے ہیں۔''

رخسانہ نے منھ بناتے ہوئے کہا۔ ''محترم! ملازمہ تین بار بلانے گئی تھی۔اس کا بدتمیزانہ جواب ہم نے تو کھانے کی میز پر بیٹھے ہوئے سن لیا تھا آپ پتا نہیں کن خیالوں میں کھوئے تھے۔''

''اچھا میں اسے کھلا دیتا ہوں۔'' پریشانی بھرے

انداز میں سر ہلاتے ہوئے وہ اٹھ بیٹھا۔

''جی جناب!... اسے کھلانا ہے یا نہیں، خود کھا لو۔'' رخسانہ چچی شفقت بھرے انداز میں اسے جھڑکتے ہوئے باہر نکل گئی۔ رضوان چچا بھی آنکھ مار کر مسکراتا ہوا نکل گیا تھا۔

دعا کی خواب گاہ تک جانا اتنا مشکل لگ رہا تھا گویا اسے آگ میں گھسنا پڑ رہا ہے۔ پہلے تو گھر میں اس کی پسندیدہ جگہ دعا کی خواب گاہ ہوتی تھی۔ وہ بہت لاابالی طبیعت کی مالک تھی۔ اس کے سامان کو ترتیب سے رکھنا۔ ملازمہ سے کپڑے استری کروا کر الماری میں لٹکانا، شام کو دودھ کا گلاس اپنی نگرانی میں پلانا، اس کی پڑھائی پر دھیان دینا، سردیوں گرمیوں میں اس کے لباس اور کھانے پینے کا خیال رکھنا۔ گویا وہ سارے کام جو رخسانہ چچی کے کرنے کے تھے اس نے اپنے ذمہ لے رکھے تھے۔ اس عمر تک پہنچتے ہوئے اکثر لڑکیاں گھر کے سارے کام سنبھال لیتی ہیں مگر محمود کے بے جا لاڈ نے دعا کو کسی کام کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ اس کے نہ منانے کی صورت میں دعا نے رات بھر بھوکا رہنا تھا۔ اور ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا کہ وہ خفگی ظاہر کر رہی تھی۔ یہ تو آئے روز کا معمول تھا۔ ذرا سی بات کیا ہوئی، اس کی ناراضی شروع۔ چچا چچی اور بھائی تو اس کی اس عادت سے سخت نالاں تھے۔ بلکہ تمام محمود کا مذاق اڑانے سے بھی باز نہیں آتے تھے، لیکن اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ اس کی موجودی میں دعا بھوکی سو جائے یہ کسی طور بھی ممکن نہیں تھا۔ پر آج اسے دعا کے قریب جانے کے خیال ہی سے وحشت ہو رہی تھی۔ اور یہ تو وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ دعا نے اس کے علاوہ کسی کی بات نہیں سننا تھی۔ اور جتنی بھی دیر ہوتی جاتی اس کی خفگی نے گہرا ہوتے جانا تھا۔

طبیعت پر جبر کرتے ہوئے وہ طوعن وکرہن اٹھا اور اس کی خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔ دھڑکتے دل سے دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا۔ اس نے اوندھے منہ لیٹ کر تکیے میں منہ گھسیڑا ہوا تھا۔ بچپن ہی سے اس کے خفا ہونے کا یہی انداز تھا۔ بے ترتیب ہوتے لباس نے بدن کے کچھ ایسے زاویے نمایاں کر دیے تھے کہ محمود کو نظریں چرانا پڑیں۔ نامعلوم آج کیوں وہ مکمل اور نامحرم عورت لگ رہی تھی۔ حالانکہ عورت ذات میں اس کی دلچسپی نہ ہونے کے برابر تھی۔ اسی وجہ سے تو چچا چچی کے زور پر بھی اس نے ایک بار رشتا ٹوٹنے کے بعد دوبارہ شادی کرنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اس سے چھوٹا فیضان تو شادی کے بعد بیرون ملک سیٹل ہو گیا تھا۔ افنان بھی شادی کر کے ان سے علیحدہ رہ رہا تھا۔ جبکہ اس نے چچا چچی کو کہا تھا کہ وہ دعا کی شادی کے بعد ہی شادی کرے گا۔ اور اب اسے لگ رہا تھا کہ دعا کی شادی جتنا جلدی ہو جاتی اتنا ہی بہتر تھا۔

چادر اٹھا کر اس نے دعا کے وجود پر ڈالی اور بیڈ پر بیٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ ریشمی زلفوں کے لمس نے ایک دم دل کی دھڑکنیں تیز کر دی تھیں۔ اس کی سمجھ سے یہ ناگفتہ بہ حالت باہر تھی۔ اس نے فوراً اپنا ہاتھ واپس کھینچا اور تھوک نگلتے ہوئے منمنایا۔

''گڑیا!...... اٹھو کھانا کھا لو۔'' اس کا یہ انداز بالکل نیا تھا۔ وہ تو پتا نہیں کیسے کیسے پچکارتے ہوئے اس کے لاڈ اٹھاتا۔ اسے کھانا کھانے پر راضی کرتا اور اپنے ناکردہ قصور کی معافیاں مانگا کرتا۔

''آ گئی میری یاد، پتا چل گیا کہ اس گھر میں کوئی بھوکا بھی موجود ہے۔'' خلاف توقع تکیے سے سر اٹھا کر وہ فوراً اٹھ بیٹھی تھی۔ ''جائیں آرام کریں۔ یا ان دوستوں کے پاس تشریف لے جائیں جن سے ملنا مجھ سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ تمام ضروری کام نبٹائیں

مجھے بھوک لگے گی تو کھالوں گی۔''

''ثریا!......میرے سر میں درد ہے پلیز تنگ نہ کرو اور چلو کھانا کھاؤ۔'' دعا کے لال بھبکا چہرے سے نظریں چراتے ہوئے اس نے آہستہ سے کہا۔ پہلے وہ اس کی ایسی باتوں پر مسکرا دیا کرتا۔ ساتھ لپٹا کر گدگدی کرتا، کسی چیز کا لالچ دے کر فوراً راضی کر لیا کرتا، مگر آج اسے سارے طورطریقے بھول گئے تھے۔ جانے دعا میں کیا تبدیلی آگئی تھی۔ لیکن یہ تبدیلی اچانک تو نہیں آسکتی تھی، پھر اسے آج ایک دم کیسے محسوس ہوگئی تھی۔ پچھلے ہی ہفتے خفا ہونے پر، پیٹ میں مسلسل گدگدی کرتے ہوئے وہ اسے مجبور کر کے کھانے کی میز پر لے آیا تھا۔ شاید وہ آج سہ پہر ہی کو چھوٹی بچی سے جوان لڑکی بن گئی تھی۔

''سر میں درد ہے تو آرام کریں، کس نے منت کر کے بلایا ہے۔'' دعا کا لہجہ یونہی بدتمیزانہ ہوا کرتا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ محمود کی نظر میں اس کی کتنی اہمیت ہے۔ گو یہ بدتمیزی اس کے لہجے تک ہی محدود رہتی تھی ورنہ یہ تو سب کو معلوم تھا کہ وہ بھی اسے دل گہرائیوں سے چاہتی ہے۔ کیونکہ دوتین بار محمود کے بیمار ہونے پر وہ رات بھر جاگ کر اس کا سر دبانے کے ساتھ اسے دوائیاں وغیرہ دیتی رہی تھی۔ محمود اور ماں باپ کی لاکھ منتوں کے باوجود وہ سونے پر تیار نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ اگلے دن اس نے اسکول سے بھی چھٹی کر لی تھی۔

''ضد نہیں کرتے گڑیا۔'' جذبات پر قابو پاتے ہوئے وہ کراہنے کے انداز میں بولا۔

''بھیا، آپ کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب لگ رہی ہے۔'' اس کا معمول سے ہٹا ہوا لہجہ اور انداز ایسا نہیں تھا کہ دعا کو پتا نہ چلتا۔ اپنی خفگی پرے پھینکتے ہوئے وہ قریب ہوئی اور اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بخار جانچنے لگی۔ اس حالت میں وہ قریباً اس سے چمٹ گئی تھی۔ یہی اس کی عادت تھی، لیکن محمود پر قیامت گزر گئی تھی، وہ اسے دیکھنے سے وہ نگاہیں چرا رہا تھا اس کے لمس کی تاب اس میں کہاں تھی۔

''مم......میں ٹھیک ہوں۔'' وہ گھبرا کر کھڑا ہوگیا۔

''آپ بالکل بھی ٹھیک نہیں ہیں۔'' اسے کھینچ کر دعا نے بستر پر بٹھایا اور کھڑی ہوگئی۔ ''میں کھانا لے کے آتی ہوں۔ اور ننھے سے بھیا کو اپنے ہاتھوں سے کھلاؤں گی۔'' مزاحیہ انداز میں کہتے ہوئے وہ باہر نکل گئی۔

محمود جانتا تھا کہ اگر وہ اپنی خواب گاہ میں چلا گیا تو اس نے وہاں پہنچ جانا تھا۔ بہ حالت مجبوری وہ اس کی خواب گاہ سے نہ نکلا۔ البتہ اس کے بیڈ سے اٹھ کر صوفے پر جا کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کی نظر دیوار پر ٹنگی دعا کی تصویروں سے الجھ گئی۔ ہر عیسوی سال کے پہلے ہفتے کی تصویر کو اس نے بڑا کروا کر لٹکایا ہوا تھا۔ اوپر کی رو میں دس تصاویر اور دوسری رو میں آٹھ تصاویر یہ اعلان کر رہی تھیں کہ وہ سترہ سال کی ہو کر اٹھارویں سال میں داخل ہو چکی تھی۔ ہر ہفتے اتوار کے دن کھینچی گئی تصاویر کے سالانہ البم محمود کے کمرے میں محفوظ تھے۔ اس کے لیپ ٹاپ کی ہارڈ ڈسک کا زیادہ تر حصہ دعا کی وڈیوز اور تصاویر سے بھرا ہوا تھا۔ یہی حال اس کے موبائل فون کا تھا۔ اس زندگی کے ہر گوشے میں دعا ہی چھائی ہوئی نظر آتی تھی۔ لیکن اس کے دل میں آج سے پہلے نہ تو دعا کے بارے کوئی کھوٹ تھا اور نہ وہ اسے بہن کے علاوہ کچھ نظر آتی تھی۔ بلکہ وہ اس کے لیے بہن سے کچھ بڑھ کر ہی حیثیت رکھتی تھی۔

دعا کی آمد نے اسے سوچوں کے گرداب سے نکالا۔

''بھیا!......آپ نے بتایا ہی نہیں کہ بریانی بنی ہے۔'' چاولوں کی ٹرے میز پر رکھ کر وہ اس کے ساتھ

ہی جڑ کر بیٹھ گئی۔ان کی ہمیشہ سے یہی عادت تھی کہ جب وہ کمرے میں چاول کھاتے تو ٹرے میں کھاتے تھے۔علاحدہ علاحدہ پلیٹ میں چاول ڈالنے کی زحمت انھوں نے کبھی نہیں کی تھی۔

غیر محسوس انداز میں اس سے فاصلہ پیدا کرتے ہوئے وہ چاول کھانے لگا۔اس نے دعا کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔

دو تین چمچ زبردستی چبا کر وہ کھڑا ہو گیا۔''ٹھیک ہے گڑیا! ...تم کھاؤ میں ذرا آرام کرلوں۔''

''یہ بھلا کیا بات ہوئی بھیا!'' دعا نے منہ بسورا۔

''یہ کوئی بات بھی نہیں ہے۔''اس کے سر پر پیار بھری تھپکی دیتے ہوئے محمود نے زبردستی کی مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیری۔''میں دوائی لے کے لیٹ رہا ہوں تم بھی کھانا کھا کر آرام کرو۔''

وہ جلدی سے بولی۔''کھانا کھا کر آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔''

محمود نے بہانہ گھڑا۔''چائے پی لی تو نیند نہیں آئے گی اور مجھے سخت نیند آ رہی ہے۔''

''اچھا میں تھوڑی دیر سر دبانے آؤں گی،آپ کو نیند آنے پر واپس آ جاؤں گی۔''دعا معمول کے مطابق بات کر رہی تھی،جبکہ محمود کو وحشت چھپانے کے لیے عجیب وغریب بہانے گھڑنے پڑ رہے تھے۔

''جب تم سر دباؤ گی تو نیند کیسے آئے گی؟''اس نے پھیکی مسکراہٹ سے گویا دعا کی بے وقوفی اجاگر کی تھی۔

دعا نے منہ بنایا۔''پہلے تو آ جایا کرتی تھی۔''

''جی نہیں پہلے میں جھوٹ بولا کرتا تھا۔'' لہجے میں زبردستی کی شوخی پیدا کرتا وہ اس کے کمرے سے نکل آیا اور دعا عجیب انداز میں اس کی پشت گھورتی رہ گئی۔وہ گہری سوچ میں کھو گئی تھی۔محمود کے جانے کے بعد وہ ایک چمچ بھی منہ میں نہیں ڈال سکی تھی۔

☆☆☆

کمرے میں گھستے ہی اس نے دروازہ اندر سے کنڈی کر دیا۔ایسا وہ زندگی میں پہلی بار کر رہا تھا۔دعا سے کوئی بعید نہیں تھا کہ منع کرنے کے باوجود اس کا سر دبانے بھاگ آتی وہ حتی الوسع اس سے دور رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔

بستر پر لیٹ کر اس نے چادر اوڑھ لی لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔اس کی سمجھ میں اپنی بے قابو ہوتی حالت نہیں آ رہی تھی۔ایسا کیا ہوا تھا جو ایک دم دعا کے بارے اس کے خیالات تبدیل ہو گئے تھے۔دعا کے ساتھ گزارے ماہ وسال اس کی یادداشت میں یوں محفوظ تھے جیسے کل ہی کی بات ہو۔کار والے واقعے پر رخسانہ چچی اتنی برہم ہوگئی تھی کہ اسے گھر سے نکالنے پر تیار ہوگئی تھی۔اور پھر دعا ہی تھی کہ جس کی وجہ سے اس کی سزا پر عمل درآمد نہیں ہوا تھا۔

عمران چچا نے اگلے ہی دن آٹھ لاکھ روپے لا کر اس کے حوالے کر دیے تھے۔کچھ پیسے ان کے پاس پہلے سے موجود تھے کچھ انھوں نے چند مویشی اور اجناس وغیرہ بیچ کر پیدا کر لیے تھے۔

چچا عمران کے رخصت ہوتے ہی اس نے شوروم کا رخ کیا تھا۔سرخ رنگ کی سوزکی مہران اس نے دعا کی خواہش پر پسند کی تھی۔کار کو دیکھ کر دعا خوشی سے دیوانی ہوگئی تھی۔اسے ہنستے اور قلقاریاں مارتے دیکھ کر محمود خوشی سے جھوم اٹھا تھا۔لیکن جونھی کار کے بارے رخسانہ چچی کو معلوم ہوا وہ ہتھے سے اکھڑ گئی تھی۔

''کیا مطلب زمین اور گھر چاچوں کے نام کر دیا ہے۔''رخسانہ نے ہاتھ میں پکڑا نوالا منہ کی طرف لے جانے کے بجائے واپس پلیٹ میں رکھ دیا تھا۔

اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔''چچی جان

!.....میں نے زمین کو کیا کرنا تھا اور پھر گاؤں میں جا کر میں نے تھوڑی رہنا ہے۔''

''تو کہاں رہو گے، کیا ساری زندگی پرائے دروازے پر پڑے رہو گے؟'' رخسانہ چچی نے زہریلے لہجے میں حقیقت اگلی۔ ''یہ گھر تو فیضان اور افنان کا ہے۔''

محمود نے خاموشی سے سر جھکا لیا تھا۔ اس سے کوئی جواب ہی نہیں بن پڑا تھا۔

''اس طرح نہیں کہتے نیک بخت!'' رضوان نے دبے لہجے میں محمود کی طرف داری کی۔

''تو کیا کہوں۔ اور آپ تو اس کی شادی کروانے کے چکر میں ہیں۔ کیا بریرہ بی بی بھی یہیں آ کر ڈیرے جمائے گی۔ یہ یتیم خانہ یا بے گھروں کی پناہ گاہ نہیں میرا گھر ہے۔''

''میں کوئی کرائے کا مکان تلاش کر لوں گا چچی جان!''

''بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔ ہم سے جتنا ہو سکا تمھارے لیے کیا، اب تم اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے ہو۔ بہتر یہی ہے کہ اپنے لیے کرائے کا کوئی گھر تلاش کر لو تاکہ تمھاری خالہ کے پاس جا کر میں بریرہ کے رشتے کی بات کر سکوں۔ یا پھر انھی سے کہو کہ تمھیں گھر بنا کر دیں۔ تمھاری زمین پر بھی تو انھی نے قبضہ کر لیا ہے نا۔''

''قبضہ کہاں کیا ہے اللہ کی بندی!'' رضوان نے دوبارہ مداخلت کی۔

''آپ چپ رہیں جی!..... یہ چھوٹا تھا تو آپ نے من مانی کی ہے۔ اسے پڑھایا لکھایا ہے اچھی نوکری تلاش کر کے دی ہے۔ اب اس کا یہاں کیا کام؟'' رخسانہ چچی کو اس کا زمین دینے کا فیصلہ بالکل ہی پسند نہیں آیا تھا۔

''ٹھیک ہے چچی جان، کل تک کی مہلت دیں۔ میں کرائے کا مکان تلاش کر لیتا ہوں۔'' چچی کی باتیں سن کر اس سے کھانے کا نوالہ نہیں لیا گیا تھا۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ دعا بھی نم آنکھوں سے اسے گھور رہی تھی۔ اس کے میز سے اٹھتے ہی وہ بھی پیچھے بھاگ پڑی۔

''کہاں جا رہی ہو، آرام سے بیٹھ کر کھانا کھاؤ۔'' رخسانہ نے غصے بھرے لہجے میں دعا کو آواز دی لیکن وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے محمود کے کمرے میں گھس گئی۔

رضوان بھی کھانا درمیان میں چھوڑ کر خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔ رخسانہ کے ساتھ دونوں بیٹے ہی بیٹھے رہ گئے تھے۔

''میں آپ کو کہیں نہیں جانے دوں گی۔'' وہ بیڈ پر بہ مشکل بیٹھا ہی تھا کہ دعا اس کے پیچھے کمرے میں پہنچ گئی۔

''گڑیا!..... یہ میرا گھر تو نہیں ہے نا۔ اور تم فکر نہ کرو میں روزانہ اپنی گڑیا کو کار پر سکول چھوڑنے اور واپس لینے آیا کروں گا۔ اب تو میرے پاس کار موجود ہے نا۔ میں دیکھتا ہوں کہ کائنات اور سدرہ جیسی چڑیلیں کیسے میری گڑیا کا مذاق اڑاتی ہیں۔'' وہ بہ ظاہر تو دعا کو تسلی دے رہا تھا لیکن اس کے اپنے دل کی جو حالت تھی یہ وہ خود جانتا تھا یا اس کا خدا۔ اسے غم تھا تو صرف اس بات کا کہ چلے جانے کی صورت میں دعا اس سے دور ہو جاتی۔ لیکن اس کے ساتھ رخسانہ چچی نے جس طرح اس کی توہین و تذلیل کی تھی وہ بھی بھلائے جانے کے قابل نہیں تھی۔

''مجھے کار نہیں چاہیے۔'' وہ روتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔ ''آپ کار واپس کر دیں میں بائیک پر ہی چلی جاؤں گی لیکن آپ گھر چھوڑ کر نہ جائیں۔''

''میں گھر چھوڑ کر نہیں جا رہا ہوں گڑیا!.....میں

روزانہ تمھیں ملنے آؤں گا۔''

''میں خود پاپا سے بات کرتی ہوں۔'' دعا نے وہاں سے اٹھنا چاہا۔

''نہیں۔'' محمود نے اسے پکڑ کر وہیں بٹھا لیا۔ ''بڑوں کو تنگ نہیں کرتے گڑیا، چچی جان نے صحیح کہا ہے۔ مجھے چلے جانا چاہیے کب تک پرائے گھر میں پڑا رہوں گا۔'' آخری الفاظ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

''جانتی ہوں آپ یہاں سے جانا چاہتے ہیں۔ آپ بھی مجھ سے تنگ آ گئے ہیں۔'' وہ مچل کر اس کی گرفت سے نکلی اور اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔ محمود جانتا تھا کہ اس نے کھانا نہیں کھایا۔ اور جب تک وہ محمود سے یہ نہ منوا لیتی کہ وہ اس گھر سے کہیں نہیں جائے گا اس نے کھانا نہیں کھانا تھا۔ لیکن محمود کی بدقسمتی کہ یہ اس کے بس سے باہر تھا۔ دل پر بھاری بوجھ لیے وہ لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسے دعا کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ رخسانہ چچی کی آواز بھی آ رہی تھی وہ اسے زبردستی کھانا کھلانے کی کوشش میں تھی۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچا اسی لمحے اس کے کانوں میں چٹاخ کی آواز گونجی۔ یقیناً دعا کو ماں نے تھپڑ مارا تھا۔ اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا، اس سے صبر نہ ہوا اور وہ بھاگ کر وہاں پہنچا۔ دعا زور زور سے رونے لگی۔

''چچی جان!...... یوں تو نہ کریں نا۔'' اس کی آواز میں غم، غصہ، بے بسی اور نہ جانے کیا کیا شامل تھا۔ آنکھوں سے بے ساختہ آنسو بہنے لگے تھے۔ روتی ہوئی دعا کو اٹھا کر اس نے چھاتی سے لگا لیا۔

''نہیں کھاؤں گی کھانا ... نہیں کھاؤں گی نہیں نہیں نہیں۔ ....'' دعا رو رو کر چیختے ہوئے مسلسل کہے جا رہی تھی۔

''ٹھیک ہے نہ کھاؤ میری جان!'' وہ اسے چھاتی سے لگائے باہر جانے لگا۔

''بھاڑ میں جاؤ ......نہ کھاؤ۔'' رخسانہ غصے سے بڑبڑاتی اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھ گئی۔ رضوان، فیضان اور افنان بھی اپنے کمروں سے نکل کر باہر آ گئے تھے۔ رضوان بیوی سے دعا کے رونے کی وجہ دریافت کرنے لگا۔ جبکہ محمود اسے لے کر گھر سے باہر نکل گیا۔

''کچھ نہیں، ہلکا سا ڈانٹا ہے اور اس نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اس کا بھیا بھی یوں رو رہا ہے گویا میں نے اسے گولی ہی تو مار دی ہے۔'' افسوس بھرے انداز میں کہتے ہوئے وہ خواب گاہ میں گھس گئی۔

''رخسانہ بیگم!...... تمھیں محمود سے یوں گفتگو نہیں کرنا چاہیے تھی۔'' رضوان افسوس بھرے لہجے میں بولا۔

''ٹھیک ہی تو کہا ہے، بھلا کیا بات ہوئی ایک کار خریدنے کے لیے اپنی زمین کوڑیوں کے مول بیچ دی، کہ اس کی لاڈلی کی تشریف ہی بائیک کی گدی پر نہیں ٹکتی۔'' رخسانہ نے جل بھن کر جواب دیا۔ ''میں نے بھی جان بوجھ کر ایسی باتیں کی ہیں کم از کم بھیا کی لاڈلی کو بھی احساس ہوگا کہ ہمیشہ ضد کرنا اچھا نہیں ہوتا۔''

''یعنی وہ باتیں دعا کو تنگ کرنے کے لیے تھیں۔'' رضوان نے حیرانی سے پوچھا۔

''نہیں، اس کے بھیا صاحب کو بھی تو احساس دلانا تھا کہ بچوں کی ہر ضد کو پورا نہیں کیا جاتا۔ یہ تو نہیں کہ اس نے جو منھ سے نکالا محترم اسے پورا کرنے کے لیے بھاگ پڑا۔''

''نیک بخت وہ اسے بہت زیادہ پیاری ہے، کوئی سگا بہن بھائی تو ہے نہیں اپنی ساری محبتیں اس نے دعا بیٹی پر نچھاور کر دی ہیں اور اب وہ دل کے ہاتھوں مجبور

ہے۔"

رخسانہ نے منہ بنایا۔"تو کیا وہ ہمیں نہیں ہے پیاری۔ابھی اس کے رونے کی وجہ سے میرے دل کی کیا حالت ہوئی ہے، میں بتا نہیں سکتی لیکن اس کی ضد کی وجہ سے مجھے غصہ بھی تو آیا ہوا تھا۔گھر میں ایک کار موجود ہے ان پیسوں سے شادی کے لیے ضروری خریداری بھی تو کی جا سکتی تھی۔آپ کی محترم بھابیاں تو یہ سمجھتی ہیں نا کہ میں نے محمود صاحب کی ساری تنخواہ سنبھالی ہوئی ہے۔"

"اس نے تو ساری تنخواہ میرے حوالے ہی کرنا چاہی تھی میں نے خود منع کر دیا۔اب بھی گھر کا سارا خرچ، اسی کی تنخواہ سے چل رہا ہے۔میری تنخواہ تو سیدھے سیدھے اکاؤنٹ میں چلی جاتی ہے۔"

"اچھا اچھا ٹھیک ہے زیادہ طرف داری کی ضرورت نہیں، جانتی ہوں سب۔" رخسانہ نے بے زاری سے کہا۔

"تو اب اس کے رشتے کی بابت کیا سوچا ہے؟" رضوان نے موضوع تبدیل کیا۔کیونکہ وہ جانتا تھا کہ رخسانہ کو محمود کی تعریف پسند نہیں تھی۔

"اتوار کو چلیں گے۔یوں بھی اس کی بیوی نے اسی کے کمرے ہی میں رہنا ہے۔تو اس میں ہمیں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔جب تک ہم دونوں موجود ہیں وہ یہیں رہ سکتا ہے۔دعا کی شادی کے بعد اپنے گھر میں شفٹ ہو جائے گا۔بلکہ ابھی سے اس کے کانوں میں ڈال لو کہ بچت کر کے پلاٹ وغیرہ خرید لے تاکہ کل کلاں کو آسانی سے گھر بنا سکے، ساری تنخواہ اپنی لاڈلی کے ناز نخروں پر نہ لٹاتا رہے۔"

"صحیح ہے۔"اس سے اتفاق کرتے ہوئے رضوان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔رخسانہ کی بات رد کرنے کے قابل نہیں تھی۔

☆☆☆

محمود روتی مچلتی دعا کو گھر سے باہر لے آیا۔

"اچھا اب بس کرو نا، اچھے بچے روتے نہیں ہیں۔"سڑک پر چڑھتے ہی اس نے دعا کو پچکارا۔

"آپ نہیں نہیں جائیں گے ٹھیک ہے نا۔"اس نے منہ بسورا۔

"اچھا میں ایک چھوٹا سا خوب صورت سا گھر خرید لیتا ہوں اور اس میں، میں تم اور تمھاری بریرہ آپی رہیں گے، بریرہ آپی تمھیں اچھی لگتی ہے نا۔"

"وہ کیوں ہمارے ساتھ رہے گی۔" رونا بھلا کر وہ محمود کی طرف متوجہ ہوئی۔

"میں اس سے شادی کروں گا نا؟......جیسے تمھاری امی جان، تمھارے ابو جان کی بیوی ہے نا تو ایسے ہی تمھاری بریرہ آپی میری بیوی بنے گی۔"

"کوئی ضرورت نہیں، آپ کی بیوی میں خود بنوں گی۔"اس نے معصومیت بھرے لہجے میں کہا۔اور محمود قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"نہیں نا، میں تو تمھارا بھیا ہوں اور بہنوں سے شادی نہیں ہو سکتی۔"

اس نے ننھے منے ذہن پر زور دے کر کچھ سوچا اور بولی۔"ٹھیک ہے لیکن بریرہ آپی سے بھی شادی نہ کرو۔بس نئے گھر میں ہم دونوں رہیں گے اور وہاں امی جان کو بالکل نہیں آنے دیں گے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔"محمود نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کار ایک ہوٹل کی پارکنگ میں موڑ دی۔

"اب بتاؤ میری گڑیا کیا کھائے گی۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔"اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"بری بات۔"محمود نے خفگی بھرے لہجے میں کہا۔"کائنات اور سدرہ جیسی گندی بچیاں بڑوں کا کہنا

نہیں مانتیں۔میری گڑیا تو بڑوں کا کہنا مانتی ہے۔''
''امی کا کہنا بالکل نہیں مانوں گی۔'' دعا نے منہ بسورا۔
''یہ تو اور بھی بری بات ہے۔تمھیں بھی لوگ کائنات کی طرح گندی بچی سمجھیں گے۔''محمود ہمیشہ اس کی کلاس فیلو کائنات کی مثال دے کر اسے راہِ راست پر لانے کی کوشش کرتا تھا۔اور کائنات کی طرح نہ بننے کے خیال میں وہ کافی باتیں مان جایا کرتی تھی۔
''مجھے لوگوں کی پروا نہیں ہے۔'' بے پروائی سے کہتے ہوئے وہ کار سے اتر گئی۔اس کے انداز پر محمود کو ہنسی آ گئی تھی۔
دعا کی وجہ سے اس نے خود بھی تھوڑا سا کھانا زہر مار کیا۔کھانے کے بعد وہ اسے آئس کریم کھلانے لے گیا۔ وہاں سے اس نے ایک شاپنگ پلازہ کا رخ کیا جو رات گئے تک کھلا رہتا تھا۔تبدیل ہوتے موسم کو مدِنظر رکھ کر اس نے دعا کے لیے سرخ رنگ کا ایک خوب صورت کوٹ اور اسی رنگ کی گرم ٹوپی خریدی۔ حالانکہ اس کی الماری ایسے سامان سے بھری پڑی تھی پھر بھی محمود اس کے لیے کچھ نہ کچھ خریدتا رہتا تھا۔گھنٹا ڈیڑھ گھر سے باہر رہنے کے بعد وہ اسے واپس لے آیا۔
''اب میری گڑیا سوئے گی۔'' بیڈ پر لٹاتے ہوئے محمود نے اس کے ماتھے پر بوسا دیا اور شب بخیر کہتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔
رخسانہ انھی کی منتظر تھی۔جب وہ دعا کی خواب گاہ کے قریب پہنچی اس وقت محمود وہاں سے نکل رہا تھا۔
'' اتنا خوبصورت کوٹ کس کا ہے۔''ٹیبل پر رکھے نئے کوٹ کو اٹھا کر رخسانہ نے مصنوعی حیرانی سے پوچھا۔
''میرے کوٹ کو ہاتھ نہ لگائیں اور میرے کمرے میں بھی نہ آیا کریں۔''
''ارے میری ننھی پری خفا ہے۔'' ساتھ بیٹھتے ہوئے رخسانہ اسے چومنے لگی۔
''محمود بھائی نیا گھر لے رہے ہیں اور وہاں ہم آپ کو بالکل بھی نہیں آنے دیں گے، نئے گھر میں میں اور محمود بھیا اکیلے رہیں گے۔اور وہ شادی بھی نہیں کریں گے۔''
رخسانہ رونی صورت بنا کر بولی۔''یہ تو زیادتی ہے نا مما کے ساتھ۔آپ دونوں بھی تو اتنا عرصہ میرے گھر میں رہے ہو۔''
''آپ کے گھر تو نہیں رہے۔ہم تو اپنے اپنے کمرے میں رہتے تھے۔''دعا جھگڑے کے لیے تیار تھی۔
''اچھا صلح نہیں ہوسکتی۔''
''بالکل بھی نہیں۔'' دعا نے نفی میں سر ہلایا۔
''اگر میں تمھارے محمود بھیا کو یہاں سے نہ نکالوں تو کیا پھر بھی صلح نہیں کرو گی۔''
وہ ایک دم لپٹ کر اس کے گال چومنے لگی۔
''چاپلوس کہیں کی۔''رخسانہ نے ہنستے ہوئے اسے چھاتی سے لگا لیا۔
''مما!... میں بھیا کو کہوں گی وہ کار بھی واپس کر دیں گے بس آپ انھیں گھر سے نہ نکالیں۔''
وہ ممتا بھرے لہجے میں بولی۔''اچھا ٹھیک ہے اب سو جاؤ میں تمھارے بھیا کو گھر سے نہیں نکالوں گی۔اور اسے کار واپس کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔''
''ٹھہرو میں بھیا کو بتا دوں یہ نہ ہو وہ نیا گھر خرید لیں۔'' بیڈ سے چھلانگ لگا کر وہ محمود کے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔رخسانہ بھی ہنستے ہوئے اس کے پیچھے چل پڑی تھی۔

''بھیا!...... بھیا'' وہ بھاگتے ہوئے اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ سونے کے لیے لیٹ گیا تھا۔ اسے جوش بھرے انداز میں اندر داخل ہوتا دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔

پاس جاتے ہی وہ اس سے لپٹ گئی۔ ''بھیا!...... نیا گھر نہ خریدنا۔ مما نے بتا دیا ہے کہ وہ آپ کو یہاں سے نہیں نکالیں گی۔'' خوشی سے اس سے صحیح طور پر بات نہیں ہو پا رہی تھی۔

''اچھا نہیں لیتا اب جاؤ آرام کرو۔'' اسے پیار کرتے ہوئے وہ پھیکے انداز میں مسکرا دیا۔ وہ معصوم نہیں جانتی تھی کہ اس گھر میں رکنا محمود کے لیے کتنا مشکل تھا۔ اس کی انا اور خودداری پر جو تازیانے رخسانہ چچی نے چلائے تھے اس کے بعد بے روزگار بھی ہوتا تو وہاں نہ ٹکتا۔ اب تو وہ ٹھیک ٹھاک نوکری کر رہا تھا۔

وہ جس طرح بھاگتے ہوئے وہاں آئی تھی اسی تیز رفتاری سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ اس کا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔

رخسانہ چچی کو کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

''بیٹھو۔'' اسے کہہ کر وہ بھی صوفے پر ٹک گئی۔

محمود خاموشی سے بیٹھ گیا۔ ''یقیناً تمھیں میری گفتگو بہت بری لگی ہو گی۔ اور لگنا بھی چاہیے کہ میں نے الفاظ ہی اتنے تلخ استعمال کیے تھے۔ لیکن یاد رکھو کہ میں جتنی بھی معذرت کر لوں اور تمھیں ان الفاظ نے کتنی ہی اذیت کیوں نہ پہنچائی ہو۔ اس سے انکار نہ تم کر سکتے ہو اور نہ کوئی دوسرا تیسرا کہ یہ ایک تلخ حقیقت ہے۔ گھر کا سارا انتظام تقریباً تمھاری تنخواہ سے چل رہا ہے۔ اس کے علاوہ بھی تم نے اس گھر کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ لیکن کیا اس وجہ سے فیضان اور افنان تمھیں گھر میں حصہ دینے پر تیار ہو جائیں گے؟ یقیناً تمھارا جواب نفی میں ہوگا۔ اور میں بھی تمھاری توجہ اسی طرف مبذول کرانا چاہتی تھی۔ گو میرے طریقے سے تمھیں اختلاف سہی پر میری نیت غلط نہیں ہے۔ سوچو اپنی زمین اور گھر کا حصہ چاچوں کے حوالے کرنا بے وقوفی نہیں تو اور کیا ہے۔ تم یتیم ہو انھیں چاہیے تمھاری مدد کریں نہ کہ تمھاری زمین اونے پونے داموں ہتھیانے کی کوشش کریں۔'' وہ ایک لمحہ سانس لینے کو رکی اور پھر اس کی بات جاری رہی۔

''تم نے دعا کے لیے کار خریدنے کے لیے اپنی ساری زمین کوڑیوں کے مول فروخت کر دی۔ وہ تو بچی ہے تم تو بچے نہیں ہو۔ اسے ورغلا سکتے تھے۔ تمھاری کسی بھی بات سے وہ انکار نہ کرتی۔ اب بھی تمھارے جانے کا سن کر وہ کار واپس کرنے پر رضامند ہو گئی ہے کہ نہیں۔ کیا اس کی ہر خواہش پوری کرنا تمھارا فرض ہے۔ جانتی ہوں تمھیں بہت پیاری ہے۔ تو کیا ہمیں نہیں ہے پیاری۔ وہ میری بیٹی ہے، میں اس کی بہتری کے لیے سختی روا رکھتی ہوں ورنہ میرا بھی دل کرتا ہے اس کی کسی بات کو رد نہ کروں۔ کل کو اس نے پرائے گھر جانا ہے۔ وہاں وہ اپنا محمود بھیا کہاں سے لائے گی؟ یقیناً چند دن بھی سسرال میں نہیں گزار پائے گی اور اس کا رشتہ ٹوٹنے کا دکھ ہم سے کئی گنا زیادہ تمھیں ہو گا۔ بیٹا!...... یاد رکھنا مبالغہ کسی بھی چیز میں اچھا نہیں ہوتا۔ نہ محبت و شفقت میں اور نہ نفرت و دشمنی میں۔'' رخسانہ نے زندگی میں شاید پہلی بار اسے بیٹا کہہ کر پکارا تھا۔ محمود نے عجیب سی نظروں سے اس کی جانب دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہیں کہا تھا۔ ''اور اب آرام کرو میں اس اتوار کو جاؤں گی تمھاری خالہ کے پاس۔ فکر مت کرو تمھاری بریرہ کے لیے بھی اس گھر میں گنجائش موجود ہے۔ مجھے بس وقتی طور پر غصہ آ گیا تھا کہ تمھیں اس طرح جھاڑ دیا۔ باقی یہ تو تمھاری گڑیا نے بتا ہی دیا ہوگا

کہ نیا گھر خریدنے کی ضرورت نہیں ہے۔اسی وجہ سے اس بے چاری کو بھاگ کر تمھیں یہ بتانے آنا پڑا۔اور تمھاری ہی وجہ سے اس نے مجھے اتنی جلدی معاف بھی کردیا۔'' آخری فقرے رخسانہ نے ہنستے ہوئے کہے تھے۔

محمود کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ کھلنے لگی تھی۔رخسانہ کی باتوں سے ذرا سا بھی اختلاف نہ رکھنے کے باوجود وہ وہاں نہ ٹھہرتا مگر کیا کرتا کہ دعا کے بغیر رہنا بھی تو اسے کارِدارد لگ رہا تھا۔

چچی کے جانے کے بعد اس نے نائیٹ بلب آن کیا اور آنکھیں بند کرلیں۔صبح پہلے دن دعا نے کار میں اسکول جانا تھا۔اسے یقین تھا کہ وہ اپنی کلاس فیلوز کے سامنے خوب باتیں بنائے گی۔اس کے ہونٹوں پر ہنسی مچلنے لگی۔دعا کو ہر جگہ سر بلند کرنا ہی تو اسے مقصدِ زندگی نظر آتا تھا۔اچانک اس کے دماغ میں چچی کی رشتا مانگنے والی بات آئی اور بریرہ کی دلکش صورت اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی۔تپائی پر پڑا موبائل فون اٹھا کر اس نے تصویروں کا فولڈر نکالا اس میں ایک جگہ بریرہ نے دعا کو گود میں اٹھا کر تصویر کھنچوائی تھی۔دعا کی وجہ سے اب تک وہ تصویر اس کے موبائل میں موجود تھی۔تصویر کھول کر وہ بریرہ کا ہنستا مسکراتا چہرہ دیکھنے لگا۔بلاشبہ وہ اس قابل تھی کہ اسے شریکِ حیات بنایا جاتا۔یوں بھی وہ اس کی چچا زاد کے ساتھ خالہ زاد بھی تھی۔اور شکیلہ خالہ نے بغیر کسی تردد کے اس رشتے کے لیے ہاں کردینا تھی۔

وہ انھی خیالات میں کھویا تھا کہ دروازہ ہلکے سے بجا۔اور اس کے کانوں میں فیضان کی مدھم سی آواز پڑی۔

''محمود بھائی!......میں اندر آسکتا ہوں؟''

''آجاؤ دروازہ کھلا ہے۔'' حیرانی بھرے انداز میں کہتے ہوئے اس نے موبائل فون تکیے کے نیچے رکھا اور بیڈ سائیڈ کے کونے پر لگا ٹیوب لائیٹ کا بٹن آن کردیا۔

''معذرت خواہ ہوں بھیا،آپ کو اس وقت زحمت دی۔'' فیضان کے چہرے پر چھائے عجیب سے تاثرات اسے مزید حیران کر گئے تھے۔

''زحمت کیسی،بیٹھو۔''محمود نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

بیٹھنے کے بجائے اس نے صوفے کے ساتھ رکھی فوم والی کرسی اٹھائی اور بیڈ کے قریب رکھ کر بیٹھ گیا۔

''خیر تو ہے۔''اس کے بیٹھتے ہی محمود نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''بھیا!......'' کہہ کر فیضان اضطراری انداز میں ہاتھ مروڑنے لگا۔

''فیضان!......تم کافی پریشان لگ رہے۔کیا بات ہے،بتاؤ تو سہی۔''محمود نے آگے ہو کر اس کے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

''بھیا!......آپ خفا ہو جائیں گے۔''فیضان کے لہجے میں گہرے دکھ کی آمیزش تھی۔

''یار!...... کچھ پتا تو چلے۔''محمود نے اسے کھینچ کر اپنے ساتھ بیڈ پر بٹھالیا۔

''بھیا!......''فیضان نے سسکنے کے انداز میں کہا اور اس کی آنکھیں نمی سے بھر گئیں۔

''پاگل تو نہیں ہو فیضان!......میں تمھارا بڑا بھائی ہوں۔اگر سگا نہیں بھی ہوں تو یقین مانو میں نے تمھیں کبھی بھی سگے بھائی سے کم نہیں سمجھا۔''

''اسی سوچ نے تو ہمت دی ہے بھیا!''

''اب مجھ سے تھپڑ کھاؤ گے۔''محمود نے اسے پیار سے ڈانٹا۔

اس مرتبہ فیضان نے جھجکتے ہوئے اپنا موبائل

فون نکالا اور ایک میسج سامنے لا کر موبائل فون اس کی جانب بڑھا دیا۔

محمود نے حیرانی بھرے انداز میں اس کے ہاتھ سے موبائل فون لے کر سکرین پر نظریں دوڑائیں۔کسی چاند کی طرف سے میسج تھا۔وہ میسج پڑھنے لگا۔

''فیضی !......پلیز تم چچا جان سے بات کرو نا یا محمود بھائی کو بتا دو۔یقین مانو میں نے انھیں ہمیشہ بھائی کی نظر سے دیکھا ہے یہ نیا رشتا کیسے نبھا پاؤں گی۔اور تمھاری بھابی بننا تو مجھے زندگی سے بیزار کر دے گا۔میں تمھارے بغیر مر جاؤں گی فیضی۔خدا کے لیے کچھ کرو۔''

''یہ بریرہ کا میسج ہے ؟''موبائل واپس اس کی جانب بڑھاتے ہوئے محمود نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔

''جی بھیا !...''فیضان نے سر جھکاتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

''اور یہ چکر کب سے چل رہا ہے ؟''

''جب وہ آٹھویں میں پڑھتی تھی۔''فیضان کی آواز میں کئی قسم کے اندیشے لرزاں تھے۔

''ہا......ہا......ہا''محمود کے ہونٹوں سے قہقہہ برآمد ہوا۔''مطلب چار پانچ سال ہو گئے ہیں میرے چھوٹے بھائی کو جوان ہوئے۔اور میں اسے اب تک نابالغ سمجھ رہا ہوں۔''اس نے شفقت بھرے انداز میں فیضان کا کان پکڑا۔

''بھیا!''وہ اس سے لپٹ کر رو پڑا تھا۔

''پاگل !......یہ اتنی بڑی بات تو نہیں ہے کہ تم رات کے اس وقت پریشانی بھرے انداز میں دوڑے چلے آئے۔بے وقوف مجھے تو پریشان ہی کر دیا تھا۔''

''شکریہ محمود بھیا !... یقین مانو میری زندگی کا سوال تھا۔''

''وہ بھی جاگ رہی ہو گی۔''

''جی بھیا !......جب سے اسے پتا چلا مسلسل روئے جا رہی ہے۔''

''جاؤ اسے چپ کراؤ۔اگر وہ مجھے بھائی سمجھتی ہے تو میں بھی اسے اپنی بہن ہی سمجھتا ہوں۔اور اس کے بارے چچا جان نے کہا تھا ورنہ میرے تو گمان میں بھی شادی وغیرہ نہیں تھی۔''

''شکریہ بھیا !''فیضان خوشی سے اچھلتا ہوا اس کی خواب گاہ سے نکل گیا۔وہ سول انجینئرنگ کر رہا تھا۔چند ماہ تک اس نے تعلیم سے فارغ ہو جانا تھا۔

فیضان کے جاتے ہی اس نے ٹیوب لائیٹ آف کی اور سونے کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔تھوڑی دیر پہلے اس کے خیالوں کو رونق بخشنے والی بریرہ ایک دم اس کی سوچوں سے کوسوں دور چلی گئی تھی۔وہ شروع دن سے اس کے ساتھ کافی بے تکلف تھی لیکن فیضان کے ساتھ اس کے چلنے والے چکر سے وہ بالکل ناواقف تھا۔

☆☆☆

فیضان اور بریرہ کا رشتا رخسانہ چچی کو بالکل قبول نہیں تھا۔وہ فیضان کے لیے کسی بڑے گھر کی لڑکی کو بہو بنانے کا سوچے بیٹھی تھی۔محمود کی بات سنتے ہی وہ ہتھے سے اکھڑ گئی تھی۔

''یہ نہیں ہو سکتا۔اور پھر بڑا ہونے کے ناتے پہلے تمھارا شادی کرنا بنتا ہے،سارے خاندان والے کیا سوچیں گے کہ بڑے کو چھوڑ کر چھوٹے کے بیاہ کی فکر اس لیے پڑ گئی کہ بڑا میرا اپنا بیٹا نہیں ہے۔''

محمود نے جلدی سے کہا۔''ایسی کوئی بات نہیں ہے چچی جان !......فیضان اور بریرہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور ان کی پسند کو یوں نظر انداز کر دینا عقل مندانہ فیصلہ نہیں ہو گا۔''

''محمود ٹھیک کہہ رہا ہے۔''رضوان نے فوراً محمود

کی تائید کی تھی۔

''ہاں تمھیں تو اپنے غریب بھائیوں کا غم کھائے جا رہا ہے۔'' رخسانہ جلے کٹے لہجے میں بولی۔

''نیک بخت!... میرے کون سے کارخانے چل رہے ہیں۔''

''فیضان کے لیے میری نظر میں ایک رشتا موجود ہے۔'' رخسانہ حتمی لہجے میں بولی۔''یوں بھی شکیلہ بیگم مشکل ہی سے فیضان کے لیے ہاں کرے گی۔وہ تو اپنے بھانجے کے لیے ادھار کھائے بیٹھی ہے۔اور مجھ سے اس کے ترلے نہیں ہونے والے۔''

محمود جھٹ بولا۔''خالہ کو منانا میری ذمہ داری ہے۔''

''تم کیوں اس شادی پر اتنا زور دے رہے ہو؟'' رخسانہ نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

محمود نے کہا۔''فیضان میرا چھوٹا بھائی ہے اور اس کی طرف داری کرنا میرا فرض بنتا ہے۔''

رخسانہ چچی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔''یہ فرض اور واجبات میرے لیے چھوڑ دو،میں جانوں اور فیضان۔''

''ٹھیک ہے چچی جان،جو آپ کی مرضی آئے کریں لیکن میرے لیے بریرہ کے رشتے کی بات نہ چلانا۔میں اس سے شادی نہیں کر سکتا۔''

''تو تمھارے رشتے کی بات کہاں چلاؤں؟'' رخسانہ نے گہری نظروں سے اس کی جانب دیکھا تھا۔

''فی الحال میرا شادی کا کوئی ارادہ نہیں۔جب تک اپنے لیے ذاتی گھر نہیں بنا لیتا میں شادی نہیں کروں گا۔'' وہ چچی کی خواب گاہ سے نکل آیا۔

چچی کے ساتھ بات چیت اس نے سہ پہر کو دفتر سے لوٹنے کے بعد کی تھی۔ فیضان اور افنان گھر سے باہر تھے۔شام کو گھر داخل ہوتے ہی فیضان اس کے پاس دوڑا چلا آیا تھا۔

''محمود بھائی!......بات ہوئی امی جان سے؟''

''وہ نہیں مان رہیں یار،البتہ میں نے اپنے لیے بریرہ کا رشتا مانگنے سے منع کر دیا ہے۔''

''انھیں مسئلہ کیا ہے؟''فیضان نے غصے بھرے لہجے میں پوچھا۔

''یہ معلوم کرنا آپ کا کام ہے۔''محمود نے بے پروائی سے کندھے اچکائے۔''جتنا ہو سکتا تھا میں نے منتیں کی ہیں مگر میری بات کو انھوں نے درخورِ اعتناء نہیں جانا۔ چچا جان کا ووٹ بھی تمھاری طرف ہے۔چچی جان ان کی بات بھی سننے کو تیار نہیں ہیں۔''

''شکریہ محمود بھائی!......اب آپ فکر نہ کریں باقی میں سنبھال لوں گا۔''

رات کو فیضان کھانے کی میز پر حاضر نہیں تھا۔کھانے کے بعد رخسانہ بیٹے کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ جونھی ماں بیٹے کی تکرار شروع ہوئی محمود دعا کو ساتھ لے کر کار میں آ بیٹھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ رخسانہ اور فیضان کے جھگڑے کو دیکھ کر دعا پریشان ہو جائے۔ وہ ایک حساس بچی تھی اس کی پریشانی محمود کو کسی بھی طرح گوارا نہیں تھی۔ وہ اسے گھر سے سیدھا آئس کریم شاپ پر لے گیا وہاں سے لمبی ڈرائیو پر نکل گیا۔دعا اپنی کلاس فیلوز کی حیرانی کے بارے بتا [illegible] ہی کہ اس کے بھیا کی نئی کار دیکھ کر کائنات اور سد [illegible] وغیرہ کتنی شرمندہ ہوئی تھیں۔محمود اس کی معصومانہ با [illegible] سن کر خوش ہوتا رہا۔گھنٹا ڈیڑھ بعد وہ گھر میں داخل ہوئے تو خاموشی چھائی ہوئی۔

رات گئے فیضان نے کمرے میں آ کر خوش خبری سنائی کہ رخسانہ چچی طوعن و کرہن مان گئی تھی لیکن اس نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اگر شکیلہ نے ذرا سی بھی آئیں بائیں کی تو وہ اس رشتے پر تھوک کر واپس آ

جائے گی۔

''بھیا !......اب سب کچھ آپ کے ہاتھ میں ہے۔شکیلہ چچی آپ کی بات نہیں ٹالتیں۔'' فیضان نے لجاجت سے کہا۔

محمود نے اسے تسلی دی۔''فکر نہ کرو، میں کل دفتر سے واپس آتے ہی خالہ کی طرف چکر لگا آؤں گا۔''

''آئی لو یو بھیا !''فیضان اس کے گال پر بوسا دیا۔

''اب تو محبت آئے گی بھائی پر۔''محمود نے اس کا کان کھینچا۔ فیضان قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

☆☆☆

''ارے آج میرا بیٹا کہاں آ نکلا۔''شکیلہ خالہ اسے دیکھتے ہی خوش ہوگئی تھیں۔''

''آپ کی یاد آئی اور میں آ گیا۔''وہ خالہ کے ساتھ ہی بیٹھ گیا تھا۔

''اللہ کرے میری یاد تمھیں روزانہ آیا کرے۔''شکیلہ خالہ نے ہنستے ہوئے کہا۔نرگس چچی بھی اس کی بات پر ہنس دی تھیں۔

''میری بہو آئی ہے۔'' نرگس چچی نے حسبِ عادت محمود کے ساتھ بیٹھی دعا کو چھیڑا۔

''میں بھیا کی بہو بنوں گی۔''دعا نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔وہاں موجود تمام لوگ بے اختیار ہنس پڑے تھے۔

''پہلے بھیا کی شادی تو کرا دو۔''شکیلہ خالہ نے دعا کو اٹھا کر اس کا منہ چوم لیا تھا۔

''بھیا شادی نہیں کریں گے۔''دعا نے معصومیت بھرے لہجے میں انکشاف کیا۔''بھیا نے میرے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ وہ بریرہ آپی سے شادی نہیں کریں گے۔''

شکیلہ نے اسے چھاتی کے ساتھ بھینچتے ہوئے کہا۔''تو پھر تم اپنے بھیا کی بہو کیسے بنو گی گڑیا۔''باقی تمام بھی اس انکشاف پر ہنسنے لگے تھے۔بریرہ کے چہرے پر حیا کی سرخی پھیل گئی تھی۔وہ وہاں سے ہٹ گئی۔یوں بھی اسے فیضان پہلے سے محمود کی آمد کا مقصد بتا چکا تھا۔

تھوڑی دیر گپ شپ کے بعد محمود نے شکیلہ کو کہا۔''خالہ جان، ایک ضروری بات کرنی ہے۔''

''کہونا بیٹا !''وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''یہ بچہ پارٹی یہاں سے غائب ہو جائے۔''زیادہ تر لڑکے،لڑکیاں تو یوں بھی وہاں سے دائیں بائیں ہو گئے تھے۔جو دو تین وہاں بیٹھے تھے وہ بھی محمود کی بات سن کر اٹھ گئے۔

''خالہ جان !......میں بریرہ اور فیضان کے رشتے کی بات کرنے آیا ہوں۔''محمود بغیر تمہید باندھے مطلب کی بات پر آ گیا۔

''کک......کیا بات کر رہے ہو بیٹا !''شکیلہ نے ہکلا کر اپنے شوہر کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر بے نیازی چھائی تھی۔

''جانتا ہوں خالہ جان، آپ کی خواہش کیا ہے، یقین جانیے بریرہ کو میں نے ہمیشہ چھوٹی بہن ہی سمجھا ہے۔ سب سے بڑھ کر فیضان اسے بہت پسند کرتا ہے۔ رضوان چچا کی بھی یہی خواہش تھی کہ میری اور بریرہ کی شادی ہو جائے، یہ بات جونھی فیضان کو پتا چلی اس نے بھوک ہڑتال کر دی ہے۔ہمارا آپس کا تعلق ہمیشہ سگے بھائیوں جیسا رہا ہے۔اب میں چھوٹے بھائی کا دل نہیں توڑ سکتا۔''

''اور خالہ کا دل توڑ دو گے۔''شکیلہ نے مایوسی بھرے لہجے میں کہا۔

''کیا کسی کی خوشیوں کا قاتل بن کر مجھے سکون مل جائے گا خالہ جان۔''

"کسی ایک کے چاہنے سے تو فیصلے نہیں ہوتے نا بیٹا!" خالہ خود کو قائل نہیں کر پا رہی تھی۔

"خالہ جان، آپ جانتی ہیں کہ بریرہ مجھ سے کتنی بے تکلف ہے، کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اس کی مرضی جانے بغیر میں آپ سے بات کروں۔"

"محمود ٹھیک کہہ رہا ہے۔ بریرہ اور فیضان ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے ہیں۔" نرگس چچی نے سر ہلاتے ہوئے محمود کی تائید کی۔

"کیا گھر میں بڑے تم ہی تھے جو رشتہ مانگنے بھاگے چلے آئے۔" شمیلہ خالہ نے نرگس کی بات پر ہتھیار پھینک دیے تھے۔

"میں رشتہ مانگنے نہیں، اپنی پیاری خالہ کو راضی کرنے آیا تھا۔" خالہ کی بات سن کر محمود نے سکون بھرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"اسی لیے تمھاری لاڈو رانی نے پہلے سے انکشاف کر دیا تھا کہ اس کا بھیا جان، بریرہ سے شادی نہیں کرے گا۔" شمیلہ خالہ کے چہرے پر پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"اس معصوم کو شادیوں کا کیا پتا خالہ جان!" محمود نے ساتھ بیٹھی دعا کو اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

"شام کی آذان کب کی ہو چکی ہے نماز قضا ہو جائے گی۔" سلمان چچا نے انھیں یاد دہانی کرائی اور وہ اٹھ گئے۔

رات کا کھانا کھا کر محمود نے واپسی کی راہ لی تھی۔ گاؤں سے نکلتے ہی اسے بریرہ کا میسج ملا۔

"بہت بہت شکریہ، مجھے اپنے پیارے بھائی پر ہمیشہ فخر رہے گا۔"

دونوں ہتھیلیاں اسٹیئرنگ وہیل پر ٹیک کر جواب لکھنے لگا۔ "ہاں بہنا، ایک اور بندہ بھی میرا بہت زیادہ شکر گزار ہوگا۔"

"جی بھائی جان!" بریرہ کا مختصر جواب آیا۔ اور وہ مسکرا کر ڈرائیونگ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ دعا سیٹ سے ٹیک لگائے اونگھ رہی تھی۔ محمود نے کار روک کر اسے عقبی نشست پر لٹایا اور اپنی چادر اوڑھا کر آگے بڑھ گیا۔

فیضان بڑی شدت سے اس کا منتظر تھا۔ یوں تو اسے بریرہ کی زبانی پتا چل گیا تھا اس کے باوجود وہ سب کچھ محمود سے سننا چاہتا تھا۔ رخسانہ چچی اور رضوان کو بھی محمود کے گاؤں جانے کی غایت معلوم تھی۔ کار کا ہارن سن کر گھر کا دروازہ فیضان ہی نے کھولا تھا۔ اس کی خوشی دیدنی تھی۔ چھوٹے بھائی کو خوش دیکھ کر محمود کو سکون کا احساس ہوا تھا۔ یقیناً اپنی ذات پر دوسرے کو ترجیح دے کر جو سکون ملتا ہے اس کا مقابلہ کوئی اور نیکی نہیں کر سکتی۔

☆☆☆☆

تعلیم سے فارغ ہوتے ہی فیضان کو دو تین ماہ کے اندر غیر ملکی کنسٹرکشن کمپنی میں بہت اچھی جاب مل گئی تھی۔ جاب کے حصول کے ساتھ ہی اس نے ماں باپ پر شادی کے لیے زور دیا اور بریرہ اس کی دلھن بن کر گھر میں آ گئی۔ لیکن وہ زیادہ دن گھر میں نہیں رہی کہ فیضان اسے بھی اپنے ساتھ دبئی لے گیا تھا۔ رخسانہ چچی کو اس کا یوں ملک سے باہر منتقل ہونا بہت کھلا مگر وہ فیضان کو منع بھی تو نہیں کر سکتی تھیں۔ فیضان کی شادی کے بعد رضوان چچا نے محمود کو بھی شادی کے لیے زور دیا مگر وہ خوب صورتی سے ٹال گیا۔ اسی دوران اس کی پھوپھو کی بیٹی عمارہ، کالج کی تعلیم سے فارغ ہو کر یونیورسٹی میں داخل ہوئی۔ چونکہ روزانہ آنا جانا ممکن نہیں تھا اس لیے شہر میں اس کی رہائش کے لیے ہوسٹل میں داخل کرانے کا فیصلہ ہوا۔ رضوان چچا کو معلوم ہوا تو اس نے ہوسٹل میں داخلے کی سختی سے ممانعت کرتے ہوئے کہا۔

''جب اپنا گھر موجود ہے تو ہوسٹل میں رہنے کی کیا ضرورت ہے۔''

یوں عمارہ ان کے گھر منتقل ہو گئی۔ فیضان کا کمرہ خالی تھا وہ اسی میں رہنے لگی۔ اسے یونیورسٹی چھوڑنے کی ذمہ داری بھی محمود کے سر آن پڑی تھی۔ یونیورسٹی ان کے گھر سے اتنی دور نہیں تھی اس لیے وہ آسانی سے عمارہ کو یونیورسٹی میں اتار کر وہاں سے دعا کے اسکول جاسکتا تھا۔ دعا اب چھٹی کلاس میں تھی۔ پہلے ہی دن عمارہ تیار ہو کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ دعا تب تک تیار ہو کر کمرے سے نہیں نکلی تھی۔ محمود اسی کے انتظار میں کھڑا تھا۔ کار کے نزدیک پہنچتے ہی دعا نے عمارہ کو فرنٹ سیٹ پر بیٹھے دیکھ کر تیوری چڑھالی تھی۔

''عمارہ آپی!.....آپ پیچھے بیٹھ جائیں۔'' الفاظ کے ساتھ اس کا لہجہ بالکل میل نہیں کھا رہا تھا۔

عمارہ کو سخت توہین کا احساس ہوا تھا۔ اس نے مدد طلب نظروں سے محمود کی طرف دیکھا۔

''گڑیا، بری بات بڑوں سے یوں بات نہیں کرتے۔''

اس نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔ ''ایسا کیا کہہ دیا بھیا، آپی کو پیچھے بیٹھنے ہی کا کہا ہے۔''

''جانے دو عمارہ!.....آپ ہی پیچھے بیٹھ جاؤ، یہ ضدی اپنی منوا کر ہی رہے گی۔'' محمود کے لہجے میں بے بسی تھی۔ عمارہ قہر آلود نگاہیں دعا پر ڈال کر باہر نکلی اس کا دل تو نہیں کر رہا تھا کار میں بیٹھنے لیکن ایک چھوٹی بچی کے ساتھ مقابلہ کرنا بھی اسے نہیں جچتا تھا۔ وہ عقبی نشست پر بیٹھ گئی۔ دعا اطمینان سے آگے بیٹھ کر ملی نغمہ گنگنانے لگی۔

''پھوپھو جان کو کیسے منا لیا۔ ہمارے خاندان کے لڑکے بھی پڑھنے سے زیادہ کھیتی باڑی میں دلچسپی لیتے ہیں اور آپ کو لڑکی ہونے کے باوجود یونیورسٹی میں

داخلے کی اجازت مل گئی۔'' کار آگے بڑھاتے ہی وہ بیک مرر میں عمارہ کے تاثرات بھانپنے کا جائزہ لیتا ہوا پوچھنے لگا۔ دعا کی بدتمیزی کا ذکر اس نے جان بوجھ کر نہیں کیا تھا کیونکہ ایک تو اس سے دعا نے ناراض ہو جانا تھا اور دوسرا یہ کوئی پہلی بار نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اس بات کو خاطر میں لاتا۔ یہ تو دعا کی پختہ عادت تھی۔ فرنٹ سیٹ پر محمود کے ساتھ بیٹھنے کا حق صرف اسے حاصل تھا۔ کار کوئی دوسرا ڈرائیو کر رہا ہوتا اور محمود بھی اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ہوتا تو وہ اس کی گود میں بیٹھ جاتی۔ البتہ اس کے عقبی نشست پر بیٹھے ہونے کی صورت میں وہ فرنٹ سیٹ کی جان چھوڑ دیتی تھی۔ گویا اس کا مسئلہ فرنٹ سیٹ نہیں محمود کا ساتھ تھا۔

''اجازت ملی نہیں میں نے زبردستی لی ہے۔'' اس کا چہرہ دیکھنے کے لیے عمارہ نے بھی بیک مرر ہی کا سہارا لیا تھا۔

''پھوپھو جان اور طفیل تو آپ کی قابلیت کی بڑی تعریف کر رہے تھے۔''

وہ ہنسی۔ ''اس میں شک ہی کیا ہے۔''

''یہ تو پہلے سمیسٹر کے اختتام پر ہی پتا چل جائے گا۔''

''بالکل۔'' اعتماد سے کہہ کر وہ پوچھنے لگی۔ ''آپ کے مضامین بھی یہی تھے نا؟''

''مجھے آپ کے مضامین کا کیا......''

''بھیا!......آپ اس دن بتا رہے تھے کہ گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ کے مطابق دنیا کے سب سے اونچے گدھے کا قد پانچ فٹ آٹھ انچ ہے۔'' دعا نے اسے بات پوری نہیں کرنے دی تھی۔

''ہاں، مگر یہ کون سا موقع ہے گڑیا اور پھر کتنی بار منع کیا ہے کہ درمیان میں نہیں بولتے۔''

''آئندہ خیال رکھوں گی۔ لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا کہ دنیا کی سب سے اونچی گدھی کا قد کتنا ہے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پوچھا، اس کے لہجے سے بالکل بھی یہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اس نصیحت پر عمل کرنے کا کوئی ارادہ رکھتی ہے۔

محمود کے لبوں پر مسکراہٹ کھل گئی تھی۔ ''الٹی باتیں نہ کیا کرو سمجھیں یہ نہ ہو کوئی گدھے کی بچی کے قد کے بارے پوچھنا شروع کر دے۔'' محمود کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اس نے یہ سوال کیوں پوچھا ہے۔ چند دن پہلے ہی محمود نے اسے کہا تھا کہ جو شخص اپنی تعریف کرتا ہے اس سے بڑا گدھا کوئی نہیں ہوتا۔ اور دوسرا وہ اپنی موجودگی میں یہ بالکل برداشت نہیں کرتی تھی کہ محمود کسی اور کے ساتھ گپ شپ کرے۔

''بھیا!......آپ بھی نا۔'' اس نے لاڈ بھرے انداز میں محمود کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

عمارہ کو بھی محسوس ہو گیا تھا کہ گدھی کی بابت پوچھتے ہوئے دعا کا اشارہ اس کی طرف تھا۔ لیکن اس نے کچھ کہنے سے گریز کیا کہ وہ بدمزگی نہیں چاہتی تھی۔ اور پھر یونیورسٹی آنے تک دعا نے محمود کی جان ہی نہیں چھوڑی تھی کہ وہ محمود سے کوئی بات کر سکتی۔

''واپسی پر آپ کا انتظار کروں یا بس کو ہاتھ کھڑا کرنا پڑے گا۔'' یونیورسٹی گیٹ کے سامنے اتر کر عمارہ مستفسر ہوئی۔

''دو بجے دعا کو لینے آتا ہوں اڑھائی تین بجے تک پہنچ سکتا ہوں تمہارے پاس۔''

''تو ڈیڑھ بجے آجانا، مجھے اٹھا کر دعا کے سکول چلے جائیں گے۔'' اس نے امید بھرے لہجے میں کہا۔

''کوشش کروں گا۔'' کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

''بھیا، اگر آپ نے آئندہ مجھے عمارہ آپی کے سامنے ڈانٹا نا تو پکی کٹی کر لوں گی۔''

''مگر میں نے تمھیں کب ڈانٹا ہے۔'' اس نے

حیرانی بھرے لہجے میں پوچھا۔

''دو دفعہ ڈانٹا ہے سمجھے آپ۔'' وہ غصے میں تھی۔ ''گھر سے نکلتے وقت کہا کہ، بڑوں سے یوں بات نہیں کرتے اور رستے میں کہا، بات کے درمیان میں نہیں بولتے۔''

''تو کیا غلط کہا ہے۔''

اس نے منہ بنایا۔ ''نہیں، آپ کی ہر بات ٹھیک ہوتی ہے لیکن کسی کے سامنے ڈانٹ کھانا مجھے بالکل پسند نہیں۔''

محمود حیرانی بھرے انداز میں اسے گھور کر رہ گیا تھا۔ وہ بہ مشکل گیارہ بارہ سال کی تھی اور اتنی بڑی بڑی باتیں کرنا سیکھ گئی تھی۔

''ٹھیک ہے، لیکن تم بھی خیال کیا کرو۔ آج عمارہ کے ساتھ تم کتنی بدتمیزی سے پیش آئیں۔ جانے کیا سوچ رہی ہوگی۔''

سکول کے سامنے اترتے ہوئے اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''بھیا!..... اگر کسی کو مجھ سے مسئلہ ہے نا، تو یہ اس کا مسئلہ ہے۔''

محمود بھی بے ساختہ مسکرا پڑا تھا۔ یہ بات اسے خود محمود نے کہی تھی۔ جب ایک دن وہ اپنی کسی کلاس فیلو کا بتا رہی تھی کہ وہ دعا سے حسد کرتی ہے۔ تبھی محمود نے اسے یہی نصیحت کی تھی۔ اور آج حرف بہ حرف وہی بات دہرا کر اس نے محمود کو ایک بار پھر یہ باور کرا دیا تھا کہ وہ باتوں کو بھولتی نہیں تھی۔

''اور ہاں بھیا!..... کوشش کرنا کہ دفتر سے سیدھا میرے سکول آجانا، اگر آپی کو پہلے اٹھانا ضروری سمجھیں تو اسے، بیٹھنے کی جگہ کے بارے واضح طور پر بتا دینا۔ یہ نہ ہو گھر واپسی پر مجھے آپ کی کڑوی کسیلی باتیں سننا پڑیں۔''

محمود نے مصنوعی غصے سے پوچھا۔ ''کیا مطلب؟''

''مطلب واضح ہے بھیا!..... اگر وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تو مجھے وہی کچھ کہنا پڑے گا جو صبح کہا تھا۔ اور چونکہ آپ کو منع کر چکی ہوں کہ مجھے کسی کے سامنے نہ ڈانٹا کریں تو یقیناً آپ نے مجھے کمرے میں جا کر ڈانٹنا ہے۔ اس لیے.....'' اس نے شرارتی انداز میں کندھے اچکائے۔ اور اسکول کے گیٹ کی طرف چل دی۔ محمود کے چہرے پر کھسیانی ہنسی نمودار ہوئی اور وہ آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

واپسی پر عمارہ کو یونیورسٹی سے اٹھاتے ہوئے وہ دعا کی بابت بتا رہا تھا۔

''دیکھو عمارہ!..... دعا گھر بھر کی لاڈلی ہے۔ خاص کر میرے لیے تو اس سے بڑھ کر کوئی بھی نہیں ہے۔ اور میرے قریب وہ مشکل ہی سے کسی کو برداشت کرتی ہے۔ وہ میرے لیے چھوٹی بہن سے بھی بڑھ کر ہے۔ اس کی طرف سے میں معذرت خواہ ہوں صبح اس نے کافی بدتمیزی کی تھی۔ اب بھی یہی درخواست کروں گا کہ جب اسکول پہنچیں تو آپ نے عقبی نشست پر منتقل ہو جانا ہے۔''

''آپ میری توہین کر رہے ہیں۔'' عمارہ کو محمود کی باتیں کافی بری لگی تھیں۔

''بالکل بھی نہیں۔'' محمود نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ معصوم بچی ہے جبکہ آپ سمجھ دار خاتون ہیں۔''

عمارہ نے منہ بنایا۔ ''اب خاتون جیسے ثقیل لفظ سے تو مخاطب نہ کریں، لڑکی ہی کہہ دیں۔''

محمود ہنسا۔ ''مطلب ایک ہی بنتا ہے۔''

عمارہ معنی خیز لہجے میں بولی۔ ''ویسے ایک جوان لڑکی اور لڑکا، لڑکے کی بہن کو موضوع گفتگو بنانے کے علاوہ بھی کئی باتیں کر سکتے ہیں۔''

''مثلاً''

عمارہ نے معنی خیز لہجے میں کہا۔''مثلاً یہ کہ ایک دوسرے کی پسند کے بارے پوچھ سکتے ہیں، مستقبل کے ارادوں کے بارے بات ہوسکتی ہے اور ...شادی کے بارے رائے لی جاسکتی ہے۔''

اس کے معنی خیز لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے محمود نے جواب دیا۔''پسند تو کوئی خاص ہے نہیں، شادی کا فی الحال ارادہ نہیں اور مستقبل کس نے دیکھا ہے۔''

''سنا ہے بریرہ کا رشتا پہلے آپ سے ہو رہا تھا، بعد میں فیضان اور بریرہ کی پسند کو مدِنظر رکھتے ہوئے ان دونوں کی شادی کر دی گئی۔''

''صحیح سنا ہے۔''محمود نے اثبات میں سر ہلایا۔

''آپ بریرہ کو پسند کرتے تھے۔''عمارہ نے کچھ کھوجنے کی کوشش کی۔

''رضوان چچا نے عندیہ دیا اور میں نے ان کی مرضی پر سر جھکا دیا۔ بعد میں فیضان نے اپنے اور بریرہ کے تعلق کے بارے سب کچھ بتا دیا پس میں نے ان کے درمیان سے ہٹنا ہی بہتر سمجھا۔''

عمارہ نے ذومعنی لہجے میں پوچھا۔''کسی اور لڑکی کے بارے پوچھا جاتا تو آپ کا جواب کیا ہوتا؟''

''کس کے بارے میں؟'' سرخ بتی پر رکتے ہوئے محمود اس کی جانب متوجہ ہوا۔

''کوئی بھی لڑکی، فرض کرو میرے بارے میں۔''عمارہ نے دبے لفظوں میں اظہار کر ہی دیا تھا۔

گہرا سانس لیتے ہوئے محمود نے سرخ بتی کو گھورا اور پھر آہستہ سے بولا۔''تب بھی میں وہی کہتا جو اس وقت کہا تھا۔''

''گویا میں آپ کو قبول ہوں۔''عمارہ کی آواز جذبات سے بوجھل ہوگئی تھی۔

سبز بتی جلی اور اس نے کار آگے بڑھا دی۔ کار میں خاموشی چھا گئی تھی۔ دو تین منٹ عمارہ نے انتظار کی سولی پر لٹکتے گزارے تھے۔ وہ محمود کی جانب دیکھنے کے بجائے گود میں رکھے ہاتھوں کی طرف متوجہ تھی۔

''ہاں۔''طویل ہوتی خاموشی کو محمود کی گھمبیر آواز نے خوشی کے نغمے کا روپ دیا۔

''شکریہ محمود!......آپ نے مجھے اتنا مان دیا۔''عمارہ کی آواز میں خوشی ہلکورے لے رہی تھی۔

''عمارہ!.....میں نے زندگی میں کسی سے محبت کی ہے تو وہ دعا ہے، کسی کو توجہ دی ہے تو وہ دعا ہے، کسی کا خیال رکھا ہے تو وہ دعا ہے، کسی کے لیے راتیں جاگا ہوں تو وہ دعا ہے، کسی کی بہتری کے لیے سوچا ہے تو وہ دعا ہے۔ میں نے اسے ماں کی ممتا سے بھی نوازا ہے، باپ کی شفقت بھی دی ہے، اور بھائی کا مان اور عزت بھی دی ہے۔ اس کی ہر جائز و ناجائز خواہش پوری کی ہے۔ جو اس نے مانگا ہے وہ بھی دیا اور جو نہیں مانگا وہ دینے کی کوشش بھی کی ہے۔ تو مجھ سے رشتا باندھنے سے پہلے یہ ذہن میں رہے کہ آپ کو دعا کا وجود برداشت کرنا ہوگا۔ بعض اوقات وہ ہٹ دھرمی اور ضد پر اتر آتی ہے، ایسے موقع پر آپ نے حوصلے اور صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا۔ وہ میرے لیے بہن بھی ہے بیٹی بھی ہے اور میری سب سے اچھی دوست بھی ہے۔ اس لیے یہ نہ ہو کہ آپ اس کی عادتوں یا باتوں کو لے کر اپنا خون بھی جلاتی رہیں اور اس کے خلاف دل میں کوئی الٹا سیدھا سوچتی رہیں۔ اگر ایسا ہے تو ہم اس رستے پر قدم نہیں بڑھاتے۔ اور یہ بھی یاد رکھنا کہ اس کی شادی کے بعد میرا اور اس کا تعلق اسی طرح رہے گا۔ میں اس کی ہر بات کو اسی طرح اپنی پہلی ترجیح پر رکھوں گا۔ اگر آپ کو یہ سب قبول ہے تو مجھے آپ سے اچھا رشتا ملے گا بھی نہیں۔ آپ خوب صورت ہیں، پڑھی

ی ہیں اور سب سے بڑھ کر میری پیاری پھوپھو کی
بیٹی ہیں۔"

"تقریر آپ کافی اچھی کر لیتے ہیں۔" عمارہ کے
ہونٹوں پر خوب صورت مسکراہٹ کھلنے لگی تھی۔

"کسی کو زندگی کا ساتھی بنانے سے پہلے اپنی
کمزوریوں اور خامیوں سے آگاہ کرنا ضروری ہوتا
ہے اور دعا میری سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اگر
میں پھپھو کے گھر آپ تک پہنچا ہوا ہوں تو اس کی
وجہ دعا کا وجود ہے۔"

"میرا خیال ہے دعا بی بی کا تذکرہ کافی سے
زیادہ ہو گیا ہے اب اپنے بارے بھی کچھ
بتائیے۔" عمارہ نے بظاہر مزاحیہ انداز اختیار کیا تھا
لیکن اس کے لہجے میں ہلکے سے حسد کی بو آ رہی تھی۔

"ایک ہی گھر میں تو رہ رہے ہیں میرے بارے
بعد میں سب کچھ جان لو گی۔ کون سا ہماری آج ہی
شادی ہو رہی ہے۔"

"باقی سب کچھ جان لوں گی تو دعا کے
بارے بھی تو پہلے جان لینا تھا۔" عمارہ کو دعا والی
باتیں ہضم نہیں ہوئی تھیں۔ محمود اب تک اس کا بنا نہیں
تھا اور دعا اسے ناپسندیدہ ہستی لگنے لگی تھی۔ شادی کے
بعد تو شاید وہ دعا کو ایک لمحہ بھی برداشت نہ کر پاتی۔

"ہاں بس کے بارے اس لیے بتانا ضروری سمجھا
کہ بعد میں محبت قائم رہے۔ یہ نہ ہو شادی کے بعد
آپ دعا کی طرف میرا التفات دیکھ کر مجھ سے جھگڑنے
کی کوشش کریں تو میں نے پہلے سے متنبہ کرنا ضروری
سمجھا۔"

"محمود!.... ایک لڑکی کو شوہر کی توجہ کسی دوسری
لڑکی کی طرف منتقل ہوتے دیکھ کر تب غصہ آتا ہے جب
شوہر کی سوچ میں آلودگی ہوتی ہے۔ اگر کسی کا شوہر اپنی
بہن کا خیال رکھتا ہے یا اسے اہمیت دیتا ہے تو اس کا
بیوی کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اگر تنہائی کے ساتھی
کی خلوتیں صرف میرے لیے مخصوص ہیں تو مجھے کوئی
فرق نہیں پڑتا، کہ اس کی بہن کی اس کی زندگی میں کیا
اہمیت ہے یا اس کی ماں کو اس کی زندگی میں کیا مقام
حاصل ہے۔"

"مجھے آپ سے یہی امید تھی۔" دعا کے اسکول
کے سامنے کار روکتے ہوئے اس نے عمارہ کے ہاتھ کو
پکڑ کر دبا دیا تھا۔ وہ ٹھیک چھٹی کے وقت پہنچے تھے۔
بچیاں کسی سیلاب کی طرح اسکول کے گیٹ سے نکل کر
پارکنگ میں کھڑی کاروں، رکشوں، سوزکیوں اور موٹر
سائیکلوں پر بیٹھ رہی تھیں۔ کچھ پیدل ہی روانہ تھیں۔ جلد
ہی دعا بھی اسکول کے دروازے سے باہر نکلتی نظر آئی۔
عمارہ بغیر کچھ کہے عقبی جانب منتقل ہو گئی تھی۔

دعا آتے ہی۔ "السلام علیکم!" کہہ کر بیٹھ گئی۔

"آج تو گڑیا کچھ زیادہ ہی تھکی تھکی لگ رہی
ہے؟" محمود نے کار آگے بڑھاتے ہوئے شفقت
بھرے لہجے میں پوچھا۔

وہ جمائی لیتے ہوئے بولی۔ "بھیا!......امتحان
قریب ہیں اور ساری استانیاں بقیہ اسباق ختم کرانے
کے چکروں میں ہیں۔"

"تو ارادہ کیا ہے، پہلی پوزیشن برقرار رکھنی ہے یا
کسی اور کو آگے آنے کا موقع دو گی؟"

"اتنی آسانی سے تو آگے آنے کا موقع نہیں دیا
کرتی، البتہ قسمت کسی کا ساتھ دے جائے تو کچھ کہہ
نہیں سکتی۔"

"یہ تو وقت آنے پر پتا چلے گا؟" عمارہ کے دماغ
میں عجیب و غریب سوچ لہرائی۔ محمود کی وضاحت اور
اس کے اپنے اعتراف کے باوجود نہ جانے کیوں دعا
اسے ایک رقیب کی طرح لگ رہی تھی۔ ایک چھوٹی سی
بچی کو اپنا رقیب سمجھنا اس کی بیمار سوچ ہی کا شاخسانہ تھا۔

''اچھا دوپہر کا کھانا تو وقت پر کھا لیا تھا نا؟''

''بھیا! ....وہ ....ہیں....'' دعا نے ہکلاتے ہوئے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

''ہاں کیا وہ؟'' محمود نے ان کی طرف خفگی بھری نظروں سے گھورا۔

''بھیا! ....لنچ بکس کھولا تو آلو مٹر بنے تھے اور آپ جانتے ہیں مجھے یہ سالن ایک آنکھ نہیں بھاتا۔''

''تو کینٹین سے کچھ کھا لیتیں۔''

''میں نے سوچا آج بھیا سے خرچا کرواؤں گی۔'' دعا نے پینترا بدلا۔ ''یوں بھی آج عمارہ آپی کا پہلا دن تھا تو ان کی دعوت کرنا تو بنتا ہے نا۔''

محمود کو اس کی چالاکی پر ہنسی آ گئی تھی۔ اپنے فعل کی کوئی نہ کوئی توجیہہ اس کے پاس ضرور موجود ہوتی تھی۔

''تمھیں اتنی جلدی مناسب بہانہ کیسے سوجھ جاتا ہے۔'' محمود نے اس کی طرف جھک کر سرگوشی کی۔

''ہا.... ہا.... ہا.'' دعا نے قہقہہ لگایا۔ محمود کو محسوس ہوا دعا کے خوب صورت قہقہے نے کار کی فضا میں نغمے بکھیر دیے ہوں۔ جبکہ اس کا ہنسنا عمارہ کی سماعتوں پر سخت گراں گزرا تھا۔ اپنی اپنی سوچ اور ترجیحات ہوتی ہیں۔ ایک ہی شخصیت کسی کے لیے دنیا کی سب سے عزیز اور پیاری ہستی ہوتی ہے جبکہ دوسرے کے لیے مبغوض ترین اور قابلِ نفرت شخصیت۔

''عمارہ آپی آپ بتائیں کیا میں نے غلط کہا ہے؟'' دعا پیچھے مڑ کر اس کی جانب متوجہ ہوئی۔

''کیا کہہ سکتی ہوں۔'' عمارہ نے روکھے سے لہجے میں کہا۔ چاہنے کے باوجود وہ دعا کو ایسی اہمیت نہیں دے پا رہی تھی جس کا محمود نے تقاضا کیا تھا۔

''گویا آپ کو محمود بھائی کی جیب ہلکی کروانا گوارا نہیں ہے۔'' دعا نے اس کی بیزاری کو اہمیت نہیں دی تھی۔

مُردہ

سانسوں کا رُک جانا ہی موت نہیں ہے، وہ انسان بھی مرا ہوا ہی ہے جس نے غلط کو غلط کہنے کی ہمت کھو دی۔

محمود نے ایک اچھے سے ہوٹل کی پارکنگ میں کار موڑی کہ دعا کی ہر خواہش کو پورا کرنا وہ ضروری خیال کیا کرتا تھا۔ پارکنگ میں کار روک کر وہ اسے سمجھانے لگا۔

''یہ جو تم تھکی تھکی اور مضمحل لگ رہی ہو نا، اس کی وجہ یہی ہے کہ تم نے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا ہے۔ آئندہ لنچ بکس گھر ہی میں کھول کر دیکھ لیا کرو تا کہ میں رستے میں کوئی اچھی چیز پیک کروا کر تمھارے حوالے کر دیا کروں۔''

''دعا بی بی کا کھانا نہ کھانا گویا بہت بڑا مسئلہ ہے جو موصوف کو اتنی پریشانی ہو رہی ہے۔'' عمارہ نے جل کر سوچا۔ مگر یہ بات وہ ہونٹوں پر نہیں لا سکتی تھی۔ ابھی تک وہ محمود کے لیے اتنی ضروری نہیں ہوئی تھی کہ وہ اس کی بات کو کوئی اہمیت دیتا۔ سب سے پہلے اسے محمود کے دل میں جگہ بنانا تھی اس کے بعد ہی دعا کا سدِباب کر سکتی تھی۔

انھیں فیملی کیبن میں لے جا کر بٹھاتے ہوئے محمود نے عمارہ کی پسند پوچھی۔

عمارہ نے جواب دیا۔ ''آلو مٹر قیمہ بہتر رہے گا۔''

''گڑیا تو بریانی ہی کھائے گی نا؟'' محمود نے دعا سے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

محمود نے بیرے کو بلا کر کہا۔ ''دو پلیٹ آلو مٹر قیمہ اور ایک بریانی لے آؤ۔''

''وہ جی سر!'' کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

اچانک دعا اٹھتے ہوئے بولی۔

''مجھے نہیں کھانا کھانا۔'' یہ کہتے ہی وہ اٹھ کر دروازے کی طرف چل پڑی تھی۔

''گڑیا، کیا ہوا'' محمود نے پریشان ہو کر اسے آواز دی۔ مگر وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے کیبن سے باہر نکل گئی تھی۔

محمود نے سوالیہ نظروں سے عمارہ کی طرف دیکھا۔ وہ منہ بناتے ہوئے کندھے اچکا کر رہ گئی تھی۔

''مجھے معلوم ہے۔'' محمود پھیکے انداز میں ہنسا۔

''چلو کھانا پیک کرواتے ہیں، گھر جا کر کھالیں گے۔''

''مگر'' عمارہ نے کچھ کہنے کے لیے لب ہلانا چاہے لیکن محمود کاؤنٹر کی طرف بڑھ چکا تھا۔ اس نے لب سختی سے بھینچ لیے تھے۔ اس کے دماغ میں محمود کی گفتگو گونجنے لگی۔ یقیناً محمود عقل مند تھا جو اس نے عمارہ سے تعلق کی ابتدا کرنے سے پہلے ہی اس کے امکانی غصے کا سدِباب کر دیا تھا۔ وہ شولڈر بیگ کندھے سے لٹکا کر پارکنگ کی طرف چل پڑی۔ دعا کار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی تھی۔

''یہ کیا حرکت ہے دعا!...... جانتی ہو کتنی بدتہذیبی اور گنوار پنے کی علامت ہے۔'' محمود کی آمد سے پہلے اس نے دعا کو ہلکی سی سرزنش کرنا ضروری سمجھا تھا۔

عمارہ آپی! یقیناً آپ مجھے تہذیب سکھانے نہیں بلکہ اپنی پڑھائی مکمل کرنے آئی ہیں تو کیوں نہ آپ اپنے مقصد ہی پر توجہ دیں اور میرا اخلاق سدھارنے کا کام محمود بھیا پر چھوڑ دیں۔''

اس کے بے جھجک تلے جواب سے عمارہ سلگ کر رہ گئی تھی۔ کم عمر ہونے کے باوجود وہ بات کرنا جانتی تھی۔

عمارہ کو لگا وہ اتنا آسان ہدف بھی نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس نے کوشش جاری رکھی۔ ''آپی بھی کہتی ہو اور میرے سمجھانے کا برا بھی مانتی ہو۔''

''آپی تو میں ہر بڑی لڑکی کو کہتی ہوں تو کیا مجھ سے جتنی بھی بڑی لڑکیاں ہیں تمام کو سرپرست مان کر ان کے احکامات کی بجا آوری شروع کر دوں۔''

عمارہ کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ وہ چھوٹی سی لڑکی اتنی حاضر جواب ہوگی۔ مگر اب خاموش ہونا ہار ماننے کے مترادف تھا اور وہ دعا سے ہار ماننے پر تیار نہیں تھی۔

''مگر میں تو تمہاری سگی پھوپھو کی بیٹی ہوں تمہاری حقیقی آپی اور پھر میں تمہارے بھیا کی بیوی بھی تو بننے والی ہوں۔''

دعا نے اسے کڑے تیوروں سے گھورا عمارہ کو لگا وہ اسے خاموش کرانے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ لیکن یہ اس کی خام خیالی تھی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ نپے تلے الفاظ میں بولی۔

''آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ بھیا کی بیوی کون بنے گی اس کا فیصلہ میں کروں گی، اگر آپ کو میری بات میں کوئی شک ہے تو ابھی بھیا سے تصدیق کروا سکتی ہوں۔ اور جہاں تک تعلق ہے آپ کے آپی ہونے کا تو اسی وجہ سے تو اتنی دیر سے آپ کی جلی کٹی سن رہی ہوں اگر کوئی دوسری لڑکی ہوتی تو وہ کھری کھری سناتی کہ کسی اپنے کو بھی نصیحت کرنا بھول جاتی۔''

''پتا نہیں اس کے علاوہ تم کیا کھری کھری سناؤ گی۔'' جلے کٹے انداز میں کہہ کر وہ ہوٹل کے داخلی دروازے کی طرف متوجہ ہو گئی جہاں سے محمود پیک کرائے ہوئے کھانے کا شاپر پکڑے آ رہا تھا۔ قریب آ کر اس نے کار کا دروازہ کھولا اور خاموشی سے اندر بیٹھ گیا اس وقت دعا سے کچھ پوچھنا جنگ چھیڑنے کے

معترف تھا۔

دعا نے بھی محمود کے چہرے پر خفگی دیکھ لی تھی، مگر وہ ایسی باتوں کو خاطر میں لانے والی نہیں تھی۔ اس کے نزدیک خفا ہونا صرف اس کا حق بنتا تھا اور آج تک وہ اس حق کا بے دریغ استعمال کرتی آ رہی تھی۔

رستے بھر وہ خاموش رہے تھے۔ محمود نے ایک دو بار دعا کو مخاطب کرنے کی کوشش کی مگر وہ جواب دیے بغیر خاموش بیٹھی رہی۔ مجبوراً محمود کو بھی چپ سادھنا پڑی۔

کار گیراج میں کھڑی کرتے ہی دعا ایک جھٹکے سے دروازہ کھولتے ہوئے نیچے اتری اور اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

محمود عمارہ کو مخاطب ہوا ''آپ جا کر تازہ دم ہوں میں شاہینہ ماسی کو کہہ دیتا ہوں وہ کھانا گرم کر دے گی۔ مجھے فی الحال دعا کے ساتھ ہی کھانا پڑے گا۔''

غلطی بھی اس کی ہے اور آپ اسے مناتے بھی رہیں گے۔''

''غلطی کون سی، چھوٹی سی بچی ہی تو ہے۔''

''ویسے اس کی ناراضی کی وجہ کیا ہے؟'' عمارہ نہ چاہتے ہوئے بھی پوچھ بیٹھی، ورنہ اس کے نزدیک دعا کی شخصیت اتنی اہم نہیں تھی کہ پیٹھ پیچھے اسے یاد کیا جاتا۔

''وجہ.....'' محمود بے اختیار ہنس پڑا۔ ''وجہ یہ ہے کہ آلو مٹر اسے پسند نہیں ہیں اور آج دوپہر کا کھانا بھی اس نے اسی وجہ سے نہیں کھایا تھا۔ آپ کے آلو مٹر قیمہ منگوانے کی وجہ سے میں نے بھی غلطی سے اسی سالن کا بتا دیا۔ اور اس کے تئیں اسے نظر انداز کیا گیا۔ بس خفا ہونے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگایا۔''

''اگر آپ اسے نہ منائیں پھر؟'' عمارہ نے پوچھا۔

''پھر وہ ساری رات بھوکی رہے گی اور صبح ناشتا بھی نہیں کرے گی۔ اسکول جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

عمارہ نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے اگر ایک دو رات بھوکا رہنے دیا جائے تو اس کا دماغ درست ہو سکتا ہے۔''

''وہ تو شاید ایک رات کی بھوک برداشت کر لے، اگر اس نے نہ کھایا تو مجھے ضرور کچھ ہو جائے گا۔'' محمود نے افسوس بھرے انداز میں سر ہلایا۔ ''اللہ کی بندی مجھے اب تک اس کے دوپہر کو کھانا نہ کھانے کی تکلیف محسوس ہو رہی ہے اور آپ اس کے رات بھر بھوکا رہنے کی تیاری کیے بیٹھی ہیں۔''

''اس طرح تو وہ نہیں سدھرے گی۔''

''وہ بگڑی کب ہے کہ سدھرے گی؟'' اس مرتبہ محمود کے لہجے میں طنز شامل تھا۔

''تو بگڑنا کسے کہتے ہیں۔''

''محترمہ، یہ اپنے بھیا سے لاڈ اٹھوانا ہے۔ وہ میرے بارے حساس ہے اور وہ اگر کھانا چھوڑ کر آئی ہے تو اسی لیے کہ اسے یقین تھا کہ بریانی اس کے پیچھے پیچھے پہنچے گی۔ اور بتاؤ کیا وہ آپ سے باتیں کر نہیں رہی تھی۔''

''ہاں کر رہی تھی۔'' عمارہ نے اعتراف میں سر ہلایا۔

''اور جب میں نے دو تین بار مخاطب کیا تو کوئی جواب بھی نہیں دیا۔ کس لیے؟ کیونکہ ناراضی صرف میرے ساتھ تھی۔''

''ٹھیک ہے جی!'' عمارہ کار سے نکلتے ہوئے بولی۔ ''آپ جانیں اور آپ کی لاڈلی، مجھے اس جھگڑے سے دور ہی رکھو۔''

(جاری ہے)

شکاریات

پیلی بھیت کا آدم خور جوڑا

شیر پہلے اپنے شکار سے کھیلتا ہے پھر ایک دم جھپٹ کر گرفت میں لے کر گردن توڑ ڈالتا ہے۔ کٹی ہوئی گردن سے بہتا خون چاٹتا ہے۔۔ اس دم اس کا عتاب دیکھنے لائق ہوتا ہے۔

☆ شیخ الطاف حسین ڈیرہ دوئی
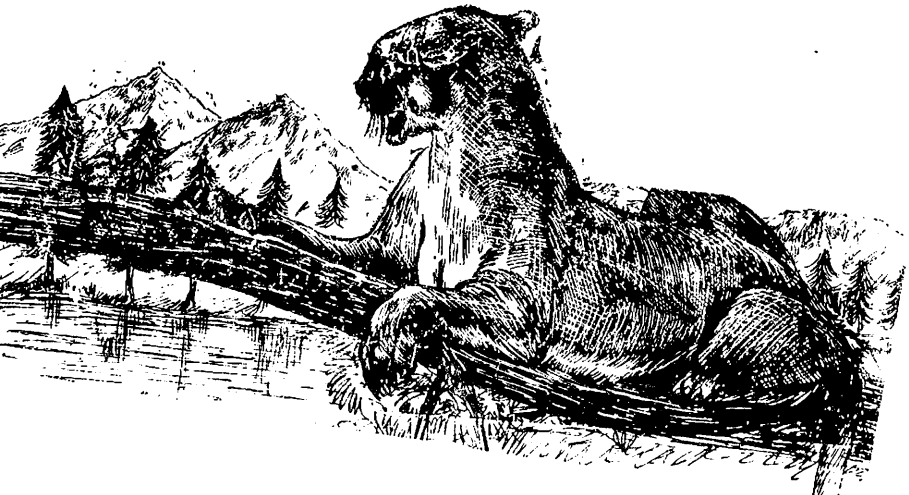
ہندوستان میں ایک ضلع پیلی بھیت ہے۔ اس کے جنگل بہت مشہور ہیں۔ بانس اور بید کے بن کثرت سے ہیں۔ عمارتی اور جلانے کی لکڑی بڑے شہروں کو یہیں سے سپلائی کی جاتی تھی۔ سینکڑوں میل پھیلے ان جنگلوں کے کچھ فاصلے پر چھوٹی دیہی آبادیاں بھی ہیں۔ اب تو زمانہ بدل گیا ہے اور تہذیب کی روشنی دور دور دیہاتوں تک پھیل چکی ہے۔ میں جس زمانے کی بات کر رہا ہوں اُس زمانے میں ان دیہی آبادیوں کے لوگ انتہائی سادہ لوح ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ عام شہری چیزوں تک سے ناواقف

تھے اور غربت کا یہ عالم کہ کبھی کبھار ہی انہیں کھانے کے لئے گوشت نصیب ہوتا تھا، وہ بھی اس صورت میں کہ اگر کوئی شکاری ادھر آ نکلا تو اس کے مارے ہوئے جانور سے پچھ ان کو بھی مل جاتا تھا۔ باقی ضرورت کا سامان یہ لوگ ان خوانچہ فروشوں سے لیتے تھے جو ان جنگلوں میں چلنے والی ریلوے لائن بیچتے تھے۔ حتیٰ کہ پینے کا پانی بھی ان کو ریل کا انجن ہی سپلائی کرتا تھا۔ یہ ریل گاڑیاں جنگل سے لکڑی لے جانے اور جنگل میں کام کرنے والوں کی سہولت کے لئے چلتی تھیں۔ ان کے جنگلی سٹیشن بھی بس چھوٹے چھوٹے تھے، دو کمرے نیچے اور دو اوپر، دن میں نیچے کام کیا اور رات کو اوپر والے کمرے بند کر کے پڑ رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان جنگلوں میں خوں خوار جانور بہت تھے اور سانپوں کی تو اس قدر بہتات تھی کہ ہزاروں طرح کے چھوٹے چھوٹے اور بڑے سے بڑے سانپ یہاں مل جاتے تھے۔ ان کے ڈر سے لوگ چارپائیاں بھی بہت اونچی اونچی استعمال کرتے تھے۔

پیلی بھیت کے جنگلوں میں ایک جنگلی شکاری پور شکار کے لئے بہت مشہور ہے۔ ان دنوں اس جنگل کی کٹائی کا ٹھیکہ میرے ایک دوست بھلن ٹھیکیدار کے پاس تھا۔ انہوں نے میرے شوق کے پیش نظر کئی بار مجھے وہاں شکار کھیلنے کی دعوت دی۔ مگر کسی نہ کسی مصروفیت کی بنا پر میں وہاں نہ جا سکا۔ اتفاق یہ کہ انہی دنوں دہرہ دون انڈین ملٹری اکیڈمی کے ایک کرنل، کرنل ٹینی جو میرے ساتھ ایک دو مرتبہ شکار میں شریک رہے تھے، اپنی چھٹیاں پیلی بھیت میں گزارنے کا پروگرام بنا بیٹھے مجھے بھی مدعو کیا اور میں اپنے ایک اور دوست پوری کے ہمراہ ان کے ساتھ جانے پر رضامند ہو گیا۔ غرض یوں ہم پیلی بھیت کے لئے روانہ ہوئے۔ رات کو پیلی بھیت ریسٹ ہاؤس میں قیام کیا اور دوسرے روز بذریعہ ٹرین ایک اور سٹیشن بلیا کے لئے روانہ ہوئے تاکہ وہاں پہنچ کر شکار کے دیگر انتظامات مکمل کریں۔ اتفاق دیکھئے کہ ہمارے دوست بھلن اسی گاڑی میں بریلی سے آ رہے تھے۔ ہم نے انہیں اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی تھی، مگر وہ مل گئے تو بہت خوش ہوئے۔ مزاج پرسی کی اور حال احوال دریافت کیا۔ ہمارا ارادہ جان کر بولے۔

''ارے میاں! بلیا میں تو آج کل ایک آدم خور شیر اور شیرنی نے تہلکہ مچا رکھا ہے۔ کٹائی کرنے والے تک کام چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔ جانے کتنے آدمی اب تک شیر اٹھا کر لے جا چکا ہے۔ میری مانو تو تم بلیا نہ جاؤ، میرے ساتھ چلو، میں تمہارا شیر کے شکار کا شوق پورا کروا دوں گا''۔

آدم خور شیر کے نام پر میرے کان کھڑے ہوئے۔ بھلن تو خائف نظر آتے تھے، مگر میرا اشتیاق یہ سن کر کچھ اور ہی بڑھ گیا۔ بھلن نے یہ دیکھا تو پھر بولے۔

''اب تک کئی شکاری بھی کوشش کر کے ہار چکے ہیں بلکہ درندے کی وحشیانہ سرگرمیوں میں کچھ اور اضافہ ہو گیا ہے''۔

وہ مجھے سمجھاتے رہے مگر شکاری زندگی میں آدم خور سے جو واسطہ پڑ رہا تھا۔ میں یہ موقع گنوانا نہیں چاہتا تھا اور پھر اُن دنوں خطروں سے کھیلنا ہی اصل زندگی تھی۔ لہٰذا میں نے سوچا یا تو آدم خور نہیں یا پھر... میں نہیں......

بلیا کا سٹیشن آیا اور بھلن کو حیران پریشان چھوڑ پھر ملنے کا وعدہ کر کے ہم اتر پڑے۔ یہ سٹیشن جنگل کے بیچ میں تھا اور صرف ایک ڈاک بنگلہ اور اس میں صرف ایک ہی چوکیدار رہتا تھا۔ جگہ دیکھی، گھومے پھرے اور چوکیدار سے کہا کہ ڈاک بنگلے کی صفائی کرو اور ہم کل

پھر آ میں گے اور یہاں ٹھہریں گے۔ وہ گھبرا گیا۔
"جناب! آپ یہاں کچھ دن ٹھہریں گے؟"
"ہاں، کیوں...... تم بھی یہاں رہتے ہو؟"
"نا جی نا، میں تو صرف دن دن رہوں ہوں۔ شام کو اپنے گھر"۔
"مگر کیوں بھئی؟"
"جناب! میں تو اس علاقے میں بہت عرصے سے ہوں۔ پہلے تو کوئی ڈر نہ تھا، مگر اب تو آپ دیکھیں اندھیرا پڑنے پر کوئی بھلا مانس آپ کو گھر سے باہر نظر نہیں آئے گا۔ بات یہ ہے کہ کچھ دن سے یہاں پر ایک آدم خور شیر آ گیا ہے۔ کئی لوگوں کو چٹ کر چکا ہے۔ رات کے اندھیرے میں جو بھی گھر سے باہر گیا اسے واپس آنا نصیب نہ ہوا۔ کوئی دس بارہ آدمی غائب ہو گئے ہیں۔ کٹان کرنے والوں نے پہلے تو تلاش کیا، مگر اُن کا نشان تک نہ ملا۔ جانے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ پھر تو کٹان کرنے والے بھی ایک ایک کر کے سب بھاگ گئے۔ ٹھیکیدار کا کام بھی ٹھپ ہو گیا۔ وہ بھی سخت پریشان ہے"۔
صاف ظاہر تھا کہ پورے علاقے میں کسی آدم خور نے تباہی مچا رکھی ہے اور پھر یہ کہ وہ خاصا چالاک بھی ہے مگر لاشوں کے نہ ملنے کی وجہ سے سادہ لوح دیہاتیوں کے دلوں میں طرح طرح کے وسوسے جنم لیتے تھے۔
"لوگوں کا خیال ہے جی کہ آدم خور شیر ہے پر اللہ ہی جانے کیا بلا ہے"۔ چوکیدار نے بھی اپنے خدشات کا اظہار کیا اور اندھیرا پڑتے ہی باہر نکلنے سے صاف انکار کر دیا، خیر! ہم یہ کہانیاں سن کر اور اسے بنگلے کی صفائی کرنے کی تاکید کر کے واپس پیلی بھیت آئے اور دوسرے روز کوئی ہفتے بھر کی ضروریات کی تمام چیزیں لے کر پھر بلیا پہنچے۔ دوپہر کے گیارہ بارہ کا وقت ہو گا جب ہم بلیا پہنچے۔ کھانے سے فراغت پائی اور پھر چوکیدار سے ٹھیکیدار کا پتہ پوچھا۔ وہ بولا۔
"یہاں سے نو میل دور ایک جنگل ہے۔ آج کل وہاں کٹان ہو رہا ہے۔ ٹھیکے دار وہیں رہتے ہیں۔ میں کل اُن کو بلا لاؤں گا"۔
چوکیدار کو رات کے وقت ڈاک بنگلے میں ٹھہرنے پر آمادہ کرنے کے لئے ہمیں اُسے اچھے سگریٹوں کا پیکٹ بھی بطور نذرانہ دینا پڑا، کیونکہ اُس کا کہنا تھا۔
"میں نے تو اپنی بیڑی سگریٹ کا انتظام بھی نہیں کیا اور اب رات پڑنے والی ہے"۔
رات کو واقعی کوئی انسان گھر سے باہر قدم نکالنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ حتیٰ کہ سٹیشن کا عملہ بھی اوپر والے کمرے بند کر کے پڑ رہتا تھا۔
سورج طلوع ہوا، ناشتے وغیرہ سے فراغت حاصل کر کے بیٹھے ہی تھے کہ چوکیدار ایک جیپ سے کود کر نکلا۔ وہ وعدے کے مطابق ٹھیکیدار کو لے آیا تھا۔ قسمت ساتھ تھی، یہ حضرت بھلن کے قریبی عزیزوں میں سے تھے اور ہم سے بھی صاحب سلامت تھی۔ کرنل سے ان کا تعارف کرایا اور اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔ انہوں نے بتایا کہ اس جنگل کا ٹھیکہ اُن کے پاس ہے اور شکار کے لئے یہ جگہ بہت مناسب اور دلچسپ ہے۔ شکار کثرت سے ملتا ہے۔ کٹان کرنے والوں کی آواز اور ان کی ہر وقت کی بول چال سے جانور انسانی آواز سے قدرے مانوس ہو کر کچھ نڈر بھی ہو گئے ہیں۔ اس لئے آسانی سے مار کھا جاتے ہیں مگر پھر انہوں نے بھی وہ کہانی سنائی جو ہم پہلے بھی سن چکے تھے۔ کہنے لگے۔
"میں نے کام شروع کیا تو میرے پاس کوئی پچاس آدمی کام پر لگے ہوئے تھے۔ آئے دن شکاری آتے جاتے رہتے تھے مگر ایک بات عجیب ہوئی۔ کوئی ایک ماہ کا عرصہ گزرا کہ ایک سکھ شکاری پارٹی آئی۔ یہ

چیا رہے تھے اور دن رات شیر کی تلاش میں سرگرداں۔ شیر تو انہیں کیا ملتا ایک روز کہیں سے شیر کا ایک بچہ مار لائے۔ یہ عام سانڈ کے کتے کے برابر ہوگا۔ تھے بہت خوش کیونکہ اپنے خیال میں سردار جی نے شیر کا شکار تو کیا چاہے وہ بچہ ہی سہی۔ سردار جی تو شیر کا بچہ مار کر چلتے بنے، مگر اسی روز سے اس جنگل میں قیامت آ گئی۔ رات رات بھر شیروں کے دھاڑنے کی آوازیں آتی رہیں اور پھر یوں ہونے لگا کہ رات کو اگر کوئی گھر سے نکلا تو واپس نہ آ سکا۔ آہستہ آہستہ ایسے واقعات روزانہ ہونے لگے۔ جان سب کو پیاری ہوتی ہے۔ میری ساری لیبر بھاگ گئی اور مجھے مجبوراً کام بند کرنا پڑا گیا۔

اب ہمیں معلوم ہوا کہ یہ آدم خور ساری کارروائی انتقاماً کر رہا ہے۔ شکاری اور شکار کے ہر اصول کے خلاف بچہ مار کر اس شکاری پارٹی نے ایک بے ضرر جانور کو خونخواری پر آمادہ کیا تھا اور اب ہر انسان اس کے انتقام کا نشانہ بن رہا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ٹھیکیدار نے یہ بھی بتایا کہ لوگوں کے خیال کے مطابق یہ نر اور مادہ تھے یعنی ایک نہیں دو یا یوں کہئے کہ ایک جوڑا تھا۔ جنگلی خونخوار شیروں کا جو بچہ مارے جانے کے غم میں پاگل ہو کر اب زندہ انسانوں کا شکار کھیل رہا تھا۔

مجھے اور کرنل کو اب مہم کے خطرناک ہونے اور حالات کی نزاکت کا احساس ہو گیا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی ہمارے ارادوں میں پختگی آ گئی۔ ان حالات میں ان آدم خوروں کا شکار اب شوق ہی نہیں ضرورت بھی بن گیا تھا، کیونکہ اس طرح تو خدشہ تھا کہ یہ جوڑا روز بروز نڈر ہو کر اپنی کارروائیاں تیز کرتا جائے گا۔ سٹیشن ماسٹر بھٹناگر بھی بڑی دوڑ دھوپ میں لگے تھے۔ کئی شکاری پارٹیاں آ کر ناکام واپس جا چکی تھیں کیونکہ یہ جوڑا نہایت ہوشیاری سے اپنے ٹھکانے بدلتا رہتا تھا اور ان کا صحیح ٹھکانا ابھی تک کسی کو نہیں مل سکا تھا۔ خود ٹھیکیدار ہر قسم کی اعانت کے لئے تیار تھا۔ اس نے ہمیں اپنی جیپ اور ڈرائیور دیا۔ ڈرائیور اس لئے کہ وہ ان جنگلوں اور آس پاس کے تمام علاقوں سے بخوبی واقف تھا۔ سٹیشن ماسٹر بھٹناگر نے ہماری خوب خاطر تواضع کی۔ ان کا سٹیشن بھی وہی دو منزلہ چھوٹا سا تھا اور کل دو آدمیوں کا سٹاف۔ انہیں شکار سے بس اسی حد تک دلچسپی تھی کہ ایک ڈبل بیرل بندوق تھی جس سے چھوٹا موٹا جانور مار کر اس کا گوشت کھا لیا کرتے تھے۔ اُن سے بھی آدم خور جوڑے کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوئیں۔ ان کا کہنا تھا کہ آدم خور جوڑا نہایت عیار ہے اور کہیں ایک جگہ قیام نہیں کرتا۔ آج یہاں، کل وہاں۔ کئی مرتبہ تو خود ان کے کوارٹروں کے پاس بالکل یوں دبے پاؤں آئے جیسے کوئی چور آتا ہے اور خطرے کی بو سونگھ کر یونہی تیزی سے سانپ کی طرح فرار ہو گئے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اب بھی سٹیشن کوارٹر کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ ہم لوگ چونکہ ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہیں، اس لئے وہ انسانی بو پا کر وہاں بھی ضرور آئیں گے۔

اب مشکل یہ آن پڑی کہ آدم خور جوڑے کا کوئی واضح ٹھکانہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ ہم اور کرنل اس سوچ میں تھے کہ کس جگہ اور کیا صورت اُن کے مارنے کی بہتر ہو گی۔ بھٹناگر کے خیال میں اس کام کے لئے کسی ماہر کھوجی کا ہونا بہت ضروری تھا۔ وہاں اوّل تو آدمی کم اور جو تھے وہ بھی حد درجہ خائف... کوئی آگے بڑھنے کی ہمت نہ کرتا تھا۔ اچانک مجھے سنت رام کا خیال آیا، سنت رام ماہر تھا اور شکاری اس مہم میں ہمارے لئے بہت معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ میں نے فوراً اسے سفر خرچ اور تار روانہ کیا اور آنے کی تاکید کی۔ اس طرف سے اطمینان کر کے ہم نے طے کیا کہ رات کو ریسٹ

ہاؤس میں کرنل رہیں گے اور میں بھٹناگر کے پاس سٹیشن پر رات گزاروں گا۔ مقصد یہ تھا کہ ممکن ہے شیر رات کو ادھر اُدھر آ نکلے۔ میں ضروری سامان لے کر سرِشام ہی بھٹناگر کے پاس چلا گیا اور لائن مین کی ڈیوٹی رات کو جاگنے کی لگا دی۔ رات سکون سے گزری صبح مجھے بڑی مایوسی ہوئی مگر دوسرے روز آدھی رات کو میں نے اپنے کاندھوں پر ہاتھوں کا دباؤ محسوس کیا۔ لائن مین مجھے اٹھا رہا تھا۔ میں نے فوراً رائفل سنبھالی اور چوکنا ہو گیا۔ رات کی خاموشی میں شیر کی دھاڑ یک بارگی گونج اٹھی۔ میں نے سب طرف نظر دوڑائی مگر نظر کچھ بھی نہ آیا۔ البتہ آوازیں وقفے وقفے کے بعد آتی رہیں۔ کبھی نزدیک سے، کبھی دور سے ... اب جو غور کیا تو ایک آواز بہت تیز اور گرج دار تھی، دوسری قدرے کمزور اور دھیمی۔ مجھے بھی یقین ہو گیا کہ شیر اور شیرنی کہیں آس پاس ہیں۔ سرچ لائٹ ڈال کر دیکھا، مگر نظر کچھ نہ آیا، البتہ آوازیں آنی بند ہو گئیں۔ میں پھر بھی ہوشیار بیٹھا رہا۔ رات کے پچھلے پہر ایک دو بار دور سے دھاڑ سنائی دی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

صبح کرنل سے معلوم ہوا کہ وہ بھی رات بھر آوازوں پر جاگ جاگ کر شیروں کو دیکھنے کی کوشش میں لگے رہے مگر نظر نہ پڑ سکی لیکن اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ وہ جوڑا اسی جنگل میں ہے۔ اب ہمیں اپنی کامیابی کا امکان نظر آنے لگا۔

دوسری رات پھر بغیر کسی قابلِ ذکر حادثے کے گزر گئی۔ تیسرے روز سنت رام پہنچ گیا، وہ پورے حالات سن کر بولا۔

"ارے جی! ایک جوڑا کیا، چار بھی ہوں، بس ایک ہفتہ لگے گا"۔ اس نے کہا کہ اُسے دو ایسے آدمی چاہییں جو اس علاقے کو اچھی طرح جانتے ہوں۔ ہم نے ٹھیکیدار کے پاس فوراً رقعہ بھیجا اور ڈرائیور دو کڑیل

دین کا خلاصہ

اللہ تعالیٰ سے اخلاص کا تعلق اور بندوں سے فلاح کا تعلق۔

جوانوں کے ہمراہ جلد ہی واپس آ گیا۔ ٹھیکیدار خود بھی چلا آیا۔ خیر، سنت رام نے دو نالی بندوق اور چار کارتوس مانگے، میں نے اُسے بندوق اور کارتوسوں کی پیٹی دے دی۔ دو روز تک سنت رام بندوق لئے ان دو آدمیوں کی ہمراہ میں جنگل جنگل گھومتا رہا۔ صبح جاتا رات گئے واپس آتا اور پھر صبح دم نکل جاتا۔ آس پاس کے لوگوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ ایک شکاری پارٹی آدم خوروں کے شکار کے لئے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہری ہوئی ہے۔ اکثر لوگ ہماری خیر خیریت پوچھنے اور کام کرنے کو آنے لگے اور علاقے میں کچھ زندگی کے آثار پیدا ہو گئے۔

میں رات سٹیشن پر گزارتا اور کرنل ریسٹ ہاؤس میں... واپس آ کر ابھی ہم دونوں باتیں ہی کر رہے تھے کہ کلہاڑے گنڈاسے لئے پانچ چھ دیہاتی پہنچ آئے۔ اُن میں سے ایک دیہاتی کا لڑکا شام کے وقت جانوروں کو پانی پلا کر واپس لا رہا تھا کہ اچانک ایک جھاڑی سے شیر نکلا۔ جانوروں میں کھلبلی مچ گئی۔ جانور تو بھاگ کھڑے ہوئے مگر گائے کا ایک بچھڑا جنگل کے اندر کی طرف بھاگ نکلا۔ لڑکا فوراً ایک قریبی اونچے درخت پر چڑھ گیا۔ شیر بچھڑے کے پیچھے بھاگا۔ لڑکے کو موقع ملا اور وہ پیڑ سے کود کر ہانپتا ہانپتا گھر پہنچ گیا۔ رات کو بچھڑا واپس نہ آیا۔ سوچا کہ وہ شیر کے ہتھے چڑھ گیا ہو گا۔ صبح وہ جنگل میں ایک جگہ خون میں لت پت پڑا ملا۔ شیر نے اسے بس برائے نام ہی کھایا تھا۔

ہم نے انہیں بتایا کہ ہمارا کھوجی تو خود جنگل کے اندر گیا ہوا ہے۔ وہ شخص جس کا بچھڑا تھا اُسے ہم نے وہیں روک لیا اور سنت رام کا انتظار کرنے لگے۔ کیونکہ ہمارے فیصلے کا انحصار سنت رام کی رائے ہی پر تھا۔ سنت رام واپس آیا تو ہم نے اُسے دیہاتی سے ملایا اور واقعہ بتایا۔ اُس نے کہا۔ مجھے وہ جگہ دکھا لاؤ۔ یہ سننا تھا کہ دیہاتی بدحواس ہوگیا۔ رات پڑنے والی تھی اور وہ کسی حال میں باہر نکلنے کو راضی نہ تھا اور ساتھ ہی یہ اصرار بھی کہ گھر واپس جاؤں گا، ورنہ گھر میں ماتم پڑ جائے گا۔ بستی والے سمجھیں گے کہ اُسے بھی آدم خور چٹ کر گیا۔ مجبوراً اسے جیپ میں بستی تک پہنچایا۔ صبح وہ خود ہی چلا آیا اور سنت رام کو لے کر وہ جگہ دکھا لایا۔ سنت رام نے خیال ظاہر کیا کہ لاش تین دن کی باسی ہو چکی ہے اور شیر باسی شکار پر اب شاید ہی آئے مگر میرے اور کرنل کے نزدیک اب اور وقت ضائع کرنا حماقت تھی۔ ہم نے کہا کہ تم فوراً جگہ دیکھ کر مچان بنا دو، ہم وہاں پہنچتے ہیں۔ ممکن ہے لاش پر شیر آ ہی جائے۔ ہم دونوں ضروری سامان لے کر وہاں پہنچ گئے۔

مچان سے بچھڑے کی لاش صاف نظر آ رہی تھی۔ اب ہم دونوں اس طرح مچان پر بیٹھے کہ ایک طرف سے کرنل اور دوسری طرف سے میں سب طرف بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ کچھ وقت انتہائی خاموشی سے گزر گیا، پھر کوئی چاپ سنائی دی۔ ہم نے غور کیا تو یہ ایک پینتھر کیٹ (Panther Cat) تھا۔ یہ بڑا خوبصورت بالکل چیتے کی شکل کا ایک بلا ہوتا ہے اور جانوروں اور پرندوں کے بچوں کو چٹ کر جاتا ہے۔ خرگوش اُس کی من پسند غذا ہے۔ فارسٹ کی طرف سے اس کے شکار پر انعام ملتا تھا۔ اب یہی بلا ہمارے سامنے بڑی بے فکری سے چہل قدمی کر رہا تھا اور ہم رائفلیں سنبھالے بیٹھے بے بسی سے دیکھ رہے تھے۔ صرف اس وجہ سے کہ یہ وقت شکار کا شوق پورا کرنے کا نہ تھا۔ ہمیں تو اپنے خاص شکار کا انتظار تھا اور فائر کر کے ہم اُسے خبردار نہیں کرنا چاہتے تھے۔ پھر خاموشی چھا گئی اور ہم انتظار کی کوفت میں گرفتار...... کوئی دو گھنٹے بعد ایک نیل گائے بڑے خوبصورت سینگوں والی مست خرامی سے ہمارے سامنے سے گزر گئی۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ چیتل کی آواز پر ہم دونوں چونک پڑے۔ یہ چیتل بھاگتی جاتی تھی اور ٹونکتی جاتی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ شیر اس کے تعاقب میں ہے۔ کچھ دیر بعد کچھ ایسا شور ہوا جیسے بہت سے جانور بیک وقت کسی خطرے کی بو پا کر بھاگ پڑتے ہیں۔ ہم چوکنے ہوئے، روشنی ڈالی تو کچھ نظر آیا، پھر آہٹ ہوئی۔ بچھڑے کی لاش پر روشنی ڈالی تو بڑی مایوسی ہوئی کیونکہ دو تین گیدڑ اس کی لاش کو نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔ کرنل نے میری طرف دیکھا اور گردن ہلا دی۔ مطلب یہ ہوا کہ اب انتظار بے کار ہے۔ شیر اب اس لاش پر نہیں آئے گا۔ باقی رات ہم نے سگریٹ پی پی کر صبح کے انتظار میں کاٹ دی۔ دوسرے دن ہم نے بہت سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ شیر کے بچھڑے پر نہ آنے کی صرف یہی وجہ ہو سکتی ہے، کہ اُسے کہیں اور کوئی شکار مل گیا ہوگا اور اس نے تازہ شکار کے گوشت سے پیٹ بھر لیا۔

دوسرے روز کھوجی پھر جنگل کا جائزہ لینے نکل گئے۔ ایک جگہ گھنے درختوں کی طرف انہیں کچھ یوں محسوس ہوا جیسے کوئی جانور اٹھ کر بھاگا ہو۔ اس جگہ جنگل نہایت گھنا تھا۔ کچھ نظر نہ آیا پھر قریب ہی سے شیر کے غرانے کی آواز بھی سنائی دی۔ ایسی غراہٹ کی آواز شیر عموماً غصے کے عالم میں نکالتا ہے۔ کھوجیوں نے اُس وقت ہمت سے کام لیا اور لاٹھیاں زمین پر مار مار کر اور چیخ چیخ کر خوب شور مچایا۔ آواز آنی بند ہوگئی۔ اب جو بڑھ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اُس جگہ شیر نے ایک ڈھور

(ایک قسم کا جنگلی بکرا) کو دبوچ رکھا تھا۔ ابھی صرف اس کی گردن ہی مروڑ پایا تھا کہ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ یہ لوگ اٹھا کر لے آئے اور دعوت اڑائی۔

سنت رام نے یہ بھی پتہ لگایا کہ جنگل میں ایک جوہڑ ہے جہاں اکثر جانور پانی پینے آتے ہیں۔ شیر شکار کی تلاش میں وہاں ضرور آتا ہوگا۔ اصل میں شیر شکار کی تلاش میں اُسی وقت نکلتا ہے جب بھوکا ہو۔ اگر اسے جنگل میں تازہ اور کثرت سے شکار مل جائے تو وہ باہر آبادی میں شاذ و نادر ہی آتا ہے، مگر ہمارا تو مقابلہ اُس آدم خور سے تھا جو ضرور تاً نہیں، انتقاماً انسان کا شکار کر رہا تھا۔ اب فیصلہ یہ ہوا کہ اس جگہ ایک گائے، بچھڑا باندھا جائے جہاں شیر نے دھودڑ کو مارا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک شیر کی کوئی خبر اور اس کا کوئی اتہ پتہ نہ مل سکا تھا۔ اب میں اور کرنل بجائے لاش کے زندہ بندھے ہوئے کٹڑے بچھڑے شیر کے انتظار میں مچان پر بیٹھے تھے۔ جب ہم مچان پر بیٹھے تو ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا۔ جنگل کا کچھ اپنا ہی حسن ہوتا ہے۔ ہم دونوں نے جنگل میں ڈوبتی ہوئی شام کا نظارہ بڑے شوق سے کیا۔ مرغ، مور ہمارے سامنے سے گزرتے رہے۔ ایک بارہ سنگھا بھی نہایت اطمینان سے چرتے چرتے گزر گیا۔

جونہی رات کا اندھیرا پھیلا بچھڑے نے اچھلنا کودنا شروع کر دیا۔ یہ بات اس بات کا ثبوت تھی کہ یا تو اس نے شیر کو دیکھ لیا ہے یا اُس کی بو سے گھبرا رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد شیر کی ایسی دھاڑ سنائی دی کہ پورا جنگل گونج اٹھا۔ بچھڑے کی حالت قابلِ دید تھی۔ میرا فیصلہ تھا کہ جس وقت شیر بچھڑے پر حملہ کرے گا، اُس وقت فائر کروں گا، کیونکہ شیر جب شکار مارتا ہے تو اُس میں کچھ تھوڑا سا وقت لگتا ہے۔ پہلے تو وہ اپنے شکار سے کھیل سا کھیلتا ہے۔ کبھی ادھر کبھی ادھر، پھر بڑی

مشکل وقت

ہمیشہ مشکل نہیں رہتا لیکن مشکل وقت میں سب کی پہچان ہو جاتی ہے اور وہ پہچان کوئی بھی نہیں بھولتا۔

خوبصورتی سے شکار پر جھپٹتا ہے اور ایک دم چھلانگ لگا کر شکار کو دبوچ لیتا ہے اتنی مضبوطی سے کہ پھر وہ اس کی گرفت سے نکل نہیں سکتا۔ فوراً اس کی گردن مروڑ کر توڑ ڈالتا ہے۔ ٹوٹی ہوئی گردن سے خون کا فوارہ ابل پڑتا ہے۔ اس وقت اس کا عتاب بھی دیکھنے کے قابل ہوتا ہے جب ذرا غصہ ٹھنڈا ہوتا ہے اور حواس درست ہوتے ہیں تو بہتا ہوا خون چاٹتا ہے اگر بھوکا ہو تو کچھ گوشت بھی کھا لیتا ہے اور شکار کو دوسرے وقت کے لئے گھاس پھوس ڈال کر محفوظ کر جاتا ہے۔

ہاں تو، اب شیر کی دھاڑ متواتر سنائی دے رہی تھی۔ ہمارے دل بُری طرح دھڑک رہے تھے۔ شیر کی آواز جوں جوں نزدیک آتی جا رہی تھی۔ ہمیں محسوس ہوتا جیسے ہماری منزل بھی قریب آ رہی ہے۔ شیر کی آواز آنی بند ہوئی مگر اپنا یہ حال کہ پتا بھی کھڑک جائے تو چونک جاتے۔ مگر کچھ نظر نہ آیا۔ تھوڑی دیر گزری کہ بالکل قریب ہی آہٹ سی سنائی دی۔ کٹڑے پر روشنی پھینکی، کچھ نظر نہ آیا، احتیاطاً اِدھر اُدھر روشنی ڈالی، اور جونہی روشنی عین مچان کے نیچے پڑی، ایک ہولناک گرج کی آواز کے ساتھ ہی دو سائے تیزی سے مچان کے نیچے سے نکل کر بھاگ گئے۔ یہ سب کچھ اتنی سرعت سے ہوا کہ ہم صرف ان کی جھلک ہی دیکھ پائے مگر تھے شیر [illegible] بھی یقین ہو گیا کہ یہ وہی آدم خور جوڑا تھا جو [illegible] ادھر چلا آیا اور جانور کی بجائے انسان کی [illegible] گیا۔ یوں بھی [illegible] [illegible] جس [illegible] تیز [illegible] جس [illegible] انسان [illegible]

کی بُو محسوس کر لیتا ہے۔ روشنی ہوتے ہی شیر بھاگ کھڑے ہوئے اور ہمیں بہت مایوسی ہوئی۔ ہاتھ آیا شکار نکل گیا، مگر اتنا اطمینان ضرور ہو گیا کہ اب شاید خوفزدہ ہو کر انسان کا پیچھا نہ کرے اور اگر اُسے کوئی اور شکار نہ ملا تو بچھڑے پر ضرور واپس آئے گا۔

صبح ہوتے ہی ہم مچان سے اتر کر ریسٹ ہاؤس میں آ گئے۔ سارا دن یہی موضوع زیر بحث رہا۔ آج ہم نے فیصلہ کیا کہ ایک کی بجائے دو مچان لگوائے جائیں اور مچان کی اونچائی اٹھارہ فٹ سے کم نہ ہو اور ہر رات بچھڑے کو جگہ بدل کر باندھا جائے۔ سنت رام نے پچاس پچاس قدم کے فاصلے پر دو مچان بندھوا دیئے۔ رات جس مچان پر بیٹھے وہاں سے کتنے ہی جانور نکلے۔ مگر ہم دل پر جبر کر کے رہ گئے اور رات گزر گئی۔۔۔ صبح بے شمار لوگ جمع ہو گئے کہ شاید شیر مارا گیا ہو۔ مگر ابھی اس کی موت نہیں آئی تھی۔

اگلی رات دوسرے مچان پر بیٹھنے کی باری تھی۔ جنگل کا یہ ٹکڑا بہت خوبصورت اور مناسب تھا۔ اونچی اونچی گھنی گھاس تھی۔ جب ہم مچان پر بیٹھے تو شکاری کی چھٹی حس نے بتایا کہ آج ضرور شیر سے ٹکراؤ ہو گا۔ کوئی گیارہ کا عمل ہو گا، ہم اطمینان سے بیٹھے تھے کہ ایک دم بچھڑا ڈکرایا، پھر عجیب سی آواز نکلی اور خاموشی چھا گئی۔ لائٹ ڈالی، دیکھا کہ شیر بچھڑے کی گردن توڑ چکا تھا اور وہ پڑا تڑپ رہا تھا۔ اُس کے قریب ہی دونوں شیر کھڑے تھے۔ ہم نے ایک دوسرے کو اشارہ کیا اور ایک لمحہ ضائع کئے بغیر، ایک ساتھ دو فائر کئے۔ میرا نشانے والا شیر تو اپنی جگہ سے ایک فٹ بھی نہ ہل سکا۔ مگر کرنل نے جس پر فائر کیا تھا وہ فائر کھا کر غائب ہو گیا۔ کرنل پریشان تھا لیکن میں اطمینان سے اُسے سمجھاتا رہا کہ شیر زخم کھا کر نکل گیا ہے، مگر زیادہ دور نہ جا سکے گا۔ بات یوں تھی کہ میری [illegible] ہوا،

ساڑھے تین انچ کا کارتوس گولی والا، غضب کی مار ہے۔ شیر تو شیر اس سے تو ہاتھی بھی ڈھیر ہو جاتا ہے۔ کرنل صاحب کی رائفل تھری ناٹ تھری۔۔۔۔۔ خیر، خدا خدا کر کے دن نکلا۔۔۔۔۔ ہمارے ساتھی سنت رام وغیرہ نمودار ہوئے اور مُردہ بچھڑے کے پاس شیر پڑا دیکھ کر خوشی سے ناچنے لگے۔ انہیں گھائل شیر کا قصہ سنایا۔ سنت رام نے مُردہ شیر کو گاڑی پر لادا اور ہمیں انتظار کرنے کی ہدایت دے کر جنگل کا رخ کیا۔ کوئی ایک گھنٹہ بعد یہ لوگ واپس آئے اور بتایا کہ شیر بُری طرح زخمی ہوا ہے۔ جدھر جدھر سے گزرا ہے خون ہی خون ہے۔ زخم تازہ تھا، وہ نکل تو گیا ہے مگر یقین ہے کہ جس جگہ بیٹھے گا، پھر وہاں سے اٹھ نہ سکے گا۔ اس وقت اسے تلاش کر کے اُس کا سامنا کرنا مصلحت کے خلاف ہے۔ کل تک اس کی موت یقینی ہے، کل ہم لوگ بے خطر ہو کر جائیں گے اور اس کی لاش لے آئیں گے۔ ہم سب واپس ریسٹ ہاؤس چلے آئے مگر کرنل صاحب سخت مضمحل تھے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ کہیں ساری محنت اکارت نہ جائے۔

دوسرے روز صبح ہی سنت رام اپنے ساتھیوں سمیت جنگل کو چل دیا۔ دن گزرتا جا رہا تھا اور کرنل کی مایوسی بڑھتی جا رہی تھی۔ شام ہونے کو تھی کہ ایک آدمی دوڑا دوڑا آیا اور اُس نے بتایا کہ شیر زخمی ہونے والی شیرنی تھی اور مُردہ حالت میں مل گئی ہے۔ آپ گاڑی لے چلیں۔ ہم خوشی خوشی پہنچے اور مُردہ شیرنی کو لاد کر لے آئے۔ وہ عام شیروں سے بڑی اور بہت تندرست تھی۔ جوڑا ہی بہت بڑا اور موٹا تازہ تھا۔ جو دیکھتا دنگ رہ جاتا۔۔۔۔۔ دیہاتیوں کا تو گویا میلہ سا لگ گیا۔ ٹھیکیدار صاحب کو خبر پہنچی، وہ بھی اپنے ساتھیوں اور مزدوروں کو لیئے چلے آئے اور اچھا خاصا جشن منایا گیا۔

۞۞۞

خاکہ

میرا کلاس فیلو

میں نے چھٹی لینے کے لئے اپنے بھائیوں اور رشتہ داروں کی کئی کئی بار شادیاں کرائیں اور خاندان کے تمام بزرگوں کو بار بار مارا۔

☆ شرارتی کے قلم سے

اب اسے خوش قسمتی کہیں یا بدقسمتی کہ آپ کے پیارے خادم حسین مجاہد اور میں نے میٹرک تک اکٹھے ٹیچرز کا سامنا کیا۔ پھر میں تعلیم سے توبہ تائب ہو گیا اور یہ آگے چلے گئے۔ یہ لائق ہونے کی بنا پر اوّل تا آخر تمام کلاسوں میں تعلیمی مانیٹر رہے اور میں شرارتی ہونے کی وجہ سے انتظامی مانیٹر۔ ہمارے رول نمبر بھی ہمیشہ اکٹھے رہے جس کا فائدہ ہمیشہ مجھے امتحان میں ہو جاتا تھا کیونکہ یہ مجبوروں کی مدد کرنے میں کبھی کنجوسی نہیں کرتے تھے۔ یہ ہمیشہ اوّل آتے تھے تو میں بھی دوسرے یا تیسرے نمبر پر آ جاتا تھا اور حاسد انگشت بدنداں رہ جاتے تھے۔ اس سلسلے میں بعض اوقات کچھ عجیب واقعات بھی ہو جاتے تھے۔

دراصل مجھے انگلش سے الرجی تھی اور یہ پرچہ میں آنکھ بند کر کے ان کی نقل کر کے لکھا کرتا تھا (یاد رہے کہ آنکھ بند کر کے محاورہ ہے ورنہ آنکھ بند کر کے نقل کیسے کی جا سکتی ہے)۔ اب ہوا یہ کہ میں نے اوپر سے لے کر نیچے تک ہو بہو نقل کر کے پرچہ دے دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ٹیچر کو ان کے نام کے دو پیپر مل گئے جبکہ میرا ایک بھی نہ ملا۔ مارکنگ کے بعد ٹیچر نے ان سے پوچھا کہ آپ نے دو پیپر ایک جیسے کیوں دیئے، ایک کافی نہ تھا؟ یہ حیران اور میں پریشان جب انہوں نے انکار کیا تو ٹیچر کی سمجھ میں ساری بات آ گئی۔ آخر وہ استاد تھے۔ دونوں پرچوں کی لکھائی میں بھی فرق تھا بلکہ میرا پرچہ ان سے بھی صاف اور خوش خط لکھا ہوا تھا۔ بہر حال ٹیچر نے پوچھا کہ کس کو ابھی تک پرچہ نہیں ملا ناچار مجھے کھڑا ہونا پڑا تو ٹیچر نے کہا کہ میں تمہاری مہارت کی داد دیتا ہوں اتنی صفائی سے تو شاید میں بھی نقل نہ کر سکوں لیکن تمہیں نقل کے ساتھ ساتھ عقل بھی استعمال کرنی چاہئے تھی اور پرچے کے اوپر، خط اور درخواستوں کے نیچے اپنا نام لکھ دیتے تو تمہارے نمبرز زیادہ ہوتے۔

شروع سے ہی پڑھائی سے میری جان جاتی تھی اور سکول میں ذرا دل نہ لگتا تھا اس لئے بمشکل بریک تک سکول میں ٹک پاتا اور پھر کسی نہ کسی بہانے سے فرار ہو کر گھر آ جاتا۔ کبھی بیماری کا بہانہ تو کبھی کام کا حتیٰ کہ میں نے اپنے بھائیوں اور دیگر رشتہ داروں کی کئی کئی بار شادیاں کرائیں، خاندان کے تمام بزرگوں کو باری باری کئی بار مارا، والدہ کو کئی بار بیمار کیا جن کی دوائی لینے کے لئے چھٹی لے لیتا۔ حتیٰ کہ سارے بہانے ختم ہو گئے تو میں نے بستہ نہایت مختصر کر دیا جو صرف ایک رف کاپی پر مشتمل ہوتا تھا اور وہ بھی پتلی سی، کتابیں میں ان کی استعمال کر لیتا کیونکہ ہم اکٹھے ہی بیٹھتے تھے۔ اب بریک ہوتی تو میں اپنا مختصر سا بستہ قمیص کے نیچے نیفے کے اندر ڈال کر ٹہلتا ٹہلتا گھر پہنچ جاتا۔

رستے میں اگر کوئی استاد بازار سے ہو کر آ رہا ہوتا تو میں پیشاب کے بہانے کھیتوں میں گھس جاتا۔ اگر کبھی اتنا موقع نہ ہوتا اور استاد سر پر پہنچ جاتا تو کسی اور استاد کے کام سے جانے کا بہانہ کر دیتا یا اگر کبھی بستہ ہاتھ میں ہوتا تو سکول میں دو ایسے استاد موجود تھے جن کی یادداشت بزرگی کی وجہ سے ختم ہو چکی تھی لہٰذا ان میں سے کسی کا باری باری نام لے دیتا کہ ان سے چھٹی لی ہے اور دوسرے دن ان سے دستخط کرا کے اپنے استادوں کو دکھا دیتا۔ مذکورہ استاد ایک بار احتیاطاً پوچھتے کہ چھٹی لی بھی تھی کہ نہیں، فراڈ تو نہیں لگا رہے۔ تو میں بڑے اعتماد سے بتاتا جب آپ پیپل کے نیچے بیٹھے تھے تو میں نے چھٹی لی تھی۔ اب یہ الگ بات کہ وہ ہمیشہ پیپل کے نیچے ہی بیٹھتے تھے۔

میری ان کامیاب وارداتوں سے یہ بھی للچائے اور مجھ سے درخواست کی کہ آئندہ ان کو بھی شریکِ سفر کر لوں۔ میں نے ہامی بھر لی اور اس کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ اپنا مختصر سا بستہ ان کے بھاری بیگ میں ڈال کر ہم سکول سے نکل آتے۔ یہ سڑک پر اور میں ساتھ ساتھ کھیتوں میں چلتا جاتا اور جونہی کوئی استاد آتا نظر آتا میں پیشاب کرنے بیٹھ جاتا۔ وہ ان سے تفتیش کر کے مطمئن ہو کر چلا جاتا کیونکہ یہ لائق بچے تھے اسی لئے جب مسلسل بریک کے بعد غائب پائے گئے تو انچارج نے تحقیق کی۔ میری غیر حاضری پر تو انچارج خوش ہوتے تھے کہ کم از کم بریک کے بعد تو شرارتی سے جان چھوٹی لیکن ایک لائق بچے کی غیر حاضری کو قبول نہیں کیا گیا۔ حاسدین نے ہماری غیر موجودگی میں نمک مرچ لگا کر ہمارے فرار کی داستان انچارج کو سنائی تو انہوں نے ہمیں رنگے ہاتھوں پکڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

ہمارے کلاس فیلوز کو منع کر دیا گیا کہ ہمیں کچھ نہ بتایا جائے کہ ہمارے فرار کا راز کھل چکا ہے۔ دوسرے دن ٹیچر نے بھی ہمیں پلاننگ کے مطابق کچھ نہ کہا اور جب بریک میں ہم حسب معمول فرار ہوئے تو آدھے راستے کے بعد انچارج صاحب سائیکل پر آتے دکھائی دیئے۔ میں نے حسب سابق پیشاب کا اور انہوں نے بھلکو ٹیچر صاحب سے چھٹی کا بہانہ کیا مگر تلاشی پر ان کے بیگ سے میرا بستہ برآمد ہو گیا جس کے بعد کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہ رہی۔ ہمیں سکول واپس لے جا کر مرغا بنا کر ٹھڈوں اور لاتوں سے پیٹا گیا جس سے حاسدوں کے دل میں کافی ٹھنڈک پڑی اور میں اس دن کو کوسنے لگا کہ جب میں نے ان کو اپنے ساتھ بھگانے کی ہامی بھری تھی۔ ان کی وجہ سے میرا فرار کا سلسلہ بھی ٹوٹ گیا اور مجھے پورا وقت پڑھنے پر مجبور ہونا پڑا۔

میں اکثر بڑی مہارت سے کلاس فیلوز کے پیسے چوری کر لیتا تھا پھر وہ کسی ویران جگہ پر ڈال کر ان کو ساتھ لے جاتا اور ان کے سامنے وہ مجھے زمین پر پڑے ''مل'' جاتے۔ یہ بڑے سادہ مہاج تھے، میری سازش کو سمجھ نہ پاتے اور گھر والے جب پوچھتے کہ اتنے پیسے

کہاں سے آئے تو میں ان کی گواہی ڈلوا دیتا کہ مجھے فلاں جگہ سے ملے ہیں۔ یہ چونکہ شریف بچے تھے اس لئے ان کی گواہی قبول کر لی جاتی اور مجھ سے باز پُرس نہ کی جاتی۔ یوں میں اکثر ان کی مدد سے کالے دھن کو سفید کر لیتا۔ مجھے یہ سازش اس لئے کرنا پڑتی کہ یہ دیانت دار قسم کی چیز تھے اگر ان کو شریکِ جرم کر کے حصہ دار بنانے کی کوشش کرتا تو مجھے پکڑوا دیتے۔

نویں جماعت میں ہمارے انچارج نہایت لائق فائق ٹیچر تھے۔ وہ دور دراز سے آتے تھے اس لئے ہفتہ بھر ہاسٹل میں رہتے اور پڑھائی کے شوقین بچوں کو سکول کے بعد بھی پڑھاتے رہتے، ان کو پڑھانے کا بے حد شوق تھا۔ ٹیچرز کی کمی کے باعث وہ ہمیں پانچ مضامین خود ہی پڑھاتے تھے۔ ہم بھی ان سے بے حد مانوس ہو گئے تھے کہ انہوں نے سرتوڑ کوششوں سے اپنا تبادلہ اپنے گھر کے نزدیک کرالیا۔ کلاس کو جب پتا چلا تو لڑکوں میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ میں ان جیسے پڑھاکو لڑکوں کی بات کر رہا ہوں ورنہ مجھ جیسوں نے تو شکر کا کلمہ پڑھا کہ جان چھوٹی۔ خیر کلاس کا ہنگامی اجلاس ہوا جس میں انہوں نے تجویز دی کہ محکمہ تعلیم کے اعلیٰ آفیسرز سے مل کر تبادلہ رکوایا جائے۔ اس پر عمل درآمد کا فیصلہ ہوا اور بغیر کسی ٹیچر یا گھر والوں کو بتائے پندرہ بیس لائق لڑکے سکول سے نکل کر بس پر ضلعی تعلیمی دفتر روانہ ہو گئے جس کی قیادت یہی کر رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ نکلا اور راستے سے گھر چلا گیا۔

کلاس کے جو چند نالائق لڑکے سکول میں رہ گئے تھے انہوں نے ہیڈ ماسٹر کو ہماری کارروائی سے آگاہ کیا۔ پی ٹی نے ان کے پیچھے بہت موٹر سائیکل دوڑایا مگر بس نکل چکی تھی۔ پوچھتے پچھاتے یہ ضلعی تعلیمی دفتر پہنچ گئے۔ وہاں ایک اچھی ہینڈ رائٹنگ والے لڑکے کو انہوں نے درخواست املا کروائی اور پانچ سات لڑکوں کو ساتھ لے کر

آفیسر کو پیش ہو گئے اس نے درخواست پڑھ کر ہیڈ ماسٹر کے لئے ایک رقعہ دیا جس میں ان کو دفتر حاضری کے لئے کہا گیا تھا۔ یہ سب خوش خوش واپس آ گئے کہ اب تبادلہ رک جائے گا کیونکہ درخواست میں بڑے رقت آمیز لہجے میں کلاس کے یتیم ہو جانے کا ذکر کر کے تبادلہ روکنے کی التجا کی گئی تھی۔ اب مسئلہ تھا وہ رقعہ ہیڈ ماسٹر صاحب کو دینے کا۔ یہ رقعہ تو پڑھاکو لوگ لائے تھے جو عموماً ڈرپوک ہوتے ہیں اس لئے کسی کو ہمت نہیں ہو رہی تھی اس لئے میں نے تو ہر مارنے کے لئے رقعہ لے لیا اور ہیڈ ماسٹر صاحب کو دینے کی ہامی بھر لی۔

اسمبلی ہوئی اور ہیڈ ماسٹر صاحب لے سرگودھا جانے والے لڑکوں کو کھڑا ہونے کا حکم دیا۔ میری شامت جو آئی تو میں نے اسی وقت اٹھ کر رقعہ ان کو دے دیا۔ رقعہ پڑھتے ہی ان کا رنگ اُڑ گیا اور انہوں نے سرگودھا جانے والے لڑکوں کے ساتھ مجھے بھی مرغا بننے کا حکم دے دیا۔ خود وہ اسی وقت سرگودھا روانہ ہو گئے اور مرغوں کا چارج نائب ہیڈ ماسٹر صاحب کو دے گئے۔ انہوں نے کافی دیر ہم سے بانگیں دلوائیں اور اسی حال میں سارے سکول میں پھرایا۔ یہ سزا تھی دراصل بغاوت کی اصل سزا تو یہ بنتی تھی کہ سکول سے ان کو نکال دیا جاتا مگر ان میں زیادہ تر لائق لڑکے تھے اس لئے بالآخر معافی دے دی گئی۔ بڑی منتوں اور سفارشوں کے بعد ہیڈ ماسٹر صاحب کو ضلعی دفتر میں آفیسر نے جھاڑ پلائی کہ یہ آپ کا ڈسپلن ہے کہ لڑکے ضلعی دفتر پہنچ گئے اور آپ کو پتا بھی نہ چلا۔ ہمیں اس جھاڑ کا علم تب ہوا جب اگلے دن ہیڈ ماسٹر صاحب نے ہمیں پھر مرغا بنا دیا۔

یہ سارا قصہ ضلعی دفتر سے ہمارے تبادلے والے انچارج صاحب کو پتا چلا تو آفیسر کے حکم سے وہ ہمیں مطمئن کرنے آئے اور کہا کہ آپ میرے اچھے خیر خواہ ہو میں نے اتنی مشکلوں سے گھر کے نزدیک تبادلہ کرایا اور آپ اسے رکوانے چلے گئے۔ ان کی بات ہمیں بعد میں سمجھ آئی۔

میٹرک کے امتحان ہونے والے تھے، ہمارے ایک کلاس فیلو جنہوں نے کافی حاسد قسم کی طبیعت پائی تھی، اسی لئے مکار اور سازشی بھی تھے، وہ اپنی طرف سے ان سے مقابلہ لگائے رکھتے تھے۔ انہوں نے ان کو تیاری سے باز رکھنے کے لئے یہ طریقہ کیا کہ چھٹی کے بعد شام تک ان کے ساتھ رہتے تاکہ یہ تیاری نہ کر سکیں اور خود رات کو جاگ جاگ کر تیاری کرتے جبکہ یہ رات کو تھوڑا بہت پڑھ کر سو جاتے۔ رزلٹ آیا تو ان کے پورے 60 نمبر ان سے زائد تھے حالاں کہ پیپروں میں بھی وہ ان سے پوچھ پوچھ کر لکھتے رہے اور ان کو ایک لفظ بھی نہیں بتایا اس لئے انہیں اتنا صدمہ ہوا کہ بیان سے باہر ہے۔ کہتے تھے صحت بھی خراب کی اور پوزیشن بھی نہ ملی۔ ضرور انہوں نے کوئی ملی بھگت کر کے نمبر بدلوا لیئے ہیں حالاں کہ کوئی ملی بھگت نہ تھی بس توکل اور نیت کا پھل تھا جو ان کو ملا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ جو خود بے ایمان ہوتا ہے وہ دوسروں کو بھی بے ایمان سمجھتا ہے، بس یہی اصل صورت حال تھی۔

میٹرک تک یہ کبھی سٹیج پر نہیں گئے تھے لیکن ان کے رجحان کو دیکھ کر بزم ادب کے انچارج نے انہیں آئندہ پروگرام میں تقریر کا آرڈر دے دیا۔ یہ تقریر تو تیار نہ کر سکے کہ ان کے مزاج کے خلاف تھی البتہ انہوں نے دو چار لطیفے سنا دیئے جن کے اشارے انہوں نے ہاتھ پر لکھے ہوئے تھے لیکن اس دوران بھی یہ اس قدر کانپ رہے تھے کہ لگتا تھا ابھی گر پڑیں گے۔ اس کے باوجود انچارج بزم ادب ناراض ہو گئے کہ تقریر کی جگہ لطیفے کیوں سنائے حالاں کہ ان کا ساری زندگی یہی دستور رہا ہے۔

❁❁❁

ایک حقیقت ایک افسانہ

کورونا کی آگ

وہ منزل کی طرف یوں چلی جیسے کسی پھانسی گھاٹ کی طرف جا رہی تھی، کوئی لاش لینے یا لاش کی صورت ڈھل جانے۔

ڈاکٹر مبشر حسن ملک 0345-6875404 راولپنڈی

"حقائق جھٹلاتے رہنا کبھی مفاد میں نہیں ہوتا۔ اگر تم ڈھب سے سوچنا سیکھ جاتے تو زندگی میں یوں ناکام نہ ہوتے"۔ نواب نے شہزادے سے کہا جبکہ لفظ اس کے منہ پر دے مارے۔ کبھی غصے میں آتا تو وہ بیٹے کی سرزنش کر دیتا۔ ورنہ حقیقت یہی تھی کہ وہ اپنے لخت جگر سے ڈرا کرتا تھا۔ جو نہ صرف بدتمیز تھا بلکہ اس پر یوں سوار ہو جاتا جیسے وہ اس کا بیٹا نہیں، باس تھا، یہ پھر دادا میاں کی طرح روایتی باپ۔ غصہ ہر وقت اس کی ناک پر دھرا رہتا، چہرے پر تیوری رہتی۔

ماں کی زندگی میں بے شمار مشن تھے۔ اولین مطمع نظر یہ تھا کہ وہ باپ اور بیٹے کی بیچ تعلق خوشگوار رکھے۔ اگر کبھی دونوں کے درمیان تلخیاں گہری ہو جاتیں تو اس کی جان پہ بن جاتی۔ اسے اپنی کم مائیگی پر ترس آنے لگتا۔ وہ عمر کے اس دور میں تھی جہاں چولہے کی آگ کبھی بھڑک اٹھتی تو وہ بوکھلا جاتی۔

"یہ محض ڈرامہ ہے، بابا! مان لو۔ کیا تم نے اپنی آنکھوں سے ایسا کوئی دیکھا جسے کورونا نے بیمار کیا ہو؟ میں اسے حکومتی دہشت گردی سمجھتا ہوں۔ بڑی طاقتوں کو لاشیں درکار ہیں۔ کوئی ہسپتالوں کے چکر میں پڑ جائے تو اسے زہریلے ٹیکے لگا کر مار دیا جاتا ہے، پھر لاش تابوتوں میں سجا کر سمندر پار بھیج دی جاتی ہیں، ہر لاش بکتی ہے، حکومت کو پیسے مل جاتے ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ پڑھے لکھے بھی خرافات کو صداقت کا درجہ دینے پر تلے بیٹھے ہیں"۔ شہزادہ مسلسل بولتا رہا۔ نواب کے چہرے پر رنگوں کی چھاپ عکس بدلتی رہی، بالآخر یاس نے اس کے نقوش پر تسلط جما لیا جو گہرا ہو گیا۔

"بیٹا! پیسے ان غیر سرکاری ہسپتالوں کو ملتے ہیں جو کورونا وائرس کی بیماری کا علاج کرتے ہیں، حکومت ایسے مریضوں کے اخراجات برداشت کرتی ہے، مگر یہ انتظام صرف یورپ اور امریکہ میں ہے، ہمارے ہاں

طبیعت مختلف ہے، تم نے تو تمام کہانی ہی بدل ڈالی؟"

"بابا! تم نے چار جماعتیں کیا پڑھ لیں، اخباروں کو ہی معتبر سمجھ بیٹھے"۔

"کاش! تم بھی چار جماعتیں پڑھ لیتے"۔ نواب نے کہا۔ "شہزادے نے باپ پر گھوری ڈالی اور پاؤں پٹختا ہوا گھر سے نکل گیا۔

"کیا ہی اچھا ہوتا جو ان پُرخطر دنوں وہ آوارہ گردی ترک کر دیتا"۔ نواب نے آہ بھرتے ہوئے خواہش کی۔ "وہ کرے بھی کیا بے چارہ، بہت پریشان ہے آج کل، جوان جہان ہے، یوں گھر میں پڑا رہے تو ہر کوئی اکتا جاتا ہے"۔ ماں نے معاملہ سنبھالنے کی کوشش کی۔ "جوتے بنانے والی فیکٹری میں جانا شروع ہوا تو خوش تھا، اسے اچھے پیسے مل جاتے تھے۔ ہنر بھی سیکھ رہا تھا مگر خدا کی مار ہو ان لوگوں پر جنہوں نے چمگادڑوں کا شوربہ پیا، وہ بھی سانپ کھا کر، نہ گندگی دیکھی، نہ پلیدی، خود تو مرنا تھا ہی، بیماری دنیا بھر میں بانٹ دی"۔ بھاگ بھری اندھیرے میں تیر چلاتی رہی۔ حتیٰ کہ اس کی بڑبڑاہٹ جھنجھناہٹ میں تبدیل ہو گئی۔ اب وہ خاوند کے پاؤں دبا رہی تھی، ساتھ مسلسل بل رہی تھی۔

"بچہ ہے، دل کا برا نہیں، موقع پڑے تو تمہارے ساتھ کھڑا نظر آتا ہے۔ دن دیکھتا ہے نہ رات، اس کی خیر مانگا کرو۔ باپ کا دل مندا ہو جائے تو اولاد پر بھاری پڑتا ہے"۔ ماں نے کہا، پھر بوسیدہ دوپٹے کے ساتھ اپنے اشک پونچھنے لگی۔ اس کا چہرہ اب خاوند کی طرف نہیں تھا، پھر بھی چند قطرے نواب کے جسم پر گر پڑے۔

جان چکی تھی کہ اس کی شب کونوں پر لوٹتے کٹے گی۔ اس کا لختِ جگر غصے کے عالم میں گھر سے گیا تھا۔ اس نے کھایا بھی کچھ نہیں تھا۔ ضدی تھا، سنبھلے گا تو دیر گئے واپس لوٹے گا۔ ہو سکتا ہے کہ آتے آتے صبح کر دے، اسے ہر حال میں جاگتے رہنا تھا، سو گئی تو شہزادے کو کھانا کون دے گا؟

بھاگ بھری نے بتیاں گل کر دیں اور بستر پر پہلو بدلتی رہی۔ پرانی یادوں نے اسے گھیر لیا۔ شہزادے کو اس نے مانگ کر خدا سے لیا تھا۔ اس کے لئے بہت ترسی تھی، ملا تو تمام امیدیں اسی سے وابستہ کر لیں۔ اس کی پرورش پر بہت توجہ دی، مگر شہزادے نے ہوش سنبھالا تو راہیں بھٹک گیا۔ اس نے زندگی کا ہر سبق تجربہ کر کے سیکھا، پے در پے کئی مسائل میں مبتلا ہوا۔ بارہا گرا پھر سنبھلتا رہا۔ اس بیچ بڑا نقصان یہ کیا کہ پڑھائی سے بدک گیا، بمشکل میٹرک تک پڑھ سکا۔

زندگی مراحل کا مجموعہ ہے، گیا وقت واپس نہیں آتا۔ اس کا سفر جاری رہتا ہے، آدمی گئے مراحل میں لوٹ کر انہیں ثمر بار نہیں کر سکتا، پچھتاووں پر اشک بہاتا رہتا ہے۔ ماں کا ذہن انہی خیالوں سے اٹا رہا۔ اس کے کلیجے پر سانپ لوٹتے رہے۔ نواب بیوی کی حالت جانتا تھا مگر کچھ نہ کر سکا۔ اس کا اپنا چپ رہنا بھی کسی امتحان سے کم نہیں تھا۔

رات بھیگ چکی تھی جب شہزادہ گھر لوٹا۔ ماں کو وہ ماندہ سا لگا۔ ٹوائلٹ سے نکلا تو اس کے بدن پر لرزش تھی۔

"پیٹ میں درد ہے ماں!" اس نے کہا۔ ماں اسے زبردستی کھانے کی میز پر لے آئی۔ اس نے بمشکل چند لقمے زہر مار کئے۔

"ساری چیزیں تمہاری پسند کی ہیں، پھر تم نے ہاتھ کیوں کھینچ لیا؟" ماں نے استفسار کیا۔

"شاید مجھے تپ چڑھ گیا ہے، ہر کھانا بدذائقہ سا محسوس ہوتا ہے۔ نہ تو نمکین کا احساس ہوتا ہے اور نہ میٹھے کا"۔ شہزادے نے بتایا، کچھ پریشان بھی نظر آیا۔

"دیکھو بیٹا! باہر حالات اچھے نہیں، ان گنت لوگ بیمار پڑ رہے ہیں۔ محلے میں کئی جنازے اٹھ چکے ہیں۔ بیماری گھر میں داخل ہو گئی تو بڑا نقصان ہو گا۔ تمہارا باپ حوصلہ مند سہی مگر ضعیف ہو چکا ہے، کسی روگ کا بوجھ نہیں سہار سکے گا۔ یہی احوال میرا ہے۔ تم خود عاقل و بالغ ہو، جانتے ہو کہ یہ گھر محض پنشن پر چل رہا ہے"۔ ماں کچھ اور بھی کہتی مگر شہزادے کی بے سکونی دیکھ کر چپ ہو گئی۔

"ماں! دعا کرو، بازار اور بند فیکٹریاں کھل جائیں۔ میں ڈبل شفٹ کر لیا کروں گا"۔ شہزادے نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "تمہیں پیسے کی آزمائش نہیں آئے گی"۔

ماں گہری سوچ میں الجھ گئی۔

فجر ابھی دور تھی، جب شہزادے کو کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ تپ حدیں چھونے لگا اور وہ تقریباً بے حال ہو گیا۔ اس کے بدن کا جوڑ جوڑ دکھنے لگا، پھر بے چینی اس کی نس نس سے ابھرنے لگی۔ کھانسی تھی کہ تھمنے کا نام نہ لیتی تھی۔ ماں نے اسے بخار کی عمومی دوائیں دیں، اس کے ماتھے پر ٹھنڈی پٹیاں بھی رکھیں مگر شہزادے کی حالت غیر ہوتی گئی، حتیٰ کہ ماں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

نواب نے لختِ جگر کی کیفیت دیکھی تو اسے ہسپتال پہنچا دیا۔ دن چڑھا تو معلوم ہوا کہ شہزادے کو کووڈ ہو چکا تھا۔

"آپ اسے مل نہیں سکتے۔ ہاں، اسے فاصلے سے دیکھ سکتے ہیں"۔ ڈاکٹر نے مریض کے والدین سے کہا۔ "بہتر ہو گا کہ گھر چلے جائیں اور اس کا انتظار کریں"۔ اس کی اگلی ہدایت یہ تھی۔ اس کے بعد کوئی بھی تقاضا بے معنی تھا۔

شہزادہ وہیل چیئر پر تھا۔ نڈھال اور تقریباً بے سدھ والدین اسے جاتا دیکھتے رہے، حتیٰ کہ وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

والدین گھر پہنچے تو گم صم تھے، گھر کی دہلیز ان کے لئے دیوار ہو گئی۔ کواڑ کھلا تھا مگر پیروں میں سکت نہیں تھی کہ اندر قدم رکھے۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے پھر کچھ باتیں نگاہوں نے طے کیں۔ نواب نے اشک سنبھال لئے، جبکہ صنفِ نازک یہ ہمت نہ کر

عمر کا دو تہائی حصہ یوں ہی گزار دینے کے بعد اس شخص کو احساس ہوا کہ وہ بڑھاپے کی حد میں داخل ہو چکا ہے، اس نے کام کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھاگنا شروع کر دیا لیکن کوئی علم یا ہنر نہ رکھنے کے باعث ہر جگہ مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ کام کی تلاش میں دوڑتے بھاگتے جب وہ تھک گیا تو اس نے ارادہ کر لیا کہ اب وہ ملازمت کی تلاش میں جس جگہ بھی جائے گا، مالکِ ادارہ کو اپنی ناکامیوں کی طویل داستان سنا کے ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔

انفاق کی بات کہ اس بار وہ جس کمپنی میں ملازمت کی امید لے کر گیا، اس کا مالک اس شخص کی دو تہائی بیکار زندگی سے واقف تھا۔ جب دونوں کا آمنا سامنا ہوا تو امیدوار کو ڈھارس بندھی کہ شاید اس بار وہ ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا لیکن خلافِ توقع کمپنی کے مالک نے چند سوالوں کے بعد نفی میں گردن ہلا کے اسے مایوس کر دیا۔

امیدوار نے غمزدہ آواز میں کہا۔ "یہ میرا پچاسواں انٹرویو تھا اور اس میں بھی میں ناکام رہا ہوں"۔

کمپنی کے مالک نے جواب دیا۔ "مجھے یقین ہے کیونکہ میں تمہارے پیچھے زندگی کے دو تہائی حصے اپنی بربادی پر نوحہ کناں دیکھ رہا ہوں۔ پہلے تم نے وقت کو ضائع کیا تھا اور اب وقت تمہیں ضائع کر رہا ہے"۔

سکی۔ دیر بعد دونوں لرزیدہ قدموں کے ساتھ صحن تک آئے اور وہیں ڈھیر ہو گئے۔ اس روز کے بعد نواب اور اس کی بیوی انتظار کی سولی پر لٹک گئے۔ ایک دوسرے کو تسلی دیا کرتے۔ وقت سسک سسک کر گزرتا رہا۔

ہفتہ بھر گزرا ہو گا کہ شب تار کے دوران ایک دوسرا گہرا طوفان اتر آیا۔ نواب پر کھانسی کا دورہ پڑا تو اس کی سانس بھی رکنے لگی۔ وہ دو روز سے بخار میں مبتلا تھا۔ اس بیچ اس کا جسم پسینے سے شرابور ہو جاتا۔ اب اس کے سینے میں شدید درد اٹھ رہا تھا۔ وہ بری طرح کراہنے لگا۔ لاچار عورت پر آزمائش اسی طوفان کی طرح اتری جو دھرتی پر برپا تھا۔ اس نے باہر نکل کر گلی میں گھروں کے تمام دروازے پیٹ ڈالے۔ بالآخر پڑوسیوں نے نواب کو ہسپتال پہنچایا۔

صبح دم نواب کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ آکسیجن بیڈ پر بے سدھ پڑا تھا۔ بھاگ بھری میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ وہ خاوند کی طرف دیکھ سکتی۔ اسے گھر لوٹ جانا تھا۔ جی کڑا کر کے اس نے دل ہی دل میں خاوند کو الوداع کہا اور وہاں سے نکل گئی۔

بھاگ بھری گھر پہنچی تو دہلیز پر ہی ڈھیر ہو گئی۔ دیر تک وہیں پڑی رہی، کسی ساکت پتھر کی طرح۔ سوچیں اس کے ذہن میں منجمد ہو گئی تھیں۔ شب اس نے کواڑ کے ساتھ ٹیک لگائے گزار دی۔ آخر مجبوریوں نے اسے وہاں سے اٹھا دیا۔ سانسوں کے سفر نے اسے گزرتے وقت کا احساس دلایا۔ ان دنوں طوفان بہت آئے اور تقدیر نے بھی قیامت مچاتے رہے۔

نہ تو دھرتی پر سکون تھا اور نہ ہی بھاگ بھری کے دل میں، بس زندگی اسے نبھاتی رہی۔ کبھی لمحے منجمد ہو جانے کی دعا کرتی تو کبھی یہ انجماد ٹوٹنے کی۔ اسے کسی بڑی قیامت کا کھٹکا تھا۔ ہفتہ کسی طرح اس نے گزار دیا، پھر ایک روز اسے ہسپتال سے بلاوا آ گیا۔ یہ مرحلہ بہت کٹھن تھا، بلاخیز خدشوں کے ساتھ آیا تھا۔ وہ منزل کی طرف یوں چلی جیسے کسی پھانسی گھاٹ کی طرف جا رہی تھی، کوئی لاش لینے یا لاش کی صورت ڈھل جانے۔

وہ دیر تک ایک کمرے میں بیٹھی رہی ہسپتال کے اس گوشے میں بڑا سکون تھا، لحد کی طرح گہرا۔ کئی لاشیں ایک کونے میں پڑی تھیں۔ بند آنکھوں سے احباب کی منتظر۔ بالآخر بھاگ بھری کو حفاظتی کٹ پہنا دی گئی۔ کچھ ہی لمحوں میں منظر واضح ہو گیا۔ ڈاکٹر کے ہمراہ اس کا لختِ جگر کھڑا تھا، وہ بُری طرح رو رہا تھا۔

"بابا! مجھے معاف کر دینا، بابا! مجھے معاف کر دینا"۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا۔ پھر جلد ہی نڈھال ہو گیا۔

"ہم آپ کے خاوند کو نہ بچا سکے، وہ ملٹی آرگن فیلر کی بھینٹ چڑھ گئے۔ آخر میں ان کا دل بند ہو گیا۔ کورونا وائرس انتہائی خطرناک ہے۔ بگڑ جائے تو کچھ بھی کر سکتا ہے۔ آپ کے لئے دلاسے کا پہلو بھی ہے۔ بیٹے کی صحت آپ کو مبارک ہو"۔ ڈاکٹر نے کہا۔

بھاگ بھری نہ تو جشن منا سکی اور نہ ہی سوگ، کبھی بیٹے کی طرف دیکھتی تو کبھی مرحوم خاوند کی طرف۔ پھر سوگ اس پر حاوی ہوتا گیا اور آنکھوں میں پانی چھلک آیا، آنسو اس کے گالوں پر پھسلنے لگے۔ وہ الم کی تصویر نظر آنے لگی۔ شہزادہ ماں کی طرف مسلسل دیکھتا رہا۔ وبا کے باعث وہ اسے گلے بھی نہیں لگا سکتا تھا۔ پھر اس کی آنکھیں جھک گئیں۔

"مرحوم کو دفن حفاظتی تدابیر کے تحت کرنا ہو گا"۔ سٹاف شہزادے کو سمجھا رہا تھا۔ "قبرستان کے بارے میں ہم بتا دیں گے، آپ کی طرف سے دس افراد جنازے پر آئیں گے۔ میت کے غسل اور کفن کا انتظام ہم کریں گے۔ خدا آپ کو حوصلہ عطا فرمائے!"

❁❁❁

آپ بیتی

میں اکثر سوچتی ہوں کہ اللہ کو میرا رونا پسند آ گیا ہے۔ میری یہ خوشگوار زندگی شاید میرے بہے ہوئے آنسوؤں اور اشکوں کا خراج ہے۔

اشکوں کا خراج

ارم نثار ☆ کراچی

میرے بچپن ہی میں میری ماں بیوہ ہو گئی۔ میری عمر اس وقت آٹھ سال تھی۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں۔ ابو کی وفات کے بعد میرے ماموں مجھے اور میری ماں کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئے۔ جب میری ماں بیوہ ہوئی تو اُس وقت وہ جوان تھی۔ میرے ماموں نے بہت کوشش کی کہ میری ماں دوسری شادی کر لے مگر میری ماں نے سختی سے منع کر دیا کہ پتہ نہیں سوتیلا باپ کیسا ہو، وہ مجھے قبول کرتا ہے یا نہیں، ہمارے ساتھ کیسا سلوک کرے۔ یہی سوچ کر میری ماں نے دوسری شادی سے انکار کر دیا۔

میرے ماموں کے گھر میں غربت تھی، ان کے اپنے بیوی بچے تھے، ان کا گزارہ بڑی مشکل سے ہوتا تھا۔ میری ماں نے سوچا کہ بھائی پر بوجھ بننے کی بجائے وہ کوئی کام کر لے گی اور میرا اور اپنا خرچہ خود اٹھائے گی۔ میری ماں اَن پڑھ تھی چنانچہ انہوں نے تین چار گھروں میں ماسی کا کام شروع کر دیا۔ وہ صبح صبح مجھے ناشتہ کروا کر سکول چھوڑ دیتیں اور خود کام کرنے چلی جاتیں۔ مہینے بعد جو تنخواہ میری ماں کو ملتی تھی اس سے ہمارا گزارہ اچھی طرح ہو جاتا بلکہ چند سو روپے بچا بھی لیتی تھیں۔ میں روزانہ باقاعدگی سے سرکاری سکول جاتی اور دل لگا کر پڑھتی۔ مجھے بچپن سے ہی اپنی ماں کا پورا احساس تھا۔ انہوں نے میری خاطر اپنی تمام خواہشات کا گلا گھونٹ دیا تھا اور میری خاطر اپنے آپ پر ہر طرح کا آرام اور سکون حرام کر لیا تھا۔ وہ میری بہترین پرورش اور تربیت کر رہی تھیں۔ پانچ وقت کی نماز خود بھی پڑھتیں اور مجھے بھی پڑھاتی تھیں۔ شام کو محلے کے ایک گھر میں میں قرآن پاک پڑھنے جاتی تھی۔ وہ ایک بزرگ خاتون تھیں جو محلے کی بچیوں کو مفت کلام پاک پڑھاتی تھیں اور ساتھ اسلامی تعلیم بھی دیتیں۔ ہر روز ایک دو احادیث مع اُردو ترجمہ بچوں کو سمجھاتیں۔ انسانی رشتوں کی قدر اور اہمیت بتاتیں۔ حقوق العباد کا درس دیتیں۔ الغرض دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ بچوں کی اخلاقی تعلیم کا پورا خیال رکھتیں۔

میرا نام فاطمہ ہے۔ ایک دن ایک لڑکی نے میرا نام بگاڑ کر مجھے پھاتاں کہہ کر بلایا تو ان بزرگ خاتون جن کا نام رضیہ تھا، کو غصہ آ گیا اور انہوں نے اس لڑکی کو ایک تھپڑ مارا اور سختی سے منع کیا کہ کسی بچی کا نام نہیں بگاڑنا، خاص طور پر میرا نام کیونکہ فاطمہ ہمارے پیارے

نبی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیاری بیٹی کا اسم مبارک ہے جو جنت میں خواتین کی سردار ہیں۔ خبردار! آئندہ کسی نے نام بگاڑا تو وہ چمڑی ادھیڑ دیں گی۔ اس روز زندگی میں پہلی مرتبہ انہیں اتنا غصہ آیا۔ ان کے غصے کو دیکھتے ہوئے پھر کسی کی جرأت نہیں ہوئی کہ کسی بچی کا نام بگاڑے۔

زندگی اسی ڈگر پر چلتی رہی اور میں جوانی کی حدود میں داخل ہوگئی۔ میرا میٹرک کا امتحان سر پر آ گیا، میں نے دن رات خوب محنت کی اور پوری تیاری سے امتحان دے دیا۔ امتحان دینے کے بعد میں فارغ تھی تو میں رضیہ آنٹی کی طرف چلی جاتی۔ گھر کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاتی پھر وہ مجھے اسلامی واقعات سناتیں جنہیں سن کر مجھے بہت تسکین ملتی۔ میری ماں کو لوگوں کے گھروں میں کام کرتے ہوئے آٹھ سال ہو گئے تھے گو وہ کام والی ماسی تھیں مگر انہوں نے مجھے شہزادیوں کی طرح رکھا تھا۔ وہ میری ماں بھی تھیں اور باپ بھی۔ انہوں نے مجھے ماں باپ دونوں کا پیار دیا۔ میرے ناز ونعم اٹھائے، میری ہر خواہش پوری، میری ہر ضرورت کا خیال رکھا۔ میری عمر اس وقت سولہ سال تھی اور یہ وہ عمر تھی جب آنکھوں میں سنہرے سپنے سجتے ہیں، دل میں چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش پیدا ہوتی ہے مگر میں نے اپنے دل کو کنٹرول میں رکھا۔

چونکہ امتحان کا رزلٹ پورے ساڑھے تین ماہ بعد آنا تھا، میں فارغ تھی تو میں نے اپنے علاقے میں ہی ایک سلائی کڑھائی اور کپڑوں کی کٹنگ والے سینٹر میں داخلہ لے لیا۔ صبح ناشتہ کرنے کے بعد میں وہاں چلی جاتی اور دوپہر دو بجے واپس گھر آتی۔ وہ دو سے اڑھائی ماہ کا کورس تھا جو میں نے مکمل کرلیا۔ اب میں بھی سلائی کڑھائی کی ایکسپرٹ ہوگئی۔ ایک ماہ بعد میرا میٹرک کا رزلٹ آ گیا۔ میں نے فرسٹ ڈویژن میں امتحان پاس کر لیا۔ اُس روز میں اور میری ماں بہت خوش تھیں۔ پڑھائی میں میرے شوق کو دیکھتے ہوئے امی نے مجھے آگے پڑھنے کی اجازت دے دی۔ میں نے محنت اور لگن سے اپنی پڑھائی جاری رکھی اور بی اے کرلیا۔ میں ایم اے کرنا چاہتی تھی مگر میری امی ہمت ہار بیٹھیں، انہیں بارہ سال ہو گئے تھے لوگوں کے گھروں میں کام کرتے ہوئے، اب وہ بیمار رہنے لگی تھیں، ان کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ اُدھر ماموں کے حالات بھی کافی بہتر ہو گئے تھے، انہوں نے امی کا کام چھڑوا دیا اور امی گھر بیٹھ گئیں۔

میری عمر بیس سال ہوگئی تھی، میری امی کو میری شادی کی بہت فکر تھی، وہ چاہتی تھیں کہ جلد از جلد میری شادی ہو جائے۔ انہوں نے تین چار لوگوں کو میرے رشتے کا کہہ رکھا تھا۔ میں بہت خوبصورت تھی۔ گورا چٹا رنگ، دلکش نین نقش، لمبے سیاہ گھنے بال اور لمبا قد۔ میں پردہ کرتی تھی کیونکہ رضیہ آنٹی نے سختی سے سب لڑکیوں کو پردہ کرنے کا کہا ہوا تھا۔ آنٹی رضیہ کہتی تھیں کہ شرم وحیا اور پردہ ہی عورت کی زینت اور حسن ہیں ہم سب لڑکیاں ان کی باتوں پر عمل کرتی تھیں۔ اسی دوران میرا ایک رشتہ آ گیا۔ لڑکا کراچی کی کسی فیکٹری میں سپروائزر تھا۔ اس کی صرف ماں زندہ تھی، باپ وفات پا چکا تھا۔ لڑکے کا کوئی اور بھائی بہن نہیں تھا۔ اس کی عمر پچیس سال تھی۔ میری ماں اور ماموں نے اس رشتہ کی چھان پھٹک کی اور اللہ کا نام لے کر میرے رشتے کی ہاں کردی گئی اور چھ ماہ بعد شادی طے پا گئی۔ میرے شوہر کا نام ناصر تھا وہ تھوڑے تیز طرار اور چالاک تھے۔ شادی کے بعد وہ پندرہ دن گھر رہے اور پھر کراچی چلے گئے۔ ان کا معمول تھا وہ ایک مہینے کے بعد تین یا چار دن کے لئے آتے اور پھر واپس چلے جاتے۔ میں نے ان سے کہا کہ مجھے اور امی کو بھی اپنے

ساتھ کراچی لے جائیں تو وہ کہنے لگے یہ اپنا مکان ہے، وہاں کراچی میں دوستوں کے ساتھ مل کر رہتا ہوں۔ اگر آپ لوگوں کو وہاں لے گیا تو الگ مکان لینا پڑے گا جس کا کرایہ دینا پڑے گا۔ جس سے میرے خرچ بہت بڑھ جائیں گے۔ میں نے کہا ہم یہ والا مکان کرایہ پر دے دیتے ہیں اور اس کرائے سے وہاں مکان لے لیں گے تو ناصر کہنے لگے۔ یہ چھوٹا شہر ہے یہاں کرایہ صرف پانچ ہزار روپے ملے گا جبکہ کراچی بڑا شہر ہے وہاں مہنگائی بہت ہے کم سے کم بیس ہزار روپے پر مکان ہمیں کرایہ پر ملے گا تو اس لئے آپ اِدھر ہی رہو۔

میں سارا دن گھر میں فارغ رہتی تھی، میں نے پرائیویٹ ایم اے کی تیاری شروع کر دی۔ شادی کے سال بعد اللہ نے مجھے بیٹا دیا، بہت خوبصورت اور پیارا بیٹا تھا۔ اس کا نام ہم نے حاشر رکھا۔ میں اب گھر کے کام بھی کرتی، حاشر کو بھی سنبھالتی اور ساتھ ساتھ ایم اے کی پڑھائی بھی کرتی۔ خدا خدا کر کے بڑی مشکل سے میں نے ایم اے کا امتحان دیا۔ اب میری توجہ گھر داری اور بیٹے کی طرف ہوگئی۔ تھوڑا ٹائم ملتا تو میں سلائی کڑھائی کر لیتی۔ میری شادی کو ڈیڑھ سال کا عرصہ ہوا تھا کہ میری ماں کا انتقال ہو گیا۔ وہ دنیا کے دکھوں سے نجات پا کر منوں مٹی کے نیچے جا سوئی۔ میں کچھ دن ماموں کے گھر رہی اور پھر واپس اپنے گھر آ گئی۔ ناصر کی وہی روٹین تھی مہینے بعد چار دن کے لئے آتے تھے اور واپس کراچی چلے جاتے۔ میری شادی کو چار سال ہو گئے تھے، اللہ نے مجھے تین بیٹے عطا کئے۔ بڑے بیٹے کا نام حاشر، دوسرے کا یاسر اور تیسرے کا نام عامر رکھا۔ میری ساس اچھی عورت تھی، وہ سارا دن میرے تینوں بچوں کو کھلاتی رہتیں، میرے تینوں بچے ان سے بہت مانوس تھے۔ میرا ایم اے کا رزلٹ آ گیا تھا میں نے بہت اچھے نمبر لئے تھے۔ میں نے محکمہ ایجوکیشن میں مختلف آسامیوں کے لئے اپلائی کر دیا۔ اب اتنی تعلیم حاصل کی تھی تو اس کا کوئی نہ کوئی فائدہ تو اٹھانا چاہئے ورنہ ساری تعلیم بیکار جاتی۔

ادھر ناصر کے طور طریقے بدلنے لگے تھے۔ اب اس نے دو مہینے بعد آنا شروع کر دیا اور گھر کے خرچ میں بھی کمی کر دی۔ ہمارا ہاتھ بہت تنگ ہو گیا تو میں نے قسطوں پر ایک سلائی مشین لے لی اور کپڑے سینے کا کام شروع کر دیا۔ چونکہ میں نت نئے فیشن اور ڈیزائن کے کپڑے بہت اچھی سلائی کرتی تھی تو میرے پاس بہت کام آنے لگا۔ میں رات کے بارہ بجے تک کپڑوں کی سلائی کرتی رہتی جس کی وجہ سے ہماری آمدنی میں خاطرخواہ اضافہ ہوتا گیا۔ اُدھر مختلف آسامیوں پر اپلائی کی ہوئی سیٹوں کی سلیکشن کے لئے مختلف ٹیسٹ بھی دیتی رہی مگر انٹرویو میں ناکام ہو جاتی کیونکہ میرے پاس تگڑی سفارش نہیں تھی۔ میں اپنے بچے بھی پال رہی تھی، اپنی بوڑھی ساس کی خدمت بھی کر رہی تھی اور گھر بھی چلا رہی تھی۔ ناصر نے اب گھر آنا بہت کم کر دیا۔ وہ تین مہینے کے بعد آتے تھے پھر چار مہینے بعد آنا شروع کر دیا۔ میں نے اب ناصر کے متعلق سوچنا چھوڑ دیا اور اپنے آپ کو کام میں مصروف کر لیا۔

اسی معمول میں آٹھ سال گزر گئے۔ اب ناصر چھ ماہ بعد آتے تھے۔ ایک دن گھر میں کوئی پیسہ نہیں تھا، میری ساس کی طبیعت کچھ خراب تھی، انہیں ڈاکٹر کے پاس لے جانا تھا۔ صبح کا ٹائم تھا تو میں نے ناصر کے موبائل پر کال کی تو پانچویں گھنٹی پر کسی خاتون نے کال پک کی میں نے پوچھا کہ آپ کون بول رہی ہیں تو اس عورت نے جواب دیا کہ مسز ناصر بول رہی ہوں، اتنے میں ناصر آ گئے اور انہوں نے فون پکڑ لیا۔ میں نے

صرف اپنی ساس کی بیماری کا بتایا اور کہا کہ پیسے نہیں ہیں ہمارے پاس تو آپ جلدی پیسے بھیج دیں۔ دو گھنٹے بعد میرے شناختی کارڈ پر ایزی پیسہ کے ذریعے پانچ ہزار روپے انہوں نے بھیج دیئے جو میں نے نکلوا کر ساس کو چیک کروایا اور ان کی دوائی لی۔

ایک ہفتے بعد ناصر گھر آ گئے۔ میں نے اپنی ساس کے سامنے ان سے پوچھا کہ ان کی دوسری بیوی بھی ہے؟ تو انہوں نے اقرار کیا کہ ہاں ہے۔ وہ ان کی پہلی بیوی ہے اور میں دوسری بیوی ہوں اور وہ کراچی میں گھر داماد بن کر رہ رہے ہیں۔

"جب پہلے سے آپ شادی شدہ تھے تو مجھ سے دوسری شادی کیوں کی؟" میں نے پوچھا۔

"اپنی ماں کی خدمت کے لئے"۔ وہ بڑی ڈھٹائی سے بولے۔ "کیونکہ ان کو میں ساتھ لے جا نہیں سکتا تھا اور یہاں اکیلا چھوڑ نہیں سکتا تھا تو اس لئے تم سے شادی کی"۔

مجھے یہ سب سن کر بہت دکھ ہوا۔

"اپنی ماں کی خاطر میری زندگی برباد کی آپ نے"۔ میں نے کہا۔ "اگر اپنی ماں سے اتنی محبت تھی تو ساتھ لے جاتے ان کو اور الگ گھر میں رکھتے۔ یہ کیا کہ دو دو شادیاں رچا کر بیٹھ گئے اور عیاشی کرتے رہے"۔

میری ساس بھی یہ سن کر بہت ناراض ہوئیں۔ وہ بھی کہنے لگیں ناصر تم نے بہت زیادتی کی ہے۔ تم نے مجھ سے بھی چھپایا اس معصوم بچی کی زندگی تباہ کر دی بہت ظلم کیا تم نے۔ میں تمہیں بھی معاف نہیں کروں گی اور اپنا دودھ بھی نہیں بخشوں گی۔ میری ساس نے خوب سنائیں اور ناصر سے لڑائی کی۔ گھر کا ماحول خراب ہو گیا تھا۔ اس رات ہم تینوں ہی نہیں سوئے۔ میں ساری رات روتی رہی، میری ساس بھی بہت رنجیدہ تھیں۔ اگلے دن ناصر واپس کراچی چلے گئے گھر کی فضا سوگوار ہو گئی۔ وہ گھر جس میں ہم رہ رہے تھے، وہ میری ساس کے نام تھا کچھ دنوں بعد ساس نے وہ گھر میرے نام کر دیا اور کاغذات بنوا دیئے۔ میری ساس نے مجھ سے معافی مانگی اور کہنے لگیں انہیں ناصر کی پہلی شادی کا علم نہیں تھا ورنہ وہ ہرگز اس کی شادی میرے ساتھ نہ کرتیں۔

"امی! اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے"۔ میں نے ان سے کہا۔ "آپ اپنا دل چھوٹا نہ کریں جو میرا مقدر نصیب تھا وہ مجھے مل گیا ہے۔ اب آپ اور میرے تینوں بچے میری کل کائنات اور زندگی ہیں۔ میں آپ کی خدمت کروں گی اور اپنے بچے پالوں گی"۔

اور پھر میں دل و جان سے اپنے کام میں جت گئی۔ میں اپنے تینوں بچوں کی بہترین پرورش کر رہی تھی۔ آنٹی رضیہ کی ساری باتیں میرے ذہن میں تھیں اور ان کی باتوں کی روشنی میں مَیں اپنے بچوں کی تربیت کر رہی تھی۔ ایک دن اخبار میں پبلک سروس کمیشن کا اشتہار میری نظروں سے گزرا جس کے مطابق انہیں لیکچرارز کی ضرورت تھی۔ میں نے اللہ کا نام لے کر اپلائی کر دیا۔ میں ہر نماز کے بعد رو رو کر اپنے اللہ سے دعا مانگتی پھر مجھے تحریری امتحان کی کال آئی۔ میں نے امتحان دے دیا۔ تحریری ٹیسٹ پاس کرنے کے بعد مجھے انٹرویو کی کال آئی میں نے پورے اعتماد اور حوصلے کے ساتھ انٹرویو دیا۔ انٹرویو دینے کے بعد میں گڑگڑا کر رب کے حضور دعا مانگتی اور پھر اللہ نے میری سن لی۔ میری سلیکشن بطور لیکچرار گریڈ سترہ میں ہو گئی۔ جس دن مجھے میری تقرری کا پروانہ ملا اُس روز میری خوشی دیدنی تھی میں ہواؤں میں اُڑ رہی تھی۔ میں نے اللہ کی بارگاہ میں شکرانے کے نوافل ادا کئے اگلے ہی دن میں نے سرکاری کالج جائن کر لیا۔ لیکچرر بننے کے بعد میری زندگی

بہت مصروف ہوگئی۔ میں نے ساتھ ساتھ کپڑوں کی سلائی کا کام بھی جاری رکھا۔ اسی طرح دو سال گزر گئے۔

ایک دن خبر آئی جس فیکٹری میں ناصر کام کرتے تھے وہاں اچانک آگ لگ گئی اور کئی ورکر جل کر لقمۂ اجل بن گئے۔ ان جلنے والوں میں ناصر بھی شامل تھے۔ انہیں کراچی میں ہی دفنا دیا گیا تھا۔ ناصر میری ساس کا اکلوتا بیٹا تھا، ان کی وفات کا سن کر انہیں بہت دکھ ہوا۔ وہ ہر وقت اپنے بیٹے کو یاد کر کے روتی رہتی تھیں۔ انہوں نے بیٹے کے مرنے کا غم اور اثر دل پر بہت لیا اور دو ماہ بعد وہ بھی چل بسیں۔ مجھے ان کا بہت آسرا تھا، اب میرا وہ آسرا بھی چھن گیا تھا۔ میرے بچے ابھی چھوٹے تھے اور اپنی دادی سے بہت مانوس تھے۔ مجھے ساس کی کمی بہت محسوس ہوتی تھی مگر اللہ نے مجھے ہمت اور حوصلہ دے دیا۔ چھوٹے چھوٹے تین بچوں کا ساتھ تھا۔ معقول تنخواہ مل جاتی اور ساتھ سلائی کے پیسے بھی آ جاتے۔ مکان اپنا تھا تو ہماری گزر بسر بہت اچھی ہو رہی تھی۔ میں نے تینوں بچوں کو سکول داخل کروا دیا۔ شام کو خود بھی انہیں پڑھاتی۔ بچوں کو بچپن سے نماز پڑھانی شروع کردی۔ ساتھ قرآن پاک ناظرہ بھی پڑھائی۔

میں نے اپنے جذبات کو کچل دیا تھا۔ جب رات کو بچے سو جاتے تو میں بہت روتی۔ کبھی اپنے باپ کو یاد کرتی، کبھی اپنی ماں کو، کبھی اپنی ساس کو اور کبھی اپنے شوہر کو۔ روتے روتے میری آنکھ لگ جاتی۔ وقت اسی طرح گزرتا رہا، میرے بچے جوانی کی حدود میں داخل ہونے لگے اور میرے سر میں چاندی اترنے لگی۔ مجھے گریڈ انیس مل گیا تھا اور تنخواہ بھی بڑھ گئی تھی۔ بچوں کے مشورہ سے میں نے ایک بوتیک کھول لیا تھا۔ اب میں خود سلائی تو نہیں کرتی تھی کپڑوں کی سلائی کے لئے میں نے کاریگر خواتین رکھی ہوئی تھیں۔ جبکہ کپڑا اور سلائی کا سامان میں خود خریدتی۔ میرا بوتیک بہت اچھا چل رہا تھا اور خوب آمدنی دے رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو بہت مصروف کرلیا تھا۔

میرے تینوں بیٹے انتہائی لائق اور حساس تھے، وہ پڑھائی میں بہت محنت کر رہے تھے۔ میں نے دنیاوی علم کے ساتھ ساتھ دینی علم بھی انہیں دیا۔ اتنی مصروف زندگی کے باوجود میں اپنے ماں باپ اور ساس، شوہر کو نہیں بھولی سال بعد ان چاروں کی برسی مناتی اور ان کے ایصال ثواب کے لئے صدقہ خیرات کرتی اور ان کی مغفرت کی دعا بھی کرتی۔ میں نے اپنے بچوں کے دل میں ان کے باپ کے لئے نفرت نہیں ڈالی اور نہ ہی ان کو بتایا کہ میں ان کی دوسری بیوی تھی۔ بس اتنا ہی بتایا ہے کہ وہ ایک فیکٹری میں جاب کرتے تھے اور آگ لگنے کی وجہ سے جھلس گئے اور ان کا انتقال ہو گیا۔ میں نے بچوں کے دلوں میں ان کے باپ کی محبت ڈالی ہے۔ وہ اپنے باپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔

اسی طرح پچیس سال کا عرصہ بیت گیا۔ الحمدللہ، اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے آج میرے تینوں بیٹے اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے ہیں۔ بڑا بیٹا حاشر ڈاکٹر ہے، یاسر انجینئر ہے اور عامر کالج میں پروفیسر ہے۔ حاشر کی شادی کردی ہے۔ اس کی بیوی میری بہو نہیں بیٹی ہے۔ میرے تینوں بیٹے اور بہو میرے بہت تابع فرمان ہیں اور میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ ان کے کہنے پر میں نے جاب چھوڑ دی ہے اور گزشتہ سال حاشر اور بہو کے ساتھ حج کی سعادت بھی حاصل کر لی ہیں اللہ تیرا شکر ہے۔ میں اکثر سوچتی ہوں کہ اللہ کو میرا رونا پسند آ گیا ہے سو میری یہ خوشگوار زندگی شاید میرے بہے ہوئے آنسوؤں اور اشکوں کا خراج ہے۔

❁❁❁

بھیک یا بدکاری؟

ان لڑکیوں نے ہماری روزی پر لات ماردی ہے اور ہمارا پیشہ سنبھال لیا ہے۔ ہمارے لئے اب صرف دو ہی راستے رہ گئے ہیں بھیک یا بدکاری۔

حبیب اشرف صبوحی

لاہور

مئی 2020ء کے شمارے میں ایک کہانی ''ادھورے انسان'' سیدہ شاہدہ شاہ صاحبہ کی نظر سے گزری۔ بہت اچھی اور بامقصد کہانی تھی جو ایک مخنث کے گرد گھومتی ہے۔ اس کو پڑھ کر مجھے بھی ایک واقعہ یاد آ گیا جو میں یہاں پیش کر رہا ہوں۔

میری بیوی کے ایک کزن نے آج سے بیس بائیس سال پہلے مقابلہ کا امتحان پاس کیا اور سندھ سیکرٹریٹ میں ملازمت شروع کر دی۔ آج کل وہ سندھ گورنمنٹ میں گریڈ 21 کے آفیسر لگے ہوئے ہیں۔ انہوں نے ایک نجی محفل میں یہ قصہ سنایا۔ انہوں نے بتایا کہ سرکاری کاموں کے سلسلے میں انہیں اندرون سندھ کے شہروں میں جانا پڑتا تھا اور مختلف محکموں کے سربراہوں سے ملنا پڑتا تھا۔ کئی دفعہ شہر کے ڈپٹی کمشنروں سے بھی ملاقاتیں کرنی پڑتی تھیں۔

ایک دفعہ وہ ایک ڈپٹی کمشنر کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور سرکاری کام کے سلسلے میں باتیں کر رہے تھے۔ اس دوران ڈپٹی کمشنر صاحب دفتر کے کام بھی کرتے جاتے تھے۔ اسی دوران انٹرکام پر اُن کے سیکرٹری نے کسی ملاقاتی کے لئے وقت مانگا تو انہوں نے کہا کہ ایک گھنٹے بعد بھیجنا اور صرف پانچ منٹ کے لئے۔ پھر وہ اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ ایک گھنٹے بعد ان کے سیکرٹری نے پھر اس ملاقاتی کی یاددہانی کروائی۔ انہوں نے کہا کہ بھیج دو اور اسے تاکید کر دو کہ پانچ منٹ سے زیادہ نہ بیٹھے۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور ایک بڑی خوبصورت لڑکی کمرے میں آئی۔ اس نے جینز پہنی ہوئی تھی۔ آدھی آستین کا بنیان پہنا ہوا تھا اور بڑی خوبصورت عینک لگائی ہوئی تھی۔ ایک کندھے پر کیمرہ لٹکایا ہوا تھا، دوسرے کندھے پر بیگ تھا۔ بڑی شاہانہ چال کے ساتھ چلتی ہوئی آئی اور انگریزی زبان میں اپنا تعارف کرایا اور بتایا کہ جرمنی سے آئی ہے۔

یونیورسٹی کی طالبہ ہے، ٹورسٹ بھی ہے۔ پاکستانی کلچر اور آثار قدیمہ سے دلچسپی رکھتی ہے اور وہ سندھ کے آثار قدیمہ دیکھنا اور ان کے بارے میں تحقیق کرنا چاہتی ہے۔ آپ کی مدد کی ضرورت ہے کہ آپ محکمہ آثار قدیمہ والوں سے میرا تعارف کروا دیں اور ان کا پتہ بتا دیں۔

"میں پاکستان اور دین اسلام سے بھی دلچسپی رکھتی ہوں"۔ اس نے بتایا۔ "میں نے اردو بھی سیکھ لی ہے۔ علامہ اقبال اور فیض احمد فیض سے بہت متاثر ہوں۔ مجھے ان کا کلام بھی یاد ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو کچھ اشعار سنانا چاہتی ہوں"۔

جب ڈپٹی کمشنر صاحب نے اسے اجازت دے دی تو اس نے اردو میں باتیں کرنا شروع کر دیں اور ایسے ایسے اشعار سنائے کہ ہم حیران رہ گئے۔ اس کی گفتگو بڑی متاثر کن اور دلفریب تھی۔ کمشنر صاحب اتنے ریشہ خطمی ہو گئے کہ اس کے لئے چائے اور بسکٹ منگوا لئے۔ اس نے اپنے کیمرے سے ان کی تصویر لی اور کہا کہ وہ جرمنی جا کر جو مضمون لکھے گی اس میں شائع کرے گی۔ اس نے اسلام کے بارے میں جو باتیں بتائیں اس میں قرآن اور احادیث کے حوالہ جات بھی تھے۔ پاکستانی ڈراموں اور فلموں کے بارے میں بھی اس کی معلومات تازہ ترین تھیں۔

ڈپٹی کمشنر صاحب نے اس سے بہت سے سوالات کئے جن کے جوابات اس نے بالکل ٹھیک دیئے۔ جب اس سے پوچھا کہ اس کا یہاں کہاں قیام ہے؟ اس نے ایک بہت اچھے ہوٹل کا نام اور کمرہ نمبر بھی بتا دیا۔ وہ پانچ منٹ کے لئے آئی تھی لیکن آدھے گھنٹے سے زیادہ کا وقت ہو گیا تھا اور ملاقاتی بھی باہر انتظار کر رہے تھے۔ آخر میں ڈپٹی کمشنر صاحب اس سے اتنے متاثر ہوئے کہ اس کو شام کے کھانے کی دعوت دے دی اور پوچھا۔ کیا آپ پاکستانی کھانے کھا لیتی ہیں؟ اور کون سی ڈش زیادہ پسند ہے؟ اس نے کہا۔ وہ پاکستانی ڈشز بڑے شوق سے کھاتی ہے مثلاً کڑاہی گوشت، کباب، قورمے اور روغنی نان وغیرہ وغیرہ۔ اس سے پوچھا گیا کہ آپ اتنی دور سے اکیلی یہاں تک پہنچی ہیں۔ آپ کو ڈر نہیں لگا۔ کسی نے اکیلی لڑکی دیکھتے ہوئے تنگ کیا ہو؟ یا بلیک میل کرنے کی کوشش کی ہو؟ کہنے لگی۔ میں جب پُراعتماد طریقے سے بات کرتی ہوں تو کسی میں اتنی جرات نہیں ہوتی کہ دوبارہ بات کرے۔ یہاں پر دل پھینک لوگ بہت ہیں۔

آخر میں ڈپٹی کمشنر صاحب نے کہا کہ شام کا کھانا آپ میرے ساتھ کھائیں گی اور مجھے بھی دعوت دی کہ آپ بھی آئیں۔ لڑکی سے کہا کہ میرا ڈرائیور شام کو آپ کے پاس آئے گا، اُس کے ساتھ آ جائیں۔ اس لڑکی نے کہا کہ اگر میں جان کی امان پاؤں تو ایک بات عرض کروں۔ آپ بُرا تو نہیں مانیں گے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ میرا تم سے پکا وعدہ ہے۔

"سر! جو پیسے آپ میرے کھانے پر ہوٹل میں خرچ کریں گے اور تحفہ بھی دیں گے جو پاکستانیوں کی روایت ہے"۔ اس نے کہا۔ "وہ تمام پیسے مجھے نقد دے دیں"۔

"اس کی کیا وجہ؟" کمشنر صاحب نے پوچھا۔

"آپ مجھے جو سمجھ رہے ہیں میں وہ نہیں ہوں"۔ اس لڑکی نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی۔ "میں ایک مخنث ہوں"۔

یہ سن کر ڈپٹی کمشنر صاحب غصہ میں آ گئے اور کہا میں تمہیں ابھی گرفتار کراتا ہوں۔ تم مجھ جیسے کتنے لوگوں کو بے وقوف بناتے رہتے ہو۔

"سر! میں آپ سے پہلے جان کی امان کا وعدہ لے چکی ہوں"۔ اس لڑکی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

ڈپٹی کمشنر صاحب وقتی طور پر غصہ میں آئے لیکن فوری طور پر اپنا وعدہ یاد آیا اور اسے معاف کرتے ہوئے اس کی فنکارانہ صلاحیتوں کی داد دی اور ساتھ اسے ایک خطیر رقم دی اور ڈرائیور سے کو کہا کہ اس نے جہاں جانا ہے اس کو چھوڑ کر آؤ۔

ڈپٹی کمشنر صاحب آج کل ایک بہت بڑے عہدے پر فائز ہیں۔ میں جب اپنے کزن سے بات کرتا ہوں تو اس واقعہ کی تجدید ضرور کرتا ہوں۔

بعض مخنث بڑی اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں اور ان کی صلاحیتیں خداداد ہوتی ہیں۔ اس طرح آج کل ان مخنثوں کی جو صدر ہے اس کا نام پروین بوبی ہے۔ جو بڑی خوبصورت اور اعلیٰ صلاحیتوں کی مالک ہے۔ اس کو کئی دفعہ ٹی وی پر دیکھا ہے۔ اس کی باتیں بڑی پُر اثر ہیں۔ اس نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ اس کو بڑے بڑے لوگ اپنے فنکشنوں میں بلوانے میں عزت محسوس کرتے ہیں۔ وہ بڑی صاحب ثروت ہے اور مخنثوں کی فلاح کے لئے کوشش کر رہی ہے اور اس سلسلہ میں اس کی کارروائیوں کی تفصیلات آتی رہتی ہیں۔

بعض لوگ ان تیسری دنیا کے لوگوں کی بڑی عزت اور توقیر کرتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کو تنگ نہیں کرنا چاہئے اور ان سے دعائیں کروانی چاہئیں۔ اس کے بارے میں خدا بہتر جانتا ہے۔

تاریخ میں بھی خواجہ سراؤں کا ذکر آتا ہے جو بڑے زبردست لڑاکا اور فنِ حرب و ضرب کے ماہر تھے۔ قوت میں عام مرد حضرات سے کہیں بڑھ کر تھے۔ ان خواجہ سراؤں کو شاہی زنان خانے میں بیگمات کی محافظت کے لئے رکھا جاتا تھا۔

کوئی وقت تھا کہ یہ لوگ شادی بیاہ، لڑکا پیدا ہونے پر اور خوشی کے دوسرے مواقع پر ناچ گا کر اپنا پیٹ بھر لیتے تھے لیکن آج کل ان کی بُری حالت ہے اور یہ بڑی بڑی سڑکوں پر بھیک مانگتے نظر آتے ہیں۔ بعض بدکاری کی طرف بھی مجبوراً مائل ہو جاتے ہیں۔

مجھے ایک خواجہ سرا نے شکوہ کے انداز میں کہا۔ ''ہم لوگ اب کیا کریں اور کیسے کما کر پیٹ بھریں؟ اب شریف شرفاء گھرانوں کی بہو بیٹیوں نے خود ہی رقص اور گانے میں مہارت حاصل کر لی ہے اور بڑی بے باکی سے شادیوں وغیرہ کے فنکشن پر سب کے سامنے ناچتی ہیں۔ ان کی ویڈیو بھی بنتی ہے جو بعد میں سب رشتہ داروں میں تقسیم ہوتی ہے اور سب اس سے محظوظ ہوتے ہیں...... ان لڑکیوں نے ہماری روزی پر لات مار دی ہے اور ہمارا پیشہ سنبھال لیا ہے۔ ہمارے لئے اب صرف دو ہی راستے رہ گئے ہیں بھیک یا بدکاری۔

نوکری کوئی دیتا نہیں، ہر جگہ ہمیں تضحیک اور طنز کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اگر ہم ایسے ہیں تو اس میں ہمارا کیا قصور؟ ہم بھی اللہ کی مخلوق ہیں ہمارے ہاتھ پیر سلامت ہیں حکومت اگر چاہے تو ہمیں کارآمد پاکستانی بنایا جا سکتا ہے۔ جنوبی افریقہ کی کرکٹ ٹیم میں ایک آل راؤنڈر کھلاڑی کیلس تھا اس نے اکیلے کئی بار اپنی ٹیم کو کامیابی دلائی وہ ہماری برادری سے تعلق رکھتا ہے۔ ہم میں بھی دم ہے اور ہم کسی سے کم نہیں، موقع تو دیا جائے۔

❁❁❁

یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ کے پی کے حکومت نے ان خواجہ سراؤں کو اس کام کے لئے ملازم رکھ لیا کہ جو قرضے لے کر واپس نہیں کرتے۔ یہ لوگ ان کے گھروں کے سامنے اپنے انداز میں خوب شور شرابہ کرتے ہیں اور نادہندگان کو قرضہ واپس کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔

سپر اسرار کہانی

ادھوری محبت

حالات میں بڑا عجیب اور ناقابل یقین موڑ آیا۔ مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ مریم کی قربانی اور لبنیٰ کی مہربانی کی وجہ سے زندگی میں ٹھہراؤ آ رہا ہے لیکن ایک دن میرے ساتھ ایک عجیب انہونا اور دلخراش واقعہ ہو گیا۔

☆ محمد رضوان قیوم — راوی: راجہ شبیر الحسن — راولپنڈی

آخری قسط

میرا دل چاہا زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں یا آسمان ہی مجھے اوپر اٹھا لے۔ حالانکہ صرف میں ہی قصوروار نہ تھا۔ مریم دل و جان سے محبت کے اس کھیل میں شامل تھی لیکن پھر بھی میں شرم سے مرا جا رہا تھا۔ میں نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا کون سی ایک ایک بات؟

اُس نے جھٹکے سے مجھے دھکیلتے ہوئے کہا کہ تیرے اور مریم کے درمیان چاچا لطیفہ کے گھر یہ..... یہ باتیں نہیں ہوئیں۔ اس نے میرے سامنے سارا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیا۔ دلچسپ بات یہ کہ اُس نے وہ باتیں اور ماحول بھی بتایا جو وہاں ہوا تھا۔ میں وہاں اپنی صفائی کچھ نہ کہہ سکا۔ مجھے انتہائی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔ میری بولتی بند ہو گئی تھی۔ اُس نے مجھے ایک تھڑے پر بٹھا کر کہا۔

''یہ بات میں تجھے ابھی تک بھائی چارے اور دوستی کے ناطے کہہ رہا ہوں۔ تو نے اگر بلقیس سے شادی کرنی ہے تو کر لے لیکن میں کسی قیمت پر بھی تیری شادی اپنی بہن سے نہیں ہونے دوں گا''۔

میرے اندر جانے کہاں سے اتنی ہمت پیدا ہو گئی کہ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''تیرے سامنے میرا یہ راز کھل ہی گیا ہے کہ میں اور تیری بہن نے آپس میں محبت اور شادی کا وعدہ کر لیا ہے تو میں بھی کسی قیمت پر اپنے وعدہ سے پھر نہیں سکتا اور مریم بھی ہر قیمت پر مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے''۔

''وہ چاہے یا نہ چاہے لیکن میں دل سے یہ نہیں چاہتا''۔ اس نے اڑیل انداز میں کہا۔ ''اور جس کام کو میں من سے نہیں چاہتا وہ کبھی بھی پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچتا''۔ اس کے بعد اس نے مجھے لبھانا شروع کر دیا۔ ''دیکھ شبیر تو میرا یار ہے، اور میں تیرے بھلے کی بات کروں گا۔ بلقیس بہت خوبیوں کی حامل، خدمتگار، شریف، خوبصورت لڑکی ہے اور تیرے ساتھ خوب جچے گی''۔

''لیکن میں اس دل کا کیا کروں؟'' میں نے جواباً کہا۔ ''میرے دل میں تو مریم بسی ہوئی ہے''۔

''دیکھ شبیر! مجھے غصہ نہ دلا اور جو میں کہتا ہوں مان جا''۔ حکیم نیاز نے سرخ آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ ''تیری جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو میں اس کا وہ حال کرتا کہ دنیا دیکھتی۔ تو نے میرے گھر کی عزت پر شب خون مارا ہے، میری دوستی کا بھی خیال نہیں کیا۔ میری بہن اپنے گھر میں اکیلی تھی، تو نے اس کی معذوری اور سادگی کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اسے اپنی طرف مائل کر لیا''۔

''اگر میری نیت میں فتور یا کھوٹ ہوتا تو میں اس کی عزت پر بہ آسانی ہاتھ ڈال سکتا تھا''۔ میں نے اسے کہا۔ ''لیکن میری نیت نیک اور ہماری محبت پاکیزہ ہے''۔

''کیا خاک پاکیزہ ہے؟'' اس نے غصے سے کھولتے ہوئے کہا۔ ''تم نے کبھی مجھے یا ابا کو اس بارے بتایا؟'' پھر اس نے تیز تیز سانس اپنے سینے میں کھینچنے شروع کئے اور غصے بھرے سرخ ڈیلوں سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''اچھا تو تیرا میری اور سکینہ کی شادی کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

اب میں بھی اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکا، میں نے اسے کہا۔

''حکیم تجھے یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ میری کزن تجھ اور مجھ سے تقریباً پندرہ سولہ سال چھوٹی ہے تو بھی اس کے لئے بے جوڑ ہے اور میں بھی''۔

''کیوں میرے میں کیا کمی ہے؟'' اس نے فخریہ انداز میں کہا۔ ''کیا جوان، خوبصورت اور برسرِ روزگار نہیں ہوں اور ویسے بھی تو بتا کہ تجھے مجھ سے اچھا کوئی

اور رشتہ سکینہ کے لئے ملے گا؟''

''ملے یا نہ ملے تجھے اس سے کیا مطلب؟'' میں نے جھنجلا کر کہا۔

''دیکھ شبیر! تُو مجھ سے ضد اور اڑ چِس نہ اگا''۔ اس نے طیش میں آنے کی بجائے میری پشت پر ٹھونگا مارتے ہوئے کہا۔ ''تُو بہ خوبی جانتا ہے اور یہ بات دیکھ بھی لی ہے کہ میں جو سوچتا یا کہتا ہوں اسے ہر صورت میں پورا کرتا ہوں۔ ... تُو اپنے دل میں جو مرضی سوچ لیکن یہ میرا تجھ سے وعدہ ہے کہ میں کبھی بھی تیری شادی مریم سے نہیں ہونے دوں گا اور ہاں اگر تُو نے بلقیس کو اپنانا ہے تو سو بسم اللہ اور دوسرے میں تیری آنکھوں کے سامنے سکینہ کو اپنا بنا کر چھوڑوں گا''۔

''تو پھر میری بات بھی کان کھول کر سن لے''۔ میں نے بھی دوٹوک انداز میں کہا۔ ''میں بھی اپنی زندگی میں تجھے تیرے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دوں گا''۔

''اچھا تو یہ بات ہے پدے!'' اس نے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔ ''مردوں والا ہاتھ ملا..... دیکھتے ہیں ضد اور انا کے کھیل میں کون کامیاب ہوتا ہے۔ اب اپنے قدموں کی زمین نہ چھوڑنا بزدل!'' اس نے زبردستی میری ہاتھ پکڑ لیا۔

میں جواباً کچھ بھی نہ بولا۔ بس خاموش ہی رہا۔ وہاں خلاف توقع میرے اور حکیم کے درمیان بلقیس، مریم، سکینہ کی شادیوں کے معاملہ میں کھچاؤ اور تناؤ ضرور تھا لیکن بات لڑائی جھگڑے تک نہ بڑھی۔

''ٹی اماں تُو میرے ساتھ میری دُکان پر چل''۔ اس نے مجھے کہا۔ ''اس بحث کو بعد میں دیکھیں گے''۔

میں دل ہی دل میں اس بات پر خوف زدہ اور پریشان تھا کہ یہ خبطی، ضدی اور پُراسرار مخلوق کا حامل آدمی ہے یہ کہیں مجھے یا سکینہ کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ کیونکہ اس نے میرے سامنے کئی نہ ہونے والے کام اپنی ضد سے کلتا کے ذریعے کئے تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے امرائل کمار اور لالہ جی کا انجام گھومنے لگا۔

''تو پھر کیا کرنا چاہئے؟''

اس سوال کا جواب بار بار میرا دل میرے ذہن سے مانگ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس ضدی مصیبت سے کیسے جان چھڑائی جائے۔ دراصل بات وہیں آ کر ختم ہو جاتی تھی کہ میں اس سے زیادہ الجھنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ میں نے بھی مریم کو ہر صورت حاصل کرنا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی اس بات میں وزن تھا کہ میں نوکری چھوڑ کر کوئی اپنا کاروبار شروع کروں کیونکہ واقعی نوکری میں رہ کر میں اپنا کوئی اچھا مستقبل نہیں بنا سکتا تھا۔ حکیم واقعی سرکاری نوکری چھوڑ کر اپنے کاروبار میں کافی روپیہ کمانے کے علاوہ دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہا تھا لیکن وہ جس راستہ پر چل رہا تھا میں اس پر نہیں چل سکتا تھا اور نہ ہی دل ماننے والا تھا۔

میں نے یہ تو قطعی فیصلہ کر لیا تھا کہ میں سرکاری نوکری کو چھوڑ کر اپنا کوئی نہ کوئی کاروبار کروں گا۔ میں ابھی مصلحتاً حکیم کو پوری طرح ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ مجھے اس سے کئی کاموں میں مدد چاہئے تھی کیونکہ وہ دفتری اور کاروباری معاملات میں چالاک ہوشیار ہو چکا تھا۔ میں نے بھی اس کا موڈ ٹھیک کرنے کی خاطر کچھ ایسے کام کئے جن کو کرنے کا میرا دل نہیں مان رہا تھا۔ مثلاً وہ مجھے رستم خان کے اڈے میں لے گیا وہاں میں نے لڑکیوں سے کچھ بے تکلفی کا اظہار کیا اور ان سے گپیں ماریں۔

وہاں مجھے خواہ مخواہ رستم خان نے کہا کہ تُو عدالتوں، کچہریوں میں اس کے ان غنڈوں کے

ساتھ رہے گا جو مذکورہ دکان کی رجسٹری کروانے میں مددگار ہوں گے۔

حکیم مجھے اپنی دکان پر بٹھا کر چلا گیا۔ وہاں میری ملاقات ساتھ والے ہندو دکاندار سے بھی ہوئی۔ وہ بھی اپنے تئیں بہت پریشان تھا۔ وہ دکان واقعی بہت باموقع اور کاروباری لحاظ سے بہت منافع بخش تھی۔ علاقہ اردگرد کے کافی ہندو کاروباری لوگ آئے انہوں نے حکیم سے استدعا کی کہ وہ اس دکان کو نہ خریدے لیکن حکیم نے انہیں رعب سے کہا کہ میں ہر قیمت پر یہ دکان خالی کراؤں گا۔ وہ کاروباری لوگ تھے اور لڑائی بھڑائی سے ان کا کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اس لئے وہ خوف زدہ ہو گئے۔

دوسری طرف میں اپنے طور پر پچھتا رہا تھا کہ میں کیوں اس گندے کھیل میں پڑ گیا ہوں۔ میں خدا سے دعا کر رہا تھا کہ وہ مجھے جلد سے جلد اس امتحان سے نکالے۔ تین چار روز بعد رستم خان نے لالہ کے بیٹے کو کچہری لے جا کر اس سے ضروری کاغذات پر دستخط اور بیانات دلوا کر دونوں دکانیں حکیم کے نام کروالیں۔ ان لوگوں نے مجھے کچہریوں، عدالتوں، اشٹام لکھنے وغیرہ میں ساتھ رکھا۔

اس نے مجھے کچہری میں خوب استعمال کیا۔ نہ جانے کہاں کہاں مجھے بیانات اور دستخطوں کے لئے دوڑایا بھگایا گیا۔ دکانیں اپنے نام کروانے کے بعد وہ مجھے رستم خان کے ڈیرے میں لے کر گیا۔ وہاں پھر سے اس نے سکینہ کے بارے میں باتیں شروع کر دیں۔ میں نے اسے بھرپور انداز میں انکار کیا تو اس نے میری طرف طنزیہ اور مذاق اڑاتے ہوئے نگاہ ڈالی اور بولا۔

''تو میری بہن کے لئے کیا کر سکتا ہے؟ تیرے تو ہاتھوں میں اس ٹوٹی پھوٹی نوکری کے سوا ہے ہی کیا؟''

''میں تیری بہن کو خوش رکھوں گا''۔ میں نے کہا۔ ''میں اسے اپنا سہارا دوں گا''۔

''تو اسے سہارا دے گا؟'' وہ یہ جملہ کہہ کر ہنسا اور کہنے لگا۔ ''کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ۔ کان کھول کر سن لے، تیری مریم کے ساتھ شادی ناممکن ہے البتہ بلقیس کے لئے تو راضی ہو جائے تو سو بسم اللہ''۔

''خدا نے چاہا تو بلقیس سے شادی کبھی نہ ہو گی''۔ میں نے طیش میں کہا۔

''سکینہ کو میں ہر صورت میں حاصل کر کے رہوں گا''۔ اس نے ہٹیلے انداز میں کہا۔

''میں بھی اپنی زندگی میں کبھی بھی تیری شادی سکینہ سے نہیں ہونے دوں گا''۔ میں نے بھی حکیم کو جوابی طور پر غصہ سے کہا۔

''شبیر تو مجھ سے اڑ پھس نہ لگا''۔ حکیم نے کہا۔ ''ضد نہ کر تو مجھے جانتا نہیں ہے کہ میں پہلے والا حکیم نیاز نہیں رہا۔ میرے اندر اب گرو پالی کے دیئے ہوئے کلنا کی طاقت ہے جو ہر ناممکن کام کو ممکن بنا سکتا ہے''۔

''سکینہ کو حاصل کرنے کا تیرا تصور خواب ہی رہے گا''۔ میں نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے ہوئے کہا۔

عین اس وقت اتفاق سے رستم خان اپنے بدمعاش بندوں کے ساتھ وہاں آ گیا۔

''میں نے تم دونوں کی باتیں سن لی ہیں''۔ اس نے اپنی گھنی مونچھوں کو مروڑا دیتے ہوئے کہا۔ پھر وہ بڑی بدتمیزی سے مجھے مخاطب کر کے بولا۔ ''ادھر آ بے چھوکرے!'' وہ مجھے حکیم سے علیحدہ ایک جگہ لے گیا اور کہنے لگا۔ ''تو اس کی بات مان لے، یہ جو تجھے لونڈیا بتا رہا ہے اس سے بیاہ کر لے اور جس سے یہ چاہتا ہے اس کی راہ میں رکاوٹ نہ بن ورنہ.....'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

میں پہلے ہی ذہنی طور پر پریشان اور تپا ہوا تھا۔ میں نے اس وقت یہ نہ دیکھا کہ میں علاقہ کے نامی گرامی بدمعاش کے ڈیرے پر کھڑا ہوا ہوں۔ میں نے ایک جھٹکے سے اس سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔

''بہتر ہے آپ ہمارے گھریلو معاملات میں نہ پڑیں۔''

جھونے کوئی اس کے گرم دماغ پر ٹھنڈا پانی ڈالنے پر رستم خان نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ ''یہ تو اہل رہا ہے۔''

اس کے ڈیرے میں موجود بدمعاشوں نے شغلیہ انداز میں میرے پورے جسم پر کئی لوٹے پانی کے انڈیل دیئے۔ حکیم نے مجھے ان کے چنگل سے چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''تو ابھی یہاں سے جا اور میں نے تجھ سے جو باتیں کی ہیں، ان پر ٹھنڈے سے سوچنا۔ میں جب وہاں سے اپنی جان بچا کر ڈیرے سے باہر جانے لگا تو مجھے رستم نے روک لیا۔

''بات سن اوئے لونڈے!'' اس نے کرخت لہجے میں کہا۔

''جی ... میں؟'' میں ایک دم گھبرا گیا۔

''یہ بکری کی طرح میں میں نہ کرو''۔ اس نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ ''میں تم سے ہی بات کر رہا ہوں یہ حکیم بڑا ضدی اور اڑیل ہے، جس بات پر ایک بار اڑ جائے پھر منوا کر ہی دم لیتا ہے اور اب تو وہ اور بھی خطرناک ہو گیا ہے۔ اس کے اندر کوئی ہوائی مخلوق گھس گئی ہے اور پھر میں بھی اس کے پیچھے ہاتھ رکھے کھڑا ہوں۔ تمہاری خیر اسی میں ہے کہ جو وہ کہتا ہے شرافت سے مان جاؤ ورنہ ...''

یہ مجھے بخوبی معلوم تھا کہ حکیم اپنی ضد کا پکا اور بے رحم بندہ ہے۔ یہ لازماً سکینہ کو حاصل کرنے کے لئے اپنے تئیں بہت تگ و دو کرے گا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اس کے شیطانی کام دیکھ لئے تھے۔ میں نے سب سے پہلے ہیڈ کوارٹر میں اپنی یونٹ میں اپنا استعفیٰ لکھ کر دیا۔ میرے چند ہمدرد ساتھیوں نے مجھے ایسا کرنے سے روکا لیکن انہیں کیا معلوم تھا کہ میں ذہنی طور پر کتنا پریشان ہوں۔ خود استعفیٰ لکھ کر دینے کے بعد اس زمانہ میں سرکاری طور پر یہ قانون تھا کہ نوکری چھوڑنے والے کو اس وقت تک کلیئر سرٹیفکیٹ نہ دیا جاتا تھا جب تک متعلقہ ملازم اپنی ڈیوٹی کا تمام چارج مجاز آفیسر، سپرنٹنڈنٹ کو نہیں دے دیتا تھا۔ مجھے وہاں تقریباً ایک ماہ رکنا تھا۔ میرا ذہن کئی پریشانیوں میں گھرا ہوا ادھر ادھر کی سوچ رہا تھا۔ کبھی مجھے حکیم کی جانب سے دی گئی دھمکیوں کا خیال آتا تو دوسری طرف میرا ذہن مریم، سکینہ کی طرف جاتا۔ اس دوران مجھے یہ خبر بھی ملی کہ رستم نے اپنے غنڈوں کی مدد سے حکیم کے ساتھ والی ہندو کریانے والے کی دکان خالی کروالی ہے اور وہاں اس کا سارا سامان سڑک پر پھینک دیا ہے۔ یہی نہیں یہ بھی سنا گیا کہ اس علاقہ میں ہندو، مسلمانوں کے درمیان بہت کھچاؤ تناؤ ہے۔ کسی نے بتایا کہ حکیم کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔

ایک دن میرے گاؤں سے میرے ابا کا یہ خط ملا کہ تو جلدی سے گھر آ۔ کیونکہ آج کل نہ جانے کیوں سکینہ رات بھر سوتی نہیں ہے اور وہ دن رات بے چین پاگلوں کی طرح پھرتی رہتی ہے اور وہ کبھی کبھار بہت بلند آواز میں چلاتی ہے۔ ابا نے مجھے یہ بھی تاکید کی کہ یہ خط پڑھتے ہی آ جا۔

یہ خبر پڑھتے ہی میری پریشانی کے گراف میں مزید اضافہ ہو گیا۔ کیا، کیا جائے؟ میرا ذہن اس سوال کا جواب دینے سے قاصر تھا۔ کیونکہ میں نے اگلے دن اپنے کلیئر سرٹیفکیٹ کے لئے میجر شمل کے پاس جانا تھا۔ اس نے مجھے خصوصی طور پر بلایا تھا۔ دوسری جانب مجھے

سکینہ کی بھی فکر تھی۔ میں نے بہرحال اپنے ضروری سرکاری کاموں کو پس پشت ڈالا اور میں سیدھا اپنے گاؤں کے گھر پہنچا تو وہاں واقعی سکینہ کی دماغی حالت انتہائی ناگفتہ بہ تھی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی بھیانک چیخ ماری۔ اس طرح جیسے کہ وہ مجھے دیکھ کر ڈر گئی ہو۔ یہی نہیں اس نے ہمارے گھر کا سارا سامان تتر بتر کر کے رکھا ہوا تھا۔ اس کی اپنی حالت بھی انتہائی خراب تھی یعنی اس نے اپنے کپڑے جگہ جگہ سے پھاڑے تھے اور بال بے ترتیب الجھے ہوئے تھے۔ اس وقت میرے گھر میں اردگرد کے پڑوسیوں، برادری کے لوگوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ ابا نے میری شکل دیکھتے ہی مجھے گالیاں دینا شروع کر دیں۔ یہی نہیں بلکہ اڑوس پڑوس برادری کے لوگ بھی میرے پیچھے پڑ گئے۔

''تو اب آیا ہے جب ہم بالکل تباہی کے دھانے پر کھڑے ہو گئے ہیں۔'' ابا نے کہا۔ ''یہ سب کچھ تیری وجہ سے ہو رہا ہے''۔

''میری وجہ سے کیوں؟'' میں نے حیران ہو کر کہا۔

''یہ سب تیرے دوست حکیم کی کارستانی ہے''۔ ابا نے غصے سے کہا۔ ''وہ کم بخت اس پر الٹے سیدھے عمل کر کے اس کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کر رہا ہے''۔

''یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟'' میں نے جھنجھلا کر پوچھا۔

''ہم نے اسے شہر کے قابل ڈاکٹروں، حکیموں اور جادو عملیات کا حساب کرنے والوں کو دکھایا''۔ ابا نے سخت غصہ سے کہا۔ ''ڈاکٹروں حکیموں نے تو اسے دوانیاں دیں لیکن اوپری اثرات کے ماہرین یہی کہتے ہیں کہ اس پر کوئی عاشق ہے اور شیطانی عمل کروا رہا ہے۔ بلکہ ایک نے تو تیرے دوست حکیم کا حلیہ بھی بتا دیا ہے''۔

''کل اس کے گاؤں کا ایک لڑکا ماجھا آیا تھا''۔ اماں درمیان میں بولی۔ ''اس کا کہنا تھا کہ چند دن پہلے اسے حکیم ملا تھا۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ اگر ان لوگوں نے (یعنی ہم نے) اسے سکینہ کا رشتہ نہ دیا تو میں اپنے اندر موجود کلتا کے ذریعہ اسے قابو کرواؤں گا''۔

وہاں برادری کے لوگ میرے پیچھے پڑ گئے کہ وہ فوری طور پر میرے ساتھ پشاور شہر چلیں گے جہاں وہ حکیم کو جان سے مار دیں گے۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ لوگ صرف زبانی جمع خرچ کر رہے ہیں عملی طور پر کوئی کچھ نہیں کرے گا۔ یہ محض بڑھکیں مارنے والے لوگ تھے۔

''خدا کے لئے اس وقت تم لوگ اپنے جذبات پر قابو رکھو''۔ میں نے سب سے کہا۔ ''ہمیں فی الحال سکینہ کے علاج کے لئے اس عمل کو سمجھنے اور توڑنے والوں سے رابطہ کرنا چاہئے''۔

میں نے انہیں دراصل یہ بات کہہ کر ٹالا تھا۔ میں فوری طور پر حکیم کے دوست ماجھا کے پاس گیا۔ وہ طبیعت کا کچھ ہمدرد اچھا انسان تھا۔ ماجھا نے ہمیں بتایا کہ وہ حکیم کا گہرا دوست ہے۔ اس نے یہ بات اسے بتائی تھی لیکن میں نے اسے ایسا کرنے سے منع کیا تھا۔ میں نے ماجھے سے اس کی بہن مریم کا ذکر کیا کہ وہ مجھے کسی طرح اس سے ملوا دے یا میرا اسے پیغام پہنچا دے۔ ان حالات میں ان کے گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔

ماجھا ایک تیز طرار اور کسی حد تک ہمدرد مخلص انسان تھا۔ اُس نے اپنی بہن کے ذریعہ میرا پیغام مریم کو پہنچا دیا۔ وہ گولی کی طرح اپنی سہیلی لبنیٰ کے ساتھ مجھ سے ملنے ایک مخصوص جگہ آ گئی۔

ہم دونوں ایک جگہ بیٹھ گئے، میں نے اسے تفصیل سے ساری بات بتائی کہ حکیم میری کزن کے پیچھے پڑ گیا ہے اور وہ ضد کرنے کے علاوہ مجھے دھمکی

دے رہا ہے کہ وہ کسی صورت بھی مریم سے میری شادی نہیں ہونے دے گا اور وہ سکینہ کو حاصل کر کے رہے گا۔ بلقیس کا بھی میں نے اس سے ذکر کیا۔

"جہاں تک سوال تمہاری اور میری شادی کا ہے، میں اس کے لئے اپنی جان دے دوں گی"۔ مریم نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "اگر تم پیچھے نہ ہٹے تو تم اس بات کا یقین رکھو کہ میں تمہاری خاطر اپنے ماں باپ، بھائی تک کو چھوڑ دوں گی"۔

میں نے بھی اسے پورا یقین دلایا کہ میں تجھے کسی بھی حال میں نہیں چھوڑوں گا۔ تم نے اپنی عقل، حوصلہ سے میرا ساتھ دینا ہے۔

"تم سکینہ کو راولپنڈی شہر میں جامع مسجد کے خطیب کو دکھاؤ"۔ مریم نے مجھے مشورہ دیا۔ "وہ بڑے عامل فاضل بزرگ ہیں اور اللہ کے کلام سے اس کا علاج کریں گے بلکہ خود تمہارے ساتھ جاؤں گی"۔

میں نے اس کو منع کر دیا کہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر اس بات کا علم حکیم کو ہو جاتا تو معاملہ مزید بگڑ جاتا تھا۔

"ایک بات تو بتاؤ مجھے مریم!" میں نے اس سے پوچھا۔ "یہ تمہارا بھائی حکیم اور ابا بلقیس کے ساتھ میری شادی پر اتنا بضد کیوں ہیں؟"

"یہ بھی ایک راز ہے"۔ اس نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "جس کو کھولنے کا اب شاید وقت آ گیا ہے"۔

اس نے میرے سامنے بلقیس کے بارے میں جو انکشاف کیا وہ خاصا افسوس ناک تھا۔ اس نے جو بتایا وہ مختصراً یوں تھا۔

بلقیس بچپن سے اپنی ماں کے ساتھ یہاں کے مالدار ہندو، مسلمان اور سکھوں کے گھروں میں چاکری کرتی تھی۔ یہاں کے مالدار عیاش مقامی لوگ غریب لوگوں کی عزتوں سے کھیلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ معصوم، غریب اور مجبور لڑکیوں کو چند ٹکے دکھا کر انہیں ورغلاتے ہیں۔ بلقیس کیونکہ بہت خوبصورت، وجیہہ شکل ہے، اس لئے اس پر کافی عیاش ہندوؤں کی نظر تھی۔ یہ خود بھی روپوں پیسوں کی لالچی تھی اور پیسوں خاطر عیاش مالدار ہندو سکھوں کو ادائیں دکھا کر انہیں للچاتی۔ اس کے بارے میں ایک آدھ شکایت ملی۔ اسے ڈھکے چھپے الفاظ میں اس کے بڑوں نے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن یہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئی۔ ہوس کے شکاریوں کے لئے بلقیس آسان شکار تھی۔ وہ اپنا کھیل کھیلتے کھیلتے ہوس کے پجاریوں کا کھلونا بن گئی۔ ایسی باتیں چھپی کب رہتی ہیں۔ اپنی ان حرکتوں کی وجہ سے بلقیس گاؤں میں بدنام ہو گئی۔

"تم بہت سیدھے سادے ہو شبیر!" آخر میں مریم نے کہا۔ "تمہاری اسی سادگی کی وجہ سے میرے ابا اور بھائی یہ گند کا ٹوکرا تمہارے سر پر سوار کرنا چاہتے ہیں"۔

میں نے اپنے دل میں سوچا کہ شاید مریم میرا دل بلقیس کی جانب سے کھٹا کرنا چاہ رہی ہو۔ میں نے اس بات کی تصدیق کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جب مریم اور لبنیٰ وہاں سے چلے گئے تو میں نے معراج سے بلقیس کے کردار کے بارے میں اس کی تصدیق چاہی تو اس نے مریم کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ یہ لڑکی واقعی پیسوں کی خاطر اپنا سب کچھ بیچنے پر تیار ہوتی ہے۔ اس مقام پر آ کر میرا دل مکمل طور پر بلقیس کی طرف سے کھٹا ہو گیا۔

میں دوسرے روز سکینہ کو راولپنڈی شہر کی جامع مسجد کے خطیب کے پاس لے کر گیا۔ وہ جنات اور عملیات کے توڑ کے ماہر تھے اور روحانی علاج کرتے تھے۔ انہوں نے اس بات کی تصدیق کی کہ اس بچی پر

کوئی مرد کالا علم کروا رہا ہے یا خود کر رہا ہے۔ اس کے توڑ کے لئے انہوں نے کچھ قرآنی آیات پڑھنے اور نقش پانی میں ڈال کر پینے اور تعویذات دیئے۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ ہمارے ساتھ راولپنڈی میں سکینہ اور میرے دوست کے علاوہ ان کی بیوی تھی۔ وہاں حیرت انگیز طور پر میرے منع کرنے کے باوجود مریم اور غلام حسین بھی آ گئے۔ وہ رضیہ کی بہت پکی تھی۔ اس نے اور میرے دوست کی بیوی نے سکینہ کو بہت اچھے طریقہ سے سنبھالا۔

گاؤں آ کر سکینہ کو معمولی سا فرق پڑا تھا۔ اس کی کیفیت پہلے سے بہتر تھی۔ میں دماغی طور پر بہت پریشان تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ کیونکہ میں نے لازماً میجر شملی کے پاس اپنے کلیئر سرٹیفکیٹ کے لئے جانا تھا۔ حالانکہ اس نے اپنے آفس میں مجھ سے ملاقات بھی کرنی تھی۔ مجھے یہ ڈر اور اندیشے ڈستے رہتے تھے کہ نہ جانے پیچھے میرے کام کا کیا بنا ہوگا۔ مریم کی محبت مجھے الگ ستاتی تو سکینہ کی دماغی حالت سے بھی میں بہت دل گرفتہ تھا۔

دوسری جانب مجھے ابا، اماں، برادری، دوست، عزیز و اقارب یہی زور دے رہے تھے کہ تو سکینہ سے فوری شادی کر اور تجھے ہر حال میں یہ کام کرنا پڑے گا۔ میں نے وہاں بغاوت کر دی کہ میں سکینہ سے شادی نہیں کروں گا۔ یہ میری چھوٹی بہن کی طرح ہے اور دوسرے میں اس سے پندرہ سولہ سال بڑا ہوں۔ ابا، اماں اور سب مجھے ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے کہ اب تیرے سوا اس کا کوئی ہاتھ نہیں پکڑے گا کیونکہ اس کی دماغی حالت کی خبر گاؤں میں ہر جانب پھیل چکی ہے اور وقت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ تو اسے اپنا لے۔ بلکہ کچھ گاؤں کے بڑوں نے ابا کے ذہن میں یہ بات ڈال دی کہ ہوسکتا ہے کہ شادی کے بعد سکینہ مکمل طور پر ٹھیک ہو جائے۔

ایک دن ہمارے گاؤں کے تمام بڑوں نے مجھے ایک جرگہ نما میٹنگ میں یہ حکم دے دیا کہ مجھے اس ہفتہ لازمی سکینہ سے شادی کرنی ہوگی۔ اس جرگہ میں میرے ابا، تایا اور گاؤں کی مسجد کے امام مولوی صاحب بیٹھے تھے۔ برادری کے چند بزرگ بھی موجود تھے۔ میں نے انہیں کہا۔ مجھے ابھی پشاور اپنے کلیئر سرٹیفکیٹ کے لئے جانا ہے۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد شادی کی تاریخ دے دوں گا۔ بڑی مشکل سے میں نے ایک بار پھر انہیں ٹالا۔

"یہ تیری سکینہ سے شادی کی آخری تاریخ ہونی چاہیئے"۔ ابا نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "اب آئندہ تیرا کوئی حیلہ بہانہ نہیں چلے گا"۔

میں دوبارہ اپنے کلیئر سرٹیفکیٹ کے لئے پشاور شہر اپنی یونٹ میں گیا تو وہاں سپرنٹنڈنٹ نے مجھے غصہ سے کہا۔

"تجھ پر میجر شملی انتہائی برہم ہے۔ اس نے تجھے اپنے دفتر میں بلوایا تھا تو کہاں دفع ہو گیا تھا؟"

میں نے اسے سکینہ کی حالت کے بارے میں بتایا تو اس نے میرے سامنے ایک اور جواب طلبی پیپر رکھ دیا جس میں مجھ سے کئی سوالات پرانے مقدمہ کے بارے میں درج تھے۔ حالانکہ اس کا تقریباً کرنل سپاٹ نے ہمارے حق میں فیصلہ کر دیا تھا۔ یہ مجھے بعد میں پتہ چلا تھا کہ اس میں بھی آفس سپرنٹنڈنٹ امرال کمار کا ہاتھ اور سازش تھی۔ اس نے ہی میرے اور حکیم کے بارے میں افسران کے کان بھرے تھے۔ دراصل اس کا ب[illegible] دشمن حکیم کی صورت میں تو نکل چکا تھا۔

میں گھبرا کر جب میجر شملی کے دفتر میں گیا تو اس نے پہلے تو مجھے خوب ڈانٹا، ذلیل کیا لیکن جب میں نے اسے اپنا مسئلہ بتایا تو اس کا دل کچھ نرم ہوا۔ اس نے مجھے بہرحال کلیئر سرٹیفکیٹ دے دیا۔ اس سے مجھے

فوائد ہوئے۔ میں اس کی رپورٹ پر بری ہوا اور دوسرے اب میں ذہنی طور پر کسی حد تک آزاد تھا۔

میں جب اپنا کلیئر سرٹیفکیٹ جمع کروانے اپنے دفتر آیا تو وہاں سپرنٹنڈنٹ امراؤں کمار بُرا سا منہ بنا کر میرے استعفیٰ کی منظوری کا لیٹر دیا۔ میں نے وہاں بازار میں ایک دوست سے اپنے کچھ روپے لینے تھے، میں اس کے پاس چلا گیا۔ کچھ گپ شپ کے بعد اس نے مجھے میری ادھار رقم واپس کر دی۔ میں وہاں سے واپس آ رہا تھا کہ اتفاق سے گروپال ملا۔ وہ اس وقت ایک دکان سے لوبان خرید رہا تھا۔

''ارے شبیر! تم یہاں کیسے؟'' اس نے مجھے دیکھ کر پوچھا۔ میں نے اسے بتایا کہ یہاں ایک دوست سے ملنے آیا تھا۔ وہ مجھے ایک ہوٹل میں لے گیا۔ اس نے مجھ سے شکوہ کیا کہ تم پھر میرے پاس نہیں آئے حالانکہ میں نے کہا تھا کہ حکیم کے بغیر اکیلے آنا۔

''سچی بات ہے میرا آپ کے پاس آنے کا دل ہی نہیں کیا''۔ میں نے صاف کہہ دیا۔ ''آپ جو کام کرتے ہیں اسے میں ٹھیک نہیں سمجھتا اور اس کے علاوہ مسلمان ہونے کی وجہ سے میرا دین بھی ایسی باتوں سے منع کرتا ہے۔ یہ میرا ایمان ہے کہ نفع نقصان کا مالک میرا رب ہے''۔

''تو نے اچھا کیا کہ میرے پاس نہیں آیا''۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''تو اپنے ایمان پر قائم رہا۔ تُو نے عقل سے کام لیا''۔

باتوں باتوں میں میں نے اسے حکیم کی ان حرکات کے متعلق بتایا جو وہ میری بہن سکینہ پر کر رہا تھا۔

''لگتا ہے حکیم کا بُرا وقت آنے والا ہے''۔ گروپال نے کہا۔ ''میرے علم کے مطابق اس کے جسم میں میں نے جو کلتا نامی جن داخل کیا تھا وہ انسانی جسم سے خون چوستا رہتا ہے۔ خوشبو اور خون اس کی خوراک ہے۔ یہ میں نے اس کو نہیں بتایا تھا۔ کلتا اب تک اس کے وجود سے پوری طاقت چوس کر اسے نڈھال کر چکا ہوگا۔ وہ اب جلد ہی مرے گا''۔

''کیا مطلب؟'' میں نے پُرتجسس ہو کر اس سے سوال کیا۔

''وہ مورکھ انسان ہے''۔ گروپال شیطانی انداز میں ٹھٹھا کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ بغیر محنت کیے ڈھیروں دولت حاصل کرنا چاہتا تھا اور جلد سے جلد ترقی کی سیڑھیاں چڑھنے کی تمنا رکھتا تھا۔ وہ بہت تھوڑے وقت بہت کچھ پانا چاہتا تھا۔ میں نے پہلے پہل اسے ٹالنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ ضدی اور اڑیل قسم کا بندہ ہے۔ وہ کالی طاقتوں کو اپنا غلام بنانے کا تمنائی تھا۔ وہ سب پر حکم چلانا چاہتا تھا مگر یہ اس کی بھول اور خام خیال تھی۔ کلتا جن کسی بھی جسم میں داخل ہو کر پہلے اسے عارضی طاقت دے کر اس کے چند کام نکالتا ہے اور پھر اس جسم کو چوس کر اپنی خوراک اور طاقت حاصل کرتا ہے۔ یہی حال اب حکیم کے ساتھ ہوا۔ وہ اب بے بس، بے جان دیمک کھایا ہوا وجود رہ گیا ہے جو کسی بھی وقت ڈھے جائے گا''۔

''وہ مجھے بڑی خوفناک دھمکیاں دیتا ہے کہ تجھے کلتا سے مروا دوں گا''۔ میں نے گروپال کو بتایا۔

''تجھے اب اس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے''۔ گروپال نے کہا۔ ''تجھے جو کام کرنا ہے بلا دھڑک کر۔ اگر تجھے میری بات پر یقین نہیں ہے، تو خود جا کر یا کسی ذرائع سے میری بات کی تصدیق کر لے''۔

گروپال کی باتوں نے مجھے حیران کر دیا۔ میرے اندر بے پناہ تجسس پیدا ہوا کہ حکیم کو جا کر دیکھوں کہ اس کی کیا حالت ہے۔ میں پہلے اس کی سائیکلوں کی دکان پر گیا۔ وہاں اس کا نوکر ملا۔ اس نے مجھے بتایا کہ مالک آج ٹھیک نہیں رہتا۔ معلوم نہیں اسے کون سی بیماری لگ

تی ہے جو اندر ہی اندر اسے چاٹ رہی ہے۔ ان سے تو ٹھیک طرح چلا بھی نہیں جاتا۔ ان کی دونوں دُکانوں کے تمام لین دین کے معاملات رستم چلا رہا ہے اور وہ اسی کے ڈیرے میں ہیں۔

میں اس وقت کشمکش و پیچ میں پڑ گیا کہ حکیم کے پاس جاؤں یا نہ جاؤں۔ کیونکہ ایک طرف اب وہ میرا براہِ راست دشمن بنا ہوا تھا اور جبکہ دوسری جانب مجھے نہ جانے کیوں اس پر ہمدردی آ رہی تھی۔ اس کے بارے میں جو بُری خبریں آ رہی تھیں یہ چیز مجھے اکسا رہی تھی کہ میں اس کی خیر خیریت پوچھوں۔

دل نہ چاہتے ہوئے بھی میں ڈرتے ڈرتے وہاں گیا۔ وہاں حسبِ معمول شرابی، جواری، وغیرہ اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ رستم خان مجھے ملا اس نے میری توقع کے خلاف مجھے کچھ نہ کہا۔ وہ ایک آرام کرسی میں بیٹھ کر بڑے مزے سے چنے کھا رہا تھا۔

''ہاں بے خرگوش بتا کیوں آیا ہے؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''تجھے کیا کوئی کام ہے؟''

''میں حکیم کی طبیعت دیکھنے آیا ہوں''۔ میں اسے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''میں نے سنا ہے کہ وہ آج کل بہت بیمار ہے''۔

''ابے بیمار، وہ تو مرنے والا ہے''۔ رستم نے کہا اور حلق پھاڑ کر ایک بندے کو بلا کر کہا۔ ''جا بے اسے مُردے سے ملوا دے''۔

''ابے مُردے کو کیا دیکھنا؟'' وہاں بیٹھے سب بدمعاشوں نے بہت زور کا قہقہہ مارا۔

میں جب حکیم کے قریب گیا تو وہاں میری نظروں کے سامنے وہ ایک ٹوٹے ہوئے چھپٹے پر بے سدھ ہڈیوں کے ڈھیر کی مانند پڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ، آنکھیں بری طرح اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ ڈھانچے کی اس کی کیفیت تھی۔

''یہ تجھے کیا ہو گیا ہے حکیم؟'' میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

اس نے مجھے اس حالت میں بھی پہچان لیا۔ اس نے انتہائی تکلیف زدہ آواز میں کہا۔

''میں کہیں کا نہیں رہا شبیر!'' اس نے کہا اور پھر رونے لگا۔ روتے روتے بولا۔ ''میں مرنے والا ہوں شبیر! کلتا نے میرے جسم کو چھوڑتے چھوڑتے اسے تقریباً نچوڑ لیا ہے''۔ اس کا سانس پھول گیا۔

وہ ابھی مجھ سے مزید کچھ کہنا چاہ رہا تھا کہ مجھے وہاں موجود چند بدمعاشوں نے بڑے برے طریقہ سے پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا۔

''اوئے پرے ہٹ اب تُو یہاں سے جا، ہم نے اس سے ابھی کچھ اپنا ذاتی کام لینا ہے''۔

''کیسا کام؟'' میں نے ان سے پوچھا۔

''تُو یہاں سے اپنی شکل گم کر اوئے!'' ایک نے مجھے دھکا دیتے ہوئے کہا۔ ''اب اِدھر آنے کی ہمت نہ کرنا ورنہ ڈیرے کے اندر ہی گاڑ دیں گے''۔

میں نے وہاں سے زندہ سلامت نکل آنے میں ہی عافیت سمجھی۔ جب میں ڈیرے کی حدود سے باہر آنے لگا تو مجھے ایک ملازم نے بڑی رازداری سے بتایا کہ رستم خان نے حکیم کی دونوں دُکانوں کو اس سے بغیر روپے دیئے ہوئے دھوکہ سے اپنے نام کروا لیا ہے اور وہ پچھلے مالک الالہ کے بیٹے سے بھی دونوں دکانات کی خریداری کے روپے کھا بیٹھا ہے اور اب رستم خان نے اس سے عدالت میں کچھ اور ضروری بیانات کروانے ہیں۔ نیز اس نے یہ بھی بتایا کہ حکیم کو ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کے جسم کا خون ختم ہو چکا ہے اور یہ چند روز کا مہمان ہے۔

یہ خبر سن کر میں بہت پریشان ہوا۔ میں جب

وہاں سے واپس گھر آیا تو میں سیدھا مریم سے ملا۔ اس کا باپ اور بھائی کام کے لئے گئے ہوئے تھے۔ مریم دیکھ کر بڑی حیران ہوئی۔ جب میں نے اسے حکیم کی گرتی صحت کے بارے میں بتایا تو وہ رونے لگی۔ اس نے مجھ سے مشورہ کیا کہ کیا، کیا جائے۔

''تم میری یہاں آمد کا کسی کو نہ بتانا''۔ میں نے اس سے کہا۔ ''یونہی کوئی نام لے کر تم یہ بات اپنے باپ کو بتاؤ کہ ایک آدمی آیا تھا اس نے بتایا کہ حکیم کی پشاور شہر میں حالت بہت خراب ہے''۔

اس نے کہا کہ میں کچھ کرتی ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ میرے ابا اماں اور برادری والے مجھ پر سکینہ سے شادی کروانے پر بہت دباؤ ڈال رہے ہیں جبکہ اس کا تو دماغی توازن اپنی جگہ پر نہیں۔

''تم کیا ایک دماغی طور پر فارغ لڑکی کے ساتھ گزارہ کرلو گے؟ اور دوسرے کوئی لڑکی جو اپنے حواس و ہوش میں نہ ہو اس سے آپ کیسے شادی کر سکتے ہیں۔ ویسے آپ کی مرضی۔ شبیر! تم جو چاہو میں ذہنی طور پر ویسا کرنے کو تیار ہوں''۔

''مریم! میں آج بھی تم سے شادی کرنے کو تیار ہوں''۔ میں نے اسے یقین دلایا۔ ''خدا نے چاہا تو میں تم سے کیا ہوا شادی کرنے کا وعدہ ہر قیمت پر نبھاؤں گا۔ میں آج کل بہت ذہنی اذیت کا شکار ہوں۔ خدا کے لئے میری جانب سے اپنا دل کھٹا نہ کرنا اور میں جب تمہیں اپنانے کے لئے پکاروں تو بلا تامل آ جانا''۔

''مجھ معذور اور معمولی صورت سے کون شادی کرے گا؟'' مریم نے روتے ہوئے کہا۔ ''تم سے پہلے یہ بات میرے ذہن میں تھی کہ میں عمر بھر کنواری رہوں گی لیکن جب تم مجھے ملے اور تم نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تو اسی دن سے میں نے اپنی زندگی تم سے جوڑ دی تھی''۔

''میرا ایک سوال ہے تم سے مریم!'' میں نے اُسے کہا۔ ''اگر میری شادی سکینہ سے ہو گئی تو کیا تم میری دوسری بیوی بن کر رہو گی اور اگر وہ اپنے پاگل پنے سے ٹھیک ہو گئی تو تم کیا سوکن کی حیثیت سے اسے برداشت کرلو گی؟''

''شبیر! تم اگر مجھے مرنے کو بھی کہو گے تو میں مر جاؤں گی''۔ اس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''میں تمہارا وہ مان جو تم مجھ پر کرتے ہو کبھی ٹوٹنے نہ دوں گی''۔

ادھر میں جب اپنے گھر پہنچا تو وہاں مجھے میرے ابا اماں اور برادری کے بزرگوں نے گھیر لیا۔ ان سب نے مجھے کہا کہ تو نے آج ہی لازماً سکینہ سے شادی کرنی ہے

''سکینہ کی دماغی حالت اس وقت خراب ہے''۔ میں ان کو ٹالنے کے لئے کہا۔ ''میں بھلا اس حالت میں اس سے کیسے شادی کرسکتا ہوں۔ یہ کام تو شرع کے بھی خلاف ہے''۔

وہاں میرے مؤقف کی کسی نے تائید نہ کی۔ وہ سب یک زبان ہو گئے کہ سکینہ شادی کے بعد ٹھیک ہو جائے گی۔ میں ان لوگوں کے سامنے بے بس ہو گیا اور انتہائی سادگی سے میرا نکاح پاگل سکینہ سے کروا دیا گیا۔ سکینہ کو دلہن بنا کر جب میرے پاس لایا گیا تو اس وقت بھی اس نے اپنا تمام میک اپ خراب کر کے، عروسی لباس پھاڑ کر خوب دیوانہ پن کیا۔ مجھے دیکھ کر مسلسل قہقہے لگاتی رہی اور اوٹ پٹانگ حرکتیں کرنے کے علاوہ اس نے وہاں موجود مہمانوں کو خوب گالیاں بھی دیں۔

مجھے اس وقت ایسا لگتا تھا جیسے کوئی پھٹا ہوا ڈھول میرے گلے میں ڈال دیا گیا ہو۔ میں جب اپنے ابا اماں اور گاؤں کے بزرگوں سے شکایت کرتا کہ تم نے میرے ساتھ یہ بہت ظلم کیا ہے تو مجھے لاجواب کرتے

نے کہتے کہ اس کا ذمہ دار بھی تو ہی ہے کیونکہ تیرے دوست حکیم نے ہی اس کو کسی کالے عمل سے پاگل کیا ہے۔

اسے ہم دوبارہ راولپنڈی جامع مسجد بھی لے گئے اور ایک آدھ ماہر عملیات کو دکھایا گیا۔ ان سب نے کہا کہ اس پہ جادوئی عمل کرنے والا اپنا پورا کام کر چکا ہے۔ ہمیں پکا یقین تھا کہ یہ سب کچھ اعلانیہ طور پر حکیم نے اس پہ کروایا ہے لیکن وہ تو خود زندگی اور موت کے درمیان جھول رہا تھا۔

شادی کے بعد مجھے مریم پہلی بار ملی۔ اسے میں نے اپنی زبردستی کی شادی بتائی تو وہ خاموش رہی بولی کچھ نہیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ میرا باپ بھائی اور گاؤں کے چند لوگ پشاور رستم خان کے ڈیرے میں گئے تھے۔ اس نے بھائی کو انہیں دینے سے انکار کر دیا۔ اس نے ٹھنڈی آہ بھر کر مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ شبیر تم جب مجھے پکارو گے اڑ کر آؤں گی۔

دوسرے روز میں سکینہ کو قریبی گاؤں کے ایک مولوی کے پاس دم کروانے لے جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ عباس (مریم کا بھائی) اور ان کے گاؤں کے دو بندے میرے پاس گھبراہٹ کے عالم میں آئے۔ عباس نے مجھے بتایا کہ آج صبح رستم خان کے چند بدمعاش ایک کھلی جیپ میں آئے تھے، وہ حکیم بھائی کو مین سڑک پہ پھینک کر بھاگ گئے ہیں۔ بھائی مرنے والے ہیں وہ آپ کو فوراً فٹ بلا رہے ہیں۔ میں نے سکینہ کو اپنے گھر کی عورتوں کے حوالے کیا اور خود ان کے ساتھ اسی وقت ان کے گھر پہنچا۔ ان کے گھر کے باہر ان کے رشتہ دار، دوست، برادری والے جمع تھے۔ میں اندر چلا گیا۔ وہاں واقعی حکیم کا جسم ہڈیوں کا پنجر بنا ہوا تھا۔ اس کی سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں یعنی اس کا سانس زندگی اور موت کے درمیان اٹکا ہوا تھا۔ جبکہ اس کے قریب اس کا باپ، ماں، مریم، بلقیس، رشتہ دار حلقہ بنائے رو رہے تھے۔

اس کی آنکھیں بھی بھری ہوئی تھیں۔ اس نے مجھے اشارے سے قریب ہونے کو کہا۔ میں نے جب اپنے کان اس کے منہ کے قریب کر دیئے۔

"میں تجھ سے ہار گیا شبیر!" اس نے انتہائی تکلیف اور ٹوٹے ہوئے الفاظ میں کمزور آواز میں کہا۔ "میں غلط تھا، تو بلقیس سے نہیں مریم سے شادی کر لئے"۔ یہ بات اس کے باپ نے بھی سنی تھی۔ اس نے بھی اس کے منہ کے ساتھ اپنے کان جوڑ لئے تھے۔

اس کے باپ نے اسے روتے ہوئے کہا۔ "تیری وجہ سے نہ صرف تو برباد رسوا زمانہ ہوا بلکہ ہم بھی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے"۔

وہاں موجود کچھ لوگوں نے اسے کہا کہ یہ مر رہا ہے اسے اس وقت طعنے نہ دو بلکہ معاف کر دو۔

اس کے باپ نے اسے اس کے کان میں معافی کا لفظ کہا۔ اس کے بعد میں نے بھی اسے اس کے کانوں میں معافی کا لفظ کہا۔

پھر اس نے اشارے سے مریم کو اپنے پاس بلایا اور کہنے لگا۔ "میرے مرنے کے بعد تم شبیر سے شادی کر لینا۔ یہ اچھا لڑکا ہے"۔

اس کے منہ میں آب زم زم ڈالا گیا اور اسے کہا گیا کہ کلمہ پڑھو (کچھ لوگوں نے وہاں ایسا کرنے سے منع بھی کیا گیا کہ یہ مر رہا ہے ایسا نہ ہو تا کہ نزع کے عالم میں یہ اس کا انکار نہ کر دے اور کفر کی موت مرے) لیکن اس نے کلمہ طیبہ ٹوٹے ہوئے الفاظ میں پڑھا اور پھر اس کی روح اس کے جسم سے نکل گئی۔

وہاں یہ بہت عجیب بات ہوئی کہ مریم مجھ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ یہ منظر بلقیس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ حکیم کی میت پر خوب آہ و بکا ہوئی۔ وہاں میرے ابا، اماں گاؤں کے دیگر لوگ بھی

گئے۔ اس کے جنازہ کے بعد مجھے کسی ذریعے بلقیس کا یہ پیغام ملا کہ میں اسے لازماً آخری بار کھلو رام کی دکان کے پچھواڑے میں رات کے وقت ملوں۔ میں درحقیقت اس سے ملنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ مجھے اس کے گندے کردار کا جب سے علم ہوا تھا تو مجھے اس سے فطری طور پر نفرت ہو چکی تھی۔ بہرحال میں اس سے کھلو رام کی دکان کے پچھواڑے میں اس سے ملا۔ بلقیس کو میں نے کہا کہ تمہیں مجھے یہاں نہیں بلوانا چاہئے تھا۔

''یہ میرے بس کی بات نہیں شبیر!'' اس نے جذباتی انداز میں کہا۔ ''میرا اپنے دل پر کنٹرول نہیں ہے''۔

''تم تو پاگل ہو''۔ میں نے اس سے کہا۔ ''تمہیں معلوم نہیں کہ میں اب شادی شدہ ہوں''۔

''شبیر! تم نے ایک لڑکی سے اس کے پاگل پن میں اور اس کی غیر رضامندی سے شادی کی ہے''۔ وہ کہنے لگی۔ ''یہ سراسر حرام کاری، شرعی لحاظ سے غلط نکاح ہے اور اب سنا ہے کہ تم مریم سے شادی کرنے چلے ہو''۔

''یہ تم کس طرح کہہ سکتی ہو؟'' میں نے ٹھٹکتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''یہ بات اب راز نہیں رہی شبیر!'' اس نے کہا۔ ''حکیم بھائی نے یہ فیصلہ کرلیا تھا اور پھر موت سے پہلے بھی آخری بات یہی کی تھی انہوں نے...... دیکھو شبیر! اگر تم واقعی لنگڑی مریم سے شادی کرنا چاہ رہے ہو تو اپنے دل کی تمنا بے شک پوری کرلو لیکن مجھے بھی اپنا لو''۔

''تیرا دماغ تو ٹھیک ہے نا؟'' میں نے اسے کہا۔ ''تو کیا میں تین شادیاں کروں؟''

''ہاں ٹھیک ہے''۔ اس نے اطمینان سے کہا۔ ''تم تینوں بیویوں کو سنبھالنے اور خرچ کی فکر نہ کرو۔ میں تمہاری پوری مدد کروں گی اور گھر چلانے کے لئے بڑا خاصا خرچہ دوں گی''۔

''تو کوئی نواب زادی ہے؟'' میں نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا۔ ''جو تم اپنی دو سوکنوں کے علاوہ اپنا خرچ بھی برداشت کرے گی؟''

''میرا یقین کرو شبیر!'' اس نے روہانسی آواز میں کہا۔ ''میں نے اتنا روپیہ پیسہ جمع کرلیا ہے کہ میں ہم جیسے لوگوں کے کئی گھروں کو پال سکتی ہوں''۔

''مجھے معلوم ہے جس طریقہ سے تو نے اتنی بڑی رقم جمع کی ہوئی ہے''۔ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''مجھے تیرے کرتوتوں کا بخوبی علم ہے بلقیس!''

''اچھا تو تمہیں میرے ماضی کے بارے میں لازماً مریم نے سب کچھ بتا دیا ہوگا''۔ وہ چونک کر بولی۔

''نہیں مجھے مریم نے تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتایا''۔ میں نے جھوٹ کا سہارا لیا۔ ''تمہارے کالے کرتوتوں کا اردگرد کے تمام لوگوں کو علم ہے''۔

''یہ میرا سیاہ ماضی تھا شبیر!'' اس نے روتے ہوئے کہا۔ ''تب میں مجبور تھی، نادان تھی لیکن میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ تم مجھے اپنا لو میں تمہارے ساتھ ایک پاکیزہ زندگی گزاروں گی اور ویسے بھی تمہاری دو بیویاں ہوں گی۔ میں اور مریم، سکینہ تمہاری شرعی بیوی نہیں ہے۔ تم اس کے ساتھ حرام زندگی گزار رہے ہو''۔

''تو کون ہوتی ہے میری شادی کے بارے میں فتویٰ لگانے والی؟'' میں نے نفرت سے کہا۔

''شبیر! خدا کے واسطے مجھے اپنا لو''۔ بلقیس میرے پاؤں میں گر کر گڑگڑانے لگی۔ ''میں مریم کے ساتھ مل کر رہ لوں گی''۔

''تم یہاں سے چلی جاؤ''۔ میں نے اسے اپنے قدموں سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''تم خوبصورت ضرور ہو

لیکن میں نے مریم سے کیا عہد مردوں کی طرح نبھانا ہے۔ سکینہ کے ساتھ شادی کرنا میری خاندانی مجبوری اور حالات کا تقاضا تھا''۔

''تم میری محبت کو ٹھکرا رہے ہو شبیر!'' اس نے جلتی ہوئی آواز میں کہا۔

''میری محبت کے جواب میں نفرت اور حقارت دے رہے ہو..... میری بات کان کھول کر سن لو۔ میں کبھی اپنی زندگی میں مریم کو تمہارا نہیں ہونے دوں گی۔ اگر تمہاری نظر میں بُری ہوں تو بُری بن کر دکھاؤں گی''۔

اس کی آنکھوں میں آنسو اور لہجے میں آگ بھری تھی۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے وہاں سے بھیجا۔ وہ روتے ہوئے میرے پاس سے چلی گئی۔

میں نے وہاں سے واپس آ کر مریم کو اپنی اور بلقیس کی ملاقات کے متعلق بتایا اور اسے وہ ساری باتیں بھی بتائیں جو اس کے اور میرے درمیان ہوئی تھیں۔ وہ یہ سب سن کر خاموش ہی رہی۔ ایک لفظ بھی نہ بولی۔

اس کے باپ نے مجھے کہا کہ بیٹا شبیر تم نے حلیمہ کی آخری خواہش سن لی تھی۔ تمہارا اس کے بارے میں کیا ارادہ ہے۔

''میں دل و جان سے مریم کو چاہتا ہوں''۔ میں نے انہیں کہا۔ ''اور اسی سے ہر حال میں شادی کروں گا''۔

''سکینہ بھی تمہارے نکاح میں ہے''۔ اس کے ابا نے مجھ سے پوچھا۔ ''کیا تم اس صورت میں بھی میری بچی کو اپناؤ گے؟''

''ہاں!''

انہوں نے یہ شرط لگائی کہ تم مریم سے نکاح کر کے ہمارے ساتھ گھر داماد بن کر رہنا میں نے ان کی تمام باتیں مانتے ہوئے انہیں کہا کہ میں اپنے ماں باپ سے مریم سے اپنی شادی کی بات کروں گا۔

میں جب اپنے گاؤں کے گھر گیا تو وہاں سکینہ کے پاگل پن میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ اب گھر کے قریب سے گزرنے والے لوگوں کو پتھر مارتی اور گالیاں دیتی۔ اس نے ایک روز قبل اماں کے کپڑے پھاڑ دیئے تھے۔ اماں اسے نہلانا چاہ رہی تھی۔ ابا اماں کو چھڑانے آئے تو اس نے ابا پر تھوک دیا۔ اس کی حالت ایسی ہوگئی تھی کہ وہ کسی کے قابو میں نہیں آتی تھی۔ مجھے تو وہ دیکھ کر اور زیادہ ہی جنونی ہو جاتی تھی۔ وہ مجھے بھی زد و کوب کرتی۔ میرے بال بکھیرتی، کپڑے پھاڑتی، اور کہتی میرا بھائی خاوند آ گیا۔

میں نے ابا اماں سے اپنے دل کی بات کھل کر کرنے کے لئے گاؤں کے بڑے بزرگوں سب کو ایک جرگہ کی صورت میں اکٹھا کیا۔

''آپ سب لوگ سکینہ کی حالت دیکھ رہے ہیں''۔ میں نے ان سے کہا۔ ''میں اب سکینہ کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ اس نے میرا ہی نہیں بلکہ سب کا جینا حرام کر دیا ہے۔ اسے میرے خیال میں لاہور یا آگرہ کے پاگل خانہ میں داخل کروا دیا جائے''۔

بزرگوں اور ابا نے اس بات کو تسلیم کیا کہ واقعی سکینہ کی دماغی حالت اب اس قابل نہیں رہی کہ اسے اپنے طور پر سنبھالا جائے کیونکہ اس نے گاؤں کے کئی لوگوں کے سر پھاڑے، پتھراؤ کیا تھا۔ گاؤں اور شہر والوں نے ایک حد تک اس کی دیوانی حرکات برداشت کر لی تھیں۔

اس جرگہ میں موجود بڑے مختلف رائے دینے لگے۔ کچھ کہتے تھے کہ یہ ٹھیک ہو جائے گی اسے ایسا ہی رہنے دیا جائے۔ کچھ ابا کو کہہ رہے تھے کہ اسے واقعی آگرہ یا لاہور کے پاگل خانہ بھیج دیا جائے۔ ایک گروپ وہاں ایسا بھی تھا جو میرے ابا اماں کو یہ سمجھانے کی کوشش

کرتا تھا کہ شبیر اور پاگل سکینہ کا نکاح غلط غیر اسلامی غیر شرعی ہے۔

"میں اب مریم سے اپنی مرضی کی شادی کروں گا"۔ میں نے اس بات کو پکڑتے ہوئے کہا۔ "اور سکینہ کو بھی طلاق نہیں دوں گا"۔

ابا اماں اور برادری کے کچھ بڑوں نے مجھے ذلیل خوار کرتے ہوئے کہا کہ جیسا بھی ہو ہر قیمت پر سکینہ کے ساتھ نبھاہ کر۔

"جس لنگڑی کی خاطر تو مر رہا ہے اسی کے ظالم بھائی کی وجہ سے اچھی بھلی سکینہ پاگل ہو گئی ہے"۔ ابا نے چلاتے ہوئے کہا۔ "یہ میں نہیں ہونے دوں گا"۔

"اس میں مریم کا کیا قصور ہے؟" میں نے انہیں کہا۔ "میں نے اس سے پہلے ہی شادی کا وعدہ کیا تھا اور میں یہ کام ہر قیمت پر کر کے رہوں گا"۔

"میں تجھے دودھ نہیں بخشوں گی"۔ اماں نے کہا۔

"تیرا میرا جینا مرنا ختم"۔ ابا نے جذباتی انداز میں کہا۔

"آپ جو مرضی میرے فیصلہ کے بارے میں سوچیں"۔ میں نے گستاخی کے انداز میں کہا۔ "میں نے ہر حال میں مریم سے شادی کرنی ہے اور دوسرے میں سکینہ کو طلاق بھی نہیں دوں گا۔ مریم سے میں نے اس بارے میں پہلے سے بات کی ہوئی ہے"۔

اس محفل میں میرے ابا اور برادری والوں کے درمیان خوب بحث و تکرار ہوئی۔ کچھ لوگوں نے میرے مؤقف کی تائید بھی کی۔ میں سکینہ کے قریب گیا اسے میں نے کہا کہ مجھے معاف کر دینا میں پھر بھی تجھے اس حالت میں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ وہ بیچاری اپنے آپے اور ہوش حواس میں ہی نہ تھی۔ درحقیقت حکیم نے مرتے ہوئے کہا تھا کہ اس پر جو کالا عمل میں نے کروایا ہے اس کا توڑ بہت مشکل ہے۔ اگر ہوا بھی تو برسوں لگیں گے۔

وہاں سے میں مریم کے پاس آ گیا۔ میں نے اس کے باپ کو بتایا کہ میں اپنے پیچھے اپنے تمام رشتہ داروں کو اپنے وعدہ کی خاطر چھوڑ کر آیا ہوں۔ میں اسے یہ بھی کہا کہ میرے باپ نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔ میں یہیں تمہارے پاس رہوں گا۔ میں نے اسے کہا کہ میں مال روڈ مری میں ایک بڑی مشہور دُکان کے باہر سموسے، پکوڑوں، چائے کا ڈھابہ کھولوں گا۔ اس نے کہا کہ اگر ہمیں کچھ بھی نہ ملا تو ہم یہاں آرام سے روٹی تو کم از کم کھا لیں گے۔

"شبیر! مجھے اس بات کا پکا یقین ہو گیا ہے، کہ تم واقعی مجھ سے سچی محبت کرتے ہو"۔ مریم نے موقع پا کر کہا۔ "تیرے دل میں کوئی قلق نہ رہے گا تم اب بھی چاہو تو یہاں سے واپس اپنی بیوی سکینہ کے پاس لوٹ سکتے ہو"۔ میں نے اسے کہا۔ "میں جب تمہارے پاس اپنا سب کچھ چھوڑ کر کشتیاں جلا کر آ گیا ہوں، اب واپس نہیں لوٹوں گا"۔

اس نے بتایا کہ بلقیس نے اپنی کوٹھڑی تایا کے ہاتھوں فروخت کر دی ہے لیکن اس نے ابھی اس کا قبضہ نہیں دیا ہے۔ میرے اور مریم کے نکاح کی تیاری شروع ہو گئی۔ میں نے اپنے چند قریبی دوستوں کو بلایا۔ جبکہ مریم کی جانب سے بھی چند قریبی لوگ آئے اس نے بلقیس کو بھی بلوایا۔ حالانکہ میں نے اسے بلوانے کے لئے منع کیا تھا۔ اس نے کہا کہ اگر اسے ہم نے نہ بلایا تو ہماری برادری والے ہمیں ذلیل کرنے کے علاوہ کئی الٹی سیدھی باتیں کریں گے۔ وہ بھی دل سے اپنی شادی میں بلانا نہیں چاہتی تھی۔ میرا اور مریم کا نکاح انتہائی سادگی سے اس کے ہی گھر ہوا۔ کوئی ڈھول نہ بجا اور نہ ہی کوئی شادی کی رسومات ہوئیں۔ صرف لبنیٰ نے مریم کے ہاتھوں میں مہندی لگائی، منہ سے تھوڑا بہت شغل کیا۔ میں نے جن قریبی دوستوں، رشتہ داروں کو

دیا تھا وہ ابا اور برادری کے ڈر سے نہ آئے۔ ادھر باتیں خادم حسین کے ساتھ کافی تحفے، نقدی لے کر ظاہر ہنسی خوشی کا عالم میں آئی۔ اس نے مجھے اور مریم کو بہت بہت مبارکباد دی۔ اس نے مریم کیا کہ شبیر تجھے مبارک ہو۔ اب میں تے اس کو حاصل کرنے کا ارادہ دل سے نکال دیا ہے اور ویسے بھی میں نے مری سے بہت دور چلے جانا ہے۔ مریم نے پوچھا کہاں جاؤ گی تو جواباً اس نے کہا کہ میں بہت دور جا رہی ہوں۔ میں وہاں خاموش بیٹھا رہا، میں کچھ نہ بولا۔

دوسری جانب مجھے ابا اور اماں کا یہ پیغام ملا کہ سکینہ کی دماغی حالت آخری حد تک خراب ہوگئی ہے۔ اس نے گاؤں کی گلیوں میں تقریباً نیم برہنہ ہو کر پھرنا، گالیاں دینا اور اودھم مچانا شروع کر دیا ہے۔ مجھے ابا نے کہا کہ تو سکینہ کا گلا گھونٹ یا اپنے پاس نئی نویلی دلہن کے ساتھ رکھ۔ مجھے اس وقت یہ بات کسی پہاڑ سے کم محسوس نہ ہو رہی تھی۔ کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا کہ میں اس صورت میں میں کیا کروں۔ میرے لئے یہ ناممکن تھا کہ میں سکینہ کو مریم کے پاس لے آتا اور دوسرے سکینہ کو راولپنڈی، لاہور، آگرہ کے پاگل خانہ میں داخل کرواتا۔

کبھی میں پچھتانے لگتا کہ خواہ مخواہ مریم سے شادی کا پنگا لیا ہے۔ وہ لنگڑی ہے تو سکینہ پاگل۔ کیا کروں؟ پھر میں نے سوچا کہ وعدہ بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے، میں نے اپنا وعدہ نبھایا ہے۔ اگر ایسا نہ کرتا تو لفظ محبت بدنام ہونے کے علاوہ میرا ضمیر ساری زندگی میری روح کو ہتھوڑے مارتا۔

میں نے مریم سے اپنی اس نئی پریشانی کا ذکر کیا تو خلاف توقع اس نے میرا دل بڑھاتے ہوئے کہا کہ سکینہ میری سوکن نہیں میری بہن کی طرح ہے۔ میں تمہارے ساتھ تمہارے گاؤں کے گھر جا کر اسے دیکھوں گی۔ یا تم اسے میرے پاس یہاں لے آؤ۔ اس نے مجھے بہت دلاسہ دیا۔ یہ بات جب دوسرے رشتہ داروں، برادری والوں تک پہنچی تو وہاں رنگ برنگے مشورے ملنا شروع ہو گئے۔ کچھ نے کہا کہ تو اکیلا اپنے گاؤں جا، کیونکہ اگر تیرے ساتھ مریم گئی تو الٹا تیرے گھر، گاؤں والے مزید غصہ سے بھڑکیں گے اور مریم کی تذلیل کریں گے۔

کسی نے کہا کہ سکینہ پاگل ہے وہ اسے نقصان نہ پہنچا دے۔ یہ ممکن تھا اور اس بات کا مجھے بھی اندیشہ تھا۔

میں ڈرتے ڈرتے اپنے گھر گیا تو وہاں میرے ابا اور قریبی رشتہ دار بھوکے بھیڑیوں کی طرح مجھ پر جھپٹے اور مجھے خوب لعن طعن کی اور گالیاں دیں۔

''ہم کب تک تیری پاگل بیوی کے ڈھول کو اپنے گلے میں لٹکائے پھریں گے؟'' ابا نے دھاڑ کر پوچھا۔

اماں نے الگ مجھے اپنا چہرہ دکھاتے ہوئے کہا کہ دیکھ تیری جورو نے تھپڑ مار مار کر میرا کیا حال کر دیا ہے۔ وہاں ہر کوئی سکینہ کی شکایتیں کر رہا تھا۔ الغرض وہاں موجود سب نے میرا دماغ مزید خراب کر دیا۔ میں تو پہلے سے ہی بہت اذیت میں تھا۔ میں نے سکینہ کو دیکھا اس کا ایسا برا حال تھا کہ اسے لفظوں میں بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ اس کے سر کے بال الجھے ہوئے۔ چہرے پر جگہ جگہ ناخنوں کے کھرچنے کے نشانات، کپڑے لیٹے ہوئے تھے۔ وہ کسی وحشی کی طرح میرے پاس آئی اس نے میرے چہرے پر لگاتار کئی تھپڑ مارے۔ اس نے دل کھول کر کافی دیر تک مجھے مارا اور میں مار کھاتا رہا۔

''اب بہت ہوگئی، ہم سے صبر نہیں ہوتا۔ شبیر! تو اپنی پاگل بیوی کو اپنے ساتھ لے کر جا، تیرا مرنا، جینا اب ہم سے ختم ہوا'' ابا نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

''اچھا اماں میں شام کو اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا''۔ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''یہ میرا جنا (خاوند) ہے؟'' ادھر سکینہ چلاتی رہی۔ ''جُل جُل دفع ہوا'' وہ پہاڑی زبان میں کہنے لگی۔ ''جا..... دفع ہو''۔

میں ہونقوں کی طرح اُسے دیکھتا رہا اور یہ سوچنے لگا کہ اس پاگل کا کیا کروں۔ اسے شہر کہیں ہسپتال میں لے کر جاؤں یا اسے ادھر ہی تنہا چھوڑ کر اس سے جان چھڑاؤں؟ لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی سوچتا تھا کہ وہ جیسی بھی ہے، ہے تو میری بیوی اور دوسرے مرحوم چچا کی بیٹی بھی ہے۔

''ہم اس پگلی کی حرکتوں سے تھک گئے ہیں''۔ ابا نے میری سوچوں کو توڑتے ہوئے کہا۔ ''یہ تیری زنانی ہے اسے اپنی نئی نویلی دلہن کے پاس لے جا''۔

''ہمارے سر سے اتار اس پاگل کو''۔ وہاں بزرگوں نے مجھے سختی سے کہا۔ ''اگر تجھے اسے اپنے سسرال لے جانے میں پریشانی ہو رہی ہے تو ہم خود اسے تیری نئی دلہن کے پاس چھوڑ آئیں گے''۔

''اچھا ٹھیک ہے، میں شام کو اسے یہاں سے لے جاؤں گا''۔ میں نے ان سے کہا۔

''نہیں تو جھوٹ بولتا ہے، تُو اسے ابھی یہاں سے لے کر جا''۔ برادری والے مجھ پر دباؤ ڈالنے لگے۔

بدقسمتی سے میری اماں ان لوگوں کی ہم زبان ہو گئی۔ مجھے ان لوگوں نے جو میرے اپنے ہی تھے، مجھے بھی نیم پاگل بنا دیا۔ میرے پاس اب کوئی راستہ نہ بچا تھا جو بھی تھا سکینہ کو سنبھالنا میری ہی ذمہ داری تھی۔ میں نے اسے مریم کے گھر لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ابا اماں، میرا بھائی اور دوسرے وہاں سب اس معاملہ میں پتھر دل بن گئیں میں نے بھی وہاں اپنا خوب غصہ نکالا۔ میں نے ابا اماں کو کہا کہ تم لوگوں نے میری رضامندی کے خلاف اس سے شادی کروائی جو شرع کے خلاف ہے۔ یہ اُس وقت پاگل تھی۔

''اسے پاگل بھی تو تیرے دوست نے کیا تھا''۔ ابا نے طعنہ دیتے ہوئے کہا۔ ''اور تُو اس کی لنگڑی بہن کے عشق میں دیوانہ ہو کر مر رہا تھا''۔

''تو ہمیں اس کا دوش نہیں دے سکتا کہ ہم اس صورتِ حال کے ذمہ ہیں''۔ اماں درمیان میں بولیں۔

جب میں پاگل سکینہ کو اپنے گاؤں کے دو دوستوں کے ساتھ مریم کے گھر لایا تو اسے دیکھ کر مریم کے ابا نے منہ پھلا لیا۔

''تیری پاگل بیوی کو سنبھالنا ہماری ذمہ داری نہیں ہے''۔ اس نے صاف صاف کہا۔ ''اسے ابھی کسی پاگل خانے لے کر جا، تُو اسے یہاں کیوں لایا ہے؟''

درمیان میں مریم آ گئی، اس نے اپنے ابا سے کہا کہ اسے میں نے اپنی مرضی سے اپنے پاس بلایا ہے۔ میں اسے ہسپتال لے جاؤں گی اور اس کی دیکھ بھال بھی کروں گی۔

''تُو تو خود محتاج ہے، تُو کیا کسی کو سہارا دے گی؟''

''ابا! میری ایک ٹانگ کمزور ہے لیکن میری ہمت اور حوصلہ مضبوط ہے''۔ اس نے مضبوط لہجے میں کہا ''میں اس مصیبت کے وقت میں شبیر کا سہارا بنوں گی''۔

اس کے ابا نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اپنی زندگی میں پہلی لڑکی دیکھی ہے جو اپنی سوکن کو دل و جان سے چاہتی اور اس کی خدمت کرنا چاہتی ہے''۔ پھر اس نے اپنی آواز کو بلند کرتے ہوئے کہا۔ ''میں کسی صورت میں بھی اس کو اپنے گھر نہیں رکھوں گا''۔ پھر اس نے مجھے اور سکینہ کو ننگی گالیاں دینا شروع کر دیں۔ میں وہاں بالکل بے بس تھا۔ مجھے وہاں صرف یہ ڈھارس تھی کہ مریم میری وکالت کرنے کے علاوہ میرا بھرپور ساتھ دے رہی تھی۔ مریم کے گھر میں

پاس اس کا روحانی علاج کروانے جاتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم اسے بھارہ کہوں کے پاس ایک مشہور ہندو ڈاکٹر کو بھی دکھا رہے تھے وہ اسے جسم، دماغ کی طاقت کی دوائیاں دینے کے علاوہ کچھ ایکسرسائز بھی کروا رہا تھا۔ اس سے اس کی دماغی حالت بہتر ہو رہی تھی۔ اس سے ہمیں دلی تسلی ہو رہی تھی کہ چلو ہماری مشقت، محنت، صبر کچھ رنگ لا رہا ہے۔

میں جب بھی مریم سے یہ سوال پوچھتا تھا کہ جب بھی سکینہ ٹھیک ہو گئی تو تمہارا میرے اور اس کے ساتھ کیا برتاؤ ہوگا؟

”میں اسے تقدیر کا لکھا سمجھوں گی۔“ وہ جواباً کہتی۔ ”اور تم بھی ہم دونوں کو برابر حق وقت دینا۔ باقی تمہیں میری طرف سے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔“ وہ بلقیس سے ڈرا کرتی تھی کہ یہ کہیں ہمیں نقصان نہ پہنچا دے۔ وہ مجھے اکثر کہا کرتی تھی کہ میرا بھائی اس کو اس حالت میں لانے کا ذمہ دار ہے۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم سکینہ کا علاج کروائیں۔

پھر حالات میں بڑا عجیب اور ناقابلِ یقین موڑ آیا۔ مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ مریم کی قربانی اور نیکی کی مہربانی کی وجہ سے زندگی میں ٹھہراؤ آ رہا ہے لیکن ایک دن میرے ساتھ ایک عجیب سا ہونا اور خطرناک واقعہ ہو گیا۔ ہوا یوں کہ میں باڑیاں دن اپنی نوکری کے سلسلہ میں کسی دوسرے آفیسر سے ملنے ان کے بنگلہ میں پیدل پہاڑی راستے سے گزرتا ہوا جا رہا تھا کہ گھات میں چھپے ایک لمبے چوڑے شخص نے مجھے دبوچ کر اپنا تک بہ کی کمر میں خنجر سے وار کیا۔ میں نے سمجھا کہ کوئی چور ڈاکو ہے۔ اللہ نے مجھے بچانا تھا، میں نے بھی اس سے خنجر چھیننے کے لیے اپنے تئیں مزاحمت کرنا شروع کر دی۔ ہم دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ اس نے میری کمر میں خنجر مارا۔ میں نے زخمی حالت میں اپنا پورا زور لگا کر اسے دور اٹھا کر پھینکنے کی کوشش کی لیکن وہ مجھ سے زیادہ طاقتور تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے اس کا خنجر والا ہاتھ پکڑے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے زمین سے ایک پتھر اٹھا کر اس کے سر پر مارا جس سے اس کی گرفت مجھ پر سے کمزور پڑ گئی، وہ بھی ٹھیک ٹھاک زخمی ہو گیا۔

ہماری اس لڑائی کو چند مقامی دیہاتیوں نے دیکھ لیا۔ وہ دوڑ کر ہمارے پاس آ گئے، انہوں نے ہم دونوں کو فوری زخمی حالت میں ہسپتال پہنچایا بعد میں پولیس کو اس بندے نے بتایا کہ وہ رستم خان کی جانب سے بھیجا ہوا تھا (اس کی دھمکی مجھے رستم خان نے پشاور میں دی تھی)۔ میری کمر میں خنجر کے حملہ کی دو کاری ضربیں آئی تھیں۔ مجھے مردان کے بڑے سرکاری ہسپتال داخل کروا دیا گیا۔ مریم، بلقیس، لبنیٰ مجھے ہسپتال دیکھنے آئے۔ مریم کا رو رو کر برا حال ہو گیا۔ میں نے اور ڈاکٹروں نے اسے پورا یقین دلایا کہ خدا کے فضل و کرم سے میری جان بچ گئی ہے، لیکن وہ رو رو کر نڈھال ہوئے جا رہی تھی۔ ادھر بلقیس پہلی دفعہ مجھے اس حالت میں دیکھ کر بڑی روئی کہ بڑی بات ہے وہ مجھے اس وقت کوئی طعنہ دینے سے باز نہ آئی۔ لبنیٰ بھی آنسو بہا رہی تھی۔ وہاں بلقیس نے تمام لوگوں سے خوب باتیں کیں اس نے روتے ہوئے مجھ سے اور مریم سے اپنی پچھلی کچھ حرکتوں کی معافی مانگی۔ اس نے بتایا کہ وہ واقعی کسی وقت بدراہ ہو کر بھٹک گئی تھی۔

اس دوران مجھے ہسپتال میں علم ہوا کہ سکینہ کی دماغی حالت مزید خراب ہو رہی ہے وہ اب جنونی حالت میں آ کر اتنا چیختی ہے کہ وہ یہ نہیں دیکھتی کہ کس سے رشتے کیا ہے۔ مجھے وہاں یہ بھی پتا چلا کہ اس نے ہماری ایک پڑوسن کا سر پھاڑ دیا ہے۔ لوگ مریم کو کہتے تھے کہ تو نے خواہ مخواہ کسی کا عذاب اپنے گلے ڈالا ہوا ہے۔ اسے یہ مشورہ دیا جا رہا تھا کہ تو اپنے خاوند سے یا

تو طلاق لے یا اس کی پہلی بیوی کو اس کے حوالے کرے لیکن مریم ان سب کا صبر سے مقابلہ کر رہی تھی۔
اُدھر ڈاکٹروں نے میرے زخموں کی حالت دیکھ کر مجھے راولپنڈی کے بڑے سرکاری ہسپتال میں آپریشن کروانے کا مشورہ دیا کیونکہ میری کمر کے زخم میں بگاڑ پیدا ہو رہا تھا۔ ڈاکٹروں کو ڈر تھا کہ یہ زخم ناسور میں تبدیل نہ ہو جائیں۔ اب میرے اردگرد کی صورت حال بہت گھمبیر تھی۔ میرے پاس نہ تو پلے کوئی روپیہ پیسہ تھا جس سے میں اپنا اچھا علاج کرواتا دوسرے میں کسی کے در پر پڑ کر اپنی دونوں بیویوں کو سنبھال رہا تھا۔ بالخصوص سکینہ کا علاج اور اُسے سنبھالنا بھی کسی عذاب سے کم نہ تھا۔ والدین مجھ سے الگ ناراض تھے۔ اُدھر مریم بار بار میرے پاس بڑی دور اونچی نیچی پہاڑیوں کو اپنی بیساکھیوں کے سہارے طے کر کے آتی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ کوئی عام لڑکی نہیں بلکہ فولاد کی بنی ہوئی سخت جان صبر والی کوئی خاص لڑکی ہے۔ اسے دیکھ کر لوگ مجھے کہتے تھے کہ شبیر تو بہت خوش قسمت ہے جسے اتنی وفادار، ہمت والی مخلص بیوی ملی ہے۔ وہ تو بیچاری مجھ سے اپنے لاتعداد مسائل کا ذکر کم ہی کرتی تھی۔ کیونکہ اسے میری زخمی حالت اور مالی کمزوری کا بخوبی علم تھا۔ جبکہ اس کی جگہ لبنیٰ مجھے ساری باتیں کھل کر بتاتی تھی۔ مثلاً پیچھے گھر میں سکینہ نے بہت آفت، عذاب مچا رکھا ہے۔ ڈاکٹر کہہ رہے ہیں کہ اس کا پاگل پنا آخری حدیں پار کر چکا ہے۔ اسے بعض دفعہ کوئی زیادہ ہی دیوانے پن کا دورہ پڑ جاتا تھا اور پھر وہ اپنے آگے والی ہر چیز کو تہس نہس برباد کر دیتی تھی۔ اس نے بتایا کہ سکینہ کی جنونیت اب کسی کے قابو میں نہیں آ رہی ہے۔ دوسرے مریم کے پاس میرے اور سکینہ کے علاج کے لئے کوئی پیسہ نہیں ہے۔ اس کا باپ بھی قلاش ہونے کے علاوہ اس سے سخت ناراض ہے۔ برادری اور محلہ دار اسے یہ مجبور کر رہے تھے کہ وہ تم سے طلاق لے یا سکینہ کو وہاں سے نکالے۔ البتہ بلقیس ابھی تک ہمارے ساتھ پورا تعاون کر رہی تھی۔
میرے سامنے لاتعداد ایسے مسائل تھے جن سے نظریں چرانا یا انہیں جوں کا توں چھوڑنا میرے لئے ممکن نہ تھا اور ان سے نمٹنا بھی لازم تھا۔ میں نے ابا اماں کو ہسپتال ہی سے ایک دکھ بھرا خط لکھا ان سے معافی اور امداد کی اپیل کی۔ دوسری جانب میری کمر کے زخم مجھے مزید تنگ کرنے لگے۔ رستم خان نے جو بندہ مجھ پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا تھا اس کا پولیس کیس الگ بنا ہوا تھا۔ ہسپتال میں آئے روز پولیس آ کر مجھے تنگ کرتی تھی۔ انہوں نے الٹا مجھ پر جھوٹا کیس ڈال دیا کہ تم نے مخواہ مخواہ ایک شریف آدمی کے خلاف جھوٹا مقدمہ بنوایا ہے۔ رستم خان نے پولیس اور موقع کے گواہوں کو خرید لیا تھا۔ ڈاکٹروں نے میری کمر کے زخموں کے فوری علاج کے لئے میری بساط سے زیادہ اخراجات بتا دیئے تھے۔

مجھے پتا چلا تھا کہ مریم میرے علاج کے اخراجات کی رقم کے حصول کے لئے پاگل ہو رہی ہے۔ لبنیٰ نے اسے کچھ روپے دیئے تھے۔ ایک دن میرے پاس بلقیس، خادم حسین کے ساتھ مجھ سے ملنے ہسپتال آئی۔ اس نے مجھے بہت سے روپے دیتے ہوئے کہا کہ شبیر تم اس رقم سے اپنا اور سکینہ کا اچھی طرح علاج کرواؤ۔
''میں مر جاؤں گا لیکن کبھی بھی تم سے یہ رقم نہ لوں گا''۔ میں نے اسے کہا۔ ''تم نے پہلے ہی سکینہ کو اپنی کوٹھڑی میں پناہ دے کر ہمیں احسان مند کر دیا ہے۔
وہ رو رو کر یہ رقم لینے پر اصرار کرنے لگی۔
''تمہارے پاس اتنی بڑی رقم کہاں سے آئی؟'' میں نے اس سے پوچھا۔ ''اس میں مجھے کچھ حرام کی کھوٹ محسوس ہوتی ہے''۔

اس نے روتے ہوئے مجھے قسم دے کر کہا۔ شبیر اس رقم میں سے کچھ رقم میرے ابا نے مجھے مرتے ہوئے دی تھی جو کہ انہوں نے میرے جہیز کے لئے رکھی ہوئی تھی اور کچھ رقم میں نے محنت مزدوری کر کے جمع کی تھی۔ وہ کافی دیر تک میرے پاس بیٹھی رہی۔ میں نے اُس سے پیسے نہ لئے۔ وہ روتے ہوئے چلی گئی۔

دوسرے روز مریم میرے پاس آئی اس نے مجھے بتایا کہ روپوں کا بندوبست ہو گیا ہے۔ میں نے اسے صاف صاف بلقیس کے بارے میں بتا دیا تھا کہ وہ روپے لے کر آئی تھی۔

''اچھا ہوا تم نے اس سے پیسے نہیں پکڑے۔'' مریم نے کہا۔

''تم نے میرے علاج کے لئے روپیہ کہاں سے لیا؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

اس نے جواباً مجھے بتایا۔

''یہ رقم مجھے لبنیٰ نے اپنی شادی کے لئے رکھا ہوا زیور فروخت کر کے دی ہے''۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔ ''شبیر! میرا دل نہیں مان رہا تھا کہ میں اس سے یہ قرض لیتی۔ میں نے اس سے یہ رقم ادھار لی ہے۔ یہ اس کا مجھ پر قرض ہے''۔

''فکر نہ کرو مریم!'' میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر مجھے زندگی ملی تو میں یہ قرض خود اپنی محنت سے اتاروں گا''۔ اس دن مریم رات گئے تک میرے پاس رہی۔ ہم دونوں نے خوب باتیں کیں۔

''ہم نے شادی تو کر لی ہے''۔ میں نے اسے بوقت رخصت حسرت سے کہا۔ ''لیکن ہمیں خوشی کوئی نہیں ملی۔ تم بھی میری وجہ سے مشکلات میں پھنس گئی ہو۔''

''شبیر! تم جلد ٹھیک ہو جاؤ گے''۔ مریم نے میرا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اللہ سے یہی امید ہے کہ سکینہ کی دماغی حالت بھی بہتر ہو جائے گی۔ اس کے بعد ہماری زندگی میں سکون اور ٹھہراؤ آ جائے گا''۔

دوسرے روز میں ہسپتال کے وارڈ میں پڑا اپنے ساتھ والے بیڈ کے مریض سے باتیں کر رہا تھا تو اچانک ہمارے وارڈ میں عباس اور ایک محلے دار اندر آئے۔ وہ دونوں روتے ہوئے میرے پاس آئے۔

میرا دل گھبرانے لگا۔

''اللہ خیر کرے!''

''بھائی جان! کچھ بھی نہیں بچا''۔ عباس نے مجھ سے لپٹ کر روتے ہوئے کہا۔

''عباس! کیا ہوا؟'' میں نے بے چین ہو کر کہا۔ ''جلدی بولو''۔

''باجی مریم چلی گئی بھائی جان!'' عباس نے روتے ہوئے مجھے کہا۔ ''آج صبح باجی مریم اپنی سہیلی لبنیٰ کے ساتھ سکینہ کو پہاڑی کی جانب سے لے کر پنڈی آنے والی سڑک پر جا رہی تھی کہ اچانک سکینہ نے جنونی حالت میں باجی مریم کو ایک زوردار جھٹکا مارا دیکھتے ہی دیکھتے....'' اس سے آگے عباس سے بولا نہ گیا۔ اس کے الفاظ میرے دل پر کسی بجلی کی مانند گر رہے تھے۔

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے اس کی کمر پر تھپکی دے کر اس کو حوصلہ دیا۔ حالانکہ اس وقت میں خود اپنے وجود میں ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔

اس نے بتایا کہ باجی نے گرتے گرتے سکینہ کا ہی سہارا لینا چاہا ان کا ہاتھ اس کے ہاتھ پر پڑا اور وہ دونوں کئی فٹ گہری برفیلی ڈھلان میں لڑھک گئیں۔ سکینہ تو مر گئی ہے لیکن باجی مریم کو شدید زخمی حالت میں میونسپل ہسپتال راجہ بازار کے ایمرجنسی وارڈ میں لے جایا گیا ہے۔ وہاں ان کی حالت بہت خراب ہے، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ میری فلک

شگاف آوازیں سن کر پورے ہسپتال کے مریض ڈاکٹرز میرے پاس آ گئے۔ ڈاکٹر جس نے میرا آپریشن کرنا تھا اس نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ جو رقم میرے پاس تمہارے آپریشن کے لئے موجود ہے وہ تم فی الحال لے لو۔ میں بعد میں تمہارا آپریشن کر دوں گا۔ اتفاق سے میونسپل ہسپتال اس پرائیویٹ ہسپتال سے قریب ہے۔ تم فوری طور پر وہاں جاؤ۔ میں عباس کے ساتھ ایک تانگے کے ذریعہ جب میونسپل ہسپتال راجہ بازار پہنچا تو وہاں ایمرجنسی وارڈ میں مریم کے گاؤں کے کئی لوگ جن میں ان کے قریبی رشتہ دار، برادری والے زیادہ تھے۔ وہ شدید زخمی مریم کے گرد حلقہ بنائے کھڑے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر اسے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ منظر تھا کوئی خنجر تھا جو میرے دل پر اتر رہا تھا۔

''مریم! میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا میں بھی مر جاؤں گا''۔ میں نے جذبات محبت میں اس کے ہاتھ کو چومتے ہوئے کہا۔

''شبیر! تمہارا اور میرا ساتھ لگتا ہے اتنا ہی تھا''۔ مریم نے لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تم نے اور میں نے اپنی محبت کا وعدہ نبھاہ دیا ہے۔ میرا بچنا ناممکن ہے۔ تم میری چند باتیں غور سے سنو''۔ میں رونے لگا تو وہ بولی۔ ''وقت کم ہے شبیر! میری آخری خواہش سمجھ کر یہ فیصلہ مان لینا''۔

پھر اس نے میرا ہاتھ قریب کھڑی بلقیس کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے کہا۔

''شبیر! اس نے اپنے برے ماضی سے توبہ کر لی ہے۔ مجھے لبنیٰ نے بتایا تھا کہ اس نے جو رقم مجھے یہ جھوٹ بول کر دی کہ یہ اس کی ہے یہ دراصل بلقیس ہی نے مجھے قسم دے کر دی تھی''۔ مریم نے تیز تیز الفاظ میں کہا۔ ''میں تمہیں اب یہ اجازت دیتی ہوں کہ تم بلقیس سے شادی کر لینا شاید اس طرح ہم دونوں اس کے احسانات کا بدلہ اتار سکیں اور اسے ہمیشہ خوش رکھنا''۔

''نہیں مریم! تم زندہ رہو گی''۔ میں نے تڑپ کر کہا۔

''نہیں شبیر! تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم بلقیس کو اپناؤ گے''۔ مریم نے ڈوبتی آواز میں کہا۔

''مریم! یہ تم مجھے کیسے امتحان میں ڈال رہی ہو؟'' میں نے روتے ہوئے کہا۔ ''میرا دل پھٹ جائے گا''۔

''بلقیس! میں اپنی محبت امانتاً تمہارے حوالہ کر کے جا رہی ہو''۔ مریم نے بلقیس سے کہا۔ ''میرا مان رکھنا، روز قیامت میں تم سے پوچھوں گی''۔

''مریم! ایسا نہ کہو''۔ بلقیس نے روتے ہوئے اسے کہا۔ ''میں سچے دل سے یہی چاہتی تھی کہ تم دونوں بحیثیت میاں بیوی اکٹھے رہتے''۔

مریم نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن پھر اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ وہ آنکھیں بلقیس سے اور مجھ سے التجا کر رہی تھیں۔ مریم مر چکی تھی۔ میری دونوں بیویوں کا جنازہ ایک ہی دن اٹھا تھا۔

اپنی آپ بیتی کے آخر میں شبیر الحسن نے روتے ہوئے کہا۔

''رضوان بیٹا! اپاہج مریم نے مرتے مرتے میری محبت کی خاطر اپنی جان کی قربانی دے دی۔ اس نے میرے سکون اور پاگل سکینہ کے علاج کی راہ میں اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا۔ بالآخر میں نے نہ چاہتے ہوئے اس کی خواہش کے مطابق بلقیس سے شادی کر لی لیکن بلقیس نے بھی بحیثیت بیوی میری بہت خدمت کی۔ وہ چند سال قبل وفات پا گئی ہے۔ میرے پاس اب ماضی کی دلخراش یادیں اور مریم کی بیساکھیاں موجود ہیں۔

ختم شد

معاشرت اور قانون

گھر کا چراغ

عمر رسیدہ مقتول کی بیوہ جوان اور خوبصورت تھی اور تھانیدار کا خیال تھا مقتول اسی وجہ سے قتل ہوا ہے۔

☆ ممتاز احمد | 0300-7901921 | سرگودھا

صبح آٹھ بجے کے قریب تھانہ کینٹ کے ایس ایچ او کو ایک نامعلوم نمبر سے فون کال موصول ہوئی۔ کال کرنے والے نے بتایا کہ شہر کے مشہور علاقے گلشن پارک کے ایک ویران گوشے میں ایک شخص کی لاش پڑی ہے۔ پلیز آپ وہاں فوراً پہنچیں۔ اس کے بعد کال ڈراپ ہوگئی۔ گلشن پارک شہر کا ایک بڑا پارک تھا جہاں لوگ صبح صبح چہل قدمی کے لئے آیا کرتے تھے۔ یہ پارک تھانہ کینٹ کی حدود میں آتا تھا۔ کال سننے کے بعد ایس ایچ او نے فوراً اپنی ٹیم ترتیب دی اور سرکاری گاڑی میں گلشن پارک کی طرف چل پڑا۔ پچیس منٹ کے بعد وہ گلشن پارک میں تھا۔ ایس ایچ او نے اس نمبر پر کال ملائی جس نمبر سے اسے فون کال آئی تھی۔ تیسری گھنٹی پر اس شخص نے کال وصول کر لی اور ایس ایچ او کو بتایا کہ وہ لاش کے قریب موجود

ہے۔ اس نے ایس ایچ او کو لاش کی لوکیشن سمجھائی۔ اگلے پانچ منٹ میں پولیس لاش کے پاس پہنچ گئی۔

مرنے والے شخص کی عمر لگ بھگ پچاس پچپن برس تھی۔ اسے گولی مار کر ہلاک کیا گیا تھا، اس کی لاش روش کے بل پڑی تھی۔ ایس ایچ او نے کال کرنے والے شخص سے سوال جواب شروع کر دیئے۔ کال کرنے والے کا نام جاوید تھا اور پارک کے قریب ہی اس کی رہائش تھی۔ جاوید نے بتایا کہ وہ ہر روز صبح صبح سیر کرنے پارک میں آتا ہے۔ آج وہ کافی دیر سے پارک میں آیا تھا۔ دیر سے آنے کی وجہ اس نے یہ بتائی کہ صبح صبح اس کے بیٹے کی بیرون ملک سے کال آ گئی تھی جس کی وجہ سے وہ آج دیر سے پارک آیا۔ جب اس نے پارک کا دوسرا چکر لگایا تو اچانک اس کی نظر لاش پر پڑی جسے دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا اور فوراً پولیس کو کال کر دی۔

پارک میں پولیس کو دیکھ کر لوگ آنے لگے اور یہ ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ اب لاش کی شناخت کا مسئلہ درپیش تھا۔ ہجوم میں سے ایک شخص نے بتایا کہ وہ مرنے والے کو جانتا ہے۔ اس کا نام الیاس ہے اور وہ سرکاری ملازم ہے۔ انسپکٹر نے لاش شناخت کرنے والے سے اس کا ایڈریس پوچھا تو اس نے بتایا کہ مرنے والا اس کا محلے دار ہے اور وہ قریبی ایک بستی جمال ٹاؤن میں رہتا ہے۔ انسپکٹر نے سب سے پہلے ایمبولینس کو کال کی اور لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے سول ہسپتال بھیج دیا پھر ایس ایچ او اس شخص کو ساتھ لے کر مرنے والے کے گھر پہنچ گیا۔ مرنے والے کے لواحقین میں صرف دو افراد تھے۔ ایک اس کی بیوہ شہلا بیگم اور دوسرا اس کا بیٹا ادریس تھا۔ شہلا ایک اڑتیس سال کی جوان اور خوبصورت عورت تھی، ادریس کی عمر بیس سال تھی۔ جب ایس ایچ او نے انہیں بتایا کہ الیاس قتل ہو گیا ہے تو وہ ماں بیٹا یہ سن کر رونے لگے۔ فی الحال ان سے سوال جواب نہیں ہو سکتے تھے۔

ایس ایچ او نے لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھیجنے سے پہلے اس کی جیبوں کی تلاشی لی تھی مگر اُسے کچھ نہیں ملا تھا، سوائے تین ہزار روپے کے۔ الیاس کا موبائل فون گھر میں تھا۔ اس نے ادریس سے کہا کہ الیاس کا فون اسے دے دیا جائے۔ ادریس نے اپنے باپ کے کمرے سے اس کا فون لا کر ایس ایچ او کو دے دیا۔ تھانیدار کا اندازہ تھا کہ قتل کی یہ واردات کسی چور ڈاکو نے نہیں کی تھی کیونکہ اس کی جیب میں تین ہزار کی رقم موجود تھی۔ وہ علاقہ بہت پُرامن تھا، وہاں آج تک کوئی ایسی واردات نہیں ہوئی تھی۔ یہ پہلا واقعہ تھا۔

پولیس نے تفتیش شروع کر دی۔ سب سے پہلے الیاس کے ٹیلی فون پر ریسیو کی گئیں اور out-going کالز کو چیک کیا گیا۔ مگر وہ سب نارمل کالز تھیں اور سب کے نمبر الیاس کے موبائل میں فیڈ تھے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے آنے تک ایس ایچ او نے الیاس کے دفتر جا کر اس کے کولیگز سے پوچھ گچھ شروع کی جس کے مطابق الیاس انتہائی شریف النفس، ایماندار اور دیانت دار بندہ تھا۔ وہ بہت ہنس مکھ انسان تھا کبھی کسی کو تنگ نہیں کیا ہر شخص سے اخلاق سے پیش آیا کبھی کسی سے فالتو بات نہیں کی۔ وقت کا پابند تھا، اس کے آفیسر اور دفتر کا دیگر عملہ اس سے بہت خوش تھا اور اس کی عزت کرتا تھا۔ کبھی کسی سے جھگڑا یا لڑائی نہیں کی، وہ اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ الیاس کے دفتر والوں نے جب الیاس کے قتل کی خبر سنی تو سب مغموم اور غمگین ہو گئے۔ ایس ایچ او کو مایوسی ہوئی۔ اُس کا خیال تھا کہ ہو سکتا ہے اس کے دفتر کا کوئی بندہ اُس کے قتل میں ملوث ہے مگر یہاں تو سب اُس کی خوبیوں کے گن گا رہے تھے۔

دن کے بارہ بجے الیاس کی لاش پوسٹ مارٹم ہو

گئی نمازِ مغرب کی نماز کے بعد سپردِ خاک کر دیا گیا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول کو ریوالور کی چار گولیاں لگی تھیں اور اُس کا قتل صبح سات اور ساڑھے سات بجے کے درمیان ہوا تھا۔ چار گولیاں چلی تھیں تو کسی نے گولی چلنے کی آواز بھی یقیناً سنی ہو گی۔ ایک بار پھر ایس ایچ او کا رخ گلشن پارک کی طرف ہوا اس نے اردگرد شاپس اور رہنے والوں سے پوچھ گچھ کی مگر سب نے یہی بتایا کہ کسی نے بھی گولیاں چلنے کی آواز نہیں سنی۔ لاش کے قریب چلی ہوئی گولیوں کے خول پڑے تھے جسے لیبارٹری ٹسٹ کے لئے بھجوا دیا گیا تھا۔ انسپکٹر کا خیال تھا کہ مقتول کو سائیلنسر لگے ریوالور سے گولیاں ماری گئی ہیں۔

اگلے دن ایس ایچ او مقتول کے گھر گیا اور اس کی بیوہ شہلا اور بیٹے ادریس سے ملا۔ ان سے جو سوال و جواب ہوئے اس کے مطابق مقتول پانچ وقت کا نمازی پرہیزگار انسان تھا۔ وہ روزانہ صبح کی سیر کرنے پارک میں سات بجے جاتا تھا اور آٹھ بجے اس کی واپسی ہوتی آ کر وہ نہاتا، کپڑے تبدیل کرتا پھر ناشتہ کر کے اپنے آفس روانہ ہو جاتا۔ وہ پورے نو بجے آفس پہنچ جاتا اور شام ساڑھے پانچ بجے گھر واپس آ جاتا۔ گھر آ کر وہ چائے پیتا اور ٹی وی پر خبریں سنتا۔ عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد سو جاتا۔ صبح جلدی اٹھ جاتا اور فجر کی نماز مسجد میں ادا کرتا۔ الیاس کا کوئی یار دوست نہیں تھا، وہ کم گو انسان تھا۔ جس دن اس کا قتل ہوا اس روز بھی وہ اپنی روٹین کے مطابق پارک میں سیر کرنے گیا تھا مگر واپس اس کی لاش آئی۔

ایس ایچ او کو قتل سے متعلق کوئی خاص بات معلوم نہ ہوئی۔ مقتول کے گھر میں سوگواری تھی اور رشتہ دار اور محلے کے لوگ تعزیت کے لئے آ جا رہے تھے۔ آنے جانے والے لوگوں میں بھی کوئی مشکوک شخص نظر نہ آیا۔ الیاس کے قتل کی ایف آئی آر تھانہ میں درج ہو چکی تھی اور اس پر تفتیش بھی کرنی تھی مگر ابھی تک پولیس اندھیرے میں تھی۔ الیاس کے قتل کا کوئی بھی سراغ نہیں ملا تھا۔ ایک انسان کا قتل ہوا تھا اور انسان بھی بہت اچھا تھا۔

ایک خیال ایس ایچ او کے ذہن میں آیا اور وہ یہ کہ مقتول کی بیوہ شہلا بیگم ایک جوان اور خوبصورت عورت تھی جبکہ الیاس ایک عمر رسیدہ شخص تھا، ہوسکتا ہے دونوں کے درمیان ان بن ہو اور شہلا بیگم کے کسی کے ساتھ مراسم ہوں اور ہوسکتا ہے کہ شہلا بیگم کے کہنے پر اُس مرد نے الیاس کو قتل کر دیا ہو۔ اسی خیال کے تحت ایس ایچ او نے شہلا بیگم سے ملنے کا فیصلہ کیا اور اگلے دن رات کے نو بجے وہ الیاس کے گھر میں تھا۔ اس نے شہلا بیگم سے پوچھا۔ اس کی شادی کن حالات میں ہوئی تھی۔ مطلب لو میرج تھی یا ارینج؟ شہلا نے بتایا۔ ان کی شادی ارینج تھی۔ شہلا کے ماں باپ بہت غریب تھے اور وہ سات بہن بھائی تھے۔ ان کے ماں باپ اولاد کی جلدی شادی کرنے کے حق میں تھے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ جلد از جلد بچوں کی شادیوں کا فریضہ ادا کرنا چاہتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ شہلا کے چار بہن بھائیوں کی شادی ہو چکی تھی۔ اب شہلا کا نمبر تھا۔ شہلا کے والد کے کسی جاننے والے کے توسط سے الیاس کا رشتہ آیا تو اُس وقت شہلا کی عمر صرف سترہ سال تھی جبکہ الیاس کی عمر چونتیس سال تھی اور وہ ایک سرکاری محکمے میں جونیئر کلرک تھا۔ الیاس ایک شریف انسان تھا جن صاحب کے توسط سے رشتہ آیا تھا انہوں نے الیاس کی پوری ذمہ داری لی تھی اور گارنٹی دی تھی تو اللہ کا نام لے کر چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مطابق شہلا اور الیاس کی شادی کر دی گئی۔

الیاس بہت اچھا شوہر ثابت ہوا کیونکہ وہ ایک سمجھدار انسان تھا اور بچپن سے نمازی پرہیزگار تھا۔ الیاس شہلا کا بہت خیال رکھتا تھا گو کہ گھر میں غربت تھی مگر سکون تھا۔ الیاس نے کبھی لڑائی جھگڑا نہیں کیا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ ترقی کرتے کرتے جونیئر کلرک سے سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر پہنچ گیا تھا۔ شادی کے ایک سال بعد ادریس پیدا ہوا۔ اس کے بعد پھر ان کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی۔ وہ پرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ انہوں نے ادریس کو پڑھایا لکھایا۔ جب ادریس کی تعلیم مکمل ہو گئی تو الیاس اُس کی جاب کا بندوبست اپنے محکمے میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر ملازمتوں پر پابندی لگی ہوئی تھی، اس لئے ادریس فارغ تھا۔

ایس ایچ او نے باتوں باتوں میں شہلا بیگم اور ادریس کے ٹیلی فون نمبرز لے لئے اور نمبرز لینے کی وجہ یہ بتائی کہ اگر اسے کوئی بات پوچھنی ہوئی تو وہ فون کر کے پوچھ لے گا۔

ایس ایچ او واپس تھانے میں آ گیا اور اس نے شہلا بیگم کے ٹیلی فون پر ریسیو کی گئیں اور اُس نمبر سے کی گئیں کالز کا ریکارڈ نکلوایا مگر ریکارڈ کے مطابق وہ کالز شہلا کے بہن، بھائیوں، ماں باپ اور الیاس کی تھیں۔ ان میں کوئی بھی کال کسی غیر مرد یا لڑکے کی نہیں تھی۔ ایس ایچ او کو مایوسی ہوئی اور اس کا خیال غلط ثابت ہوا۔ اب اس نے ادریس کی کالز چیک کیں تو ان میں سے ایک نمبر ملا جس پر روزانہ ادریس دو گھنٹے بات کرتا تھا۔ ایس ایچ او نے ادریس سے اس نمبر کا پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ اس کی منگیتر کا نمبر ہے جس پر وہ روزانہ اس سے پیکیج لگا کر بات کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے کوئی اور نمبر نہ ملا۔ ایس ایچ او نے اپنے طور پر اور اپنے مخبروں کے ذریعے بہت سارے لوگوں سے پوچھ گچھ کی مگر کوئی سراغ نہ ملا۔ وہ بہت مایوس تھا اسے رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ اتنے اچھے انسان کا قتل کیوں ہوا۔ ہر بندہ الیاس کی تعریف کرتا تھا اور اُسے اچھے لفظوں سے یاد کرتا تھا مگر کوئی تو دشمن تھا اس کا جس نے اُس کا قتل کیا تھا اور وہ دشمن ہی اُسے نہیں مل رہا تھا۔ قاتل کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ یہ اندھا قتل تھا۔ ایس ایچ او نے تنگ آ کر فی الحال اس کیس کو پینڈنگ کر دیا اور دوسرے کیسز میں مصروف ہو گیا۔

شہلا بیگم کی طرف سے اس کے مرحوم شوہر کے آفس میں درخواست موصول ہوئی جس میں گروپ لائف انشورنس، گریجوایٹی اور پنشن کی استدعا کی گئی تھی۔ ان دنوں گورنمنٹ نے دوران ڈیوٹی مرنے والے شخص کی انشورنس کی رقم پچیس لاکھ روپے کی تھی۔ اب ظاہر ہے یہ واجبات وصول کرنا شہلا بیگم کا حق تھا۔ ساتھ ہی ادریس کی ملازمت حاصل کرنے کی درخواست بھی محکمہ کو ملی کیونکہ جو ملازم دوران سروس فوت ہو جائے تو فوراً اس کے بیٹے کو مرنے والے کی جگہ ملازمت مل جاتی ہے۔ گوکہ ملازمتوں پر پابندی تھی مگر ایسے کیسوں میں پابندی کا اطلاق نہیں ہوتا تھا۔ محکمے نے ضابطے کی کارروائی کے لئے ادریس کی درخواست رکھ لی۔ فوری طور پر شہلا بیگم کو پچیس لاکھ روپے کی رقم لائف انشورنس کی مد میں ادا کر دی گئی۔ باقی رقم کی ادائیگی کے لئے تھوڑا ٹائم لگنا تھا۔

الیاس کو قتل ہوئے گیارہواں دن تھا مگر ابھی تک قاتل کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ اس روز ایس ایچ او کے خاص مہمان آئے ہوئے تھے۔ رات کا کھانا کھلانے رات کے آٹھ بجے ایس ایچ او سول لباس میں اپنے مہمانوں کو لے کر ہوٹل گیا اور جا کر کھانے کا آرڈر دیا۔ کھانا آنے میں ابھی تھوڑی دیر تھی۔ ایس ایچ او اپنے مہمانوں سے باتیں کر رہا تھا کہ اچانک اُس کی نظر مقتول الیاس کے بیٹے ادریس پر پڑی، وہ اپنے تین

دوستوں کے ہمراہ کھانا کھانے آیا ہوا تھا۔ خلاف معمول ادریس بہت چہک رہا تھا اور خوشی کے موڈ میں تھا۔ ایس ایچ او کو ایک جھٹکا لگا، وہ سوچ میں پڑ گیا کہ چند روز پہلے اس کے باپ کا قتل ہوا ہے اور یہ اپنے دوستوں کے ساتھ ہوٹل میں خوش گپیوں میں مصروف ہے۔ اسے تو اپنے باپ کے مرنے کا کوئی غم ہی نہیں ہے۔ اس کا باپ کیا قتل ہوا اس کی تو لاٹری نکل آئی ہے۔ ایس ایچ او تھوڑی دیر ادریس کو دیکھتا رہا۔ ادریس نے ایس ایچ او کو نہیں دیکھا تھا۔ اتنی دیر میں کھانا آ گیا۔ ایس ایچ او نے اپنے مہمانوں کے ساتھ کھانا کھایا اور ہوٹل سے اٹھ آیا۔ اب ایس ایچ او کو ادریس مشکوک لگنے لگا۔ اس سے پوچھ گچھ اب بہت ضروری تھی۔

چنانچہ اگلے دن اس نے ادریس کو کال کر کے پولیس اسٹیشن بلایا۔ جب ادریس تھانے میں آیا تو ایس ایچ او نے اس کا حال احوال پوچھا اور ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ باتوں باتوں میں اس نے ادریس سے پوچھا کہ وہ کل رات کدھر تھا تو ادریس نے بتایا کہ وہ گھر میں ہی تھا کیونکہ لوگ اس کے باپ کی تعزیت کے لئے ابھی تک آ رہے ہیں۔ اب ایس ایچ او کا شک یقین میں بدل گیا کہ الیاس کے قتل میں یقیناً ادریس ملوث ہے۔ کیونکہ ادریس نے جھوٹ بولا تھا کہ وہ کل رات گھر میں تھا جبکہ وہ دوستوں کے ساتھ ہوٹل میں تھا۔ ادریس نے ایس ایچ او سے پوچھا کہ اسے تھانے کیوں بلایا ہے تو ایس ایچ او نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُسے بتایا کہ اُس کے باپ کا قاتل مل گیا ہے۔ ادریس یہ سن کر ایک دم پریشان ہو گیا۔

”کون ہے میرے باپ کا قاتل؟“ اس نے گھبراہٹ چھپاتے ہوئے زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔

ایس ایچ او اپنی سیٹ سے اٹھ کر ادریس کے پاس آیا اور چھڑی کی نوک ادریس کی ٹھوڑی کے نیچے

ذرا اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"الیاس کا قاتل میرے سامنے ہے۔"

یہ سن کر ادریس کے پسینے چھوٹ گئے۔

"بھلا میں اپنے باپ کو کیوں قتل کرتا؟" اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"قتل کی وجہ بھی تم بتاؤ گے۔" ایس ایچ او نے اس کے گریبان سے پکڑ کر ادریس کو کرسی سے اٹھایا اور ساتھ ہی حوالدار کو آواز دی تو اگلے ہی لمحے حوالدار اس کے کمرے میں تھا۔ ایس ایچ او نے حوالدار سے کہا۔ "اسے ذرا ڈرائنگ روم کی سیر تو کروا کے لاؤ۔ اس کی یادداشت خراب ہو گئی ہے۔ اس کو کچھ یاد نہیں آ رہا۔"

حوالدار ادریس کو گھسیٹتے ہوئے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ ادریس کا رنگ پیلا پڑ چکا تھا اور تھوڑے سے تشدد کے بعد اس نے اعتراف جرم کر لیا۔ اس نے قبول کر لیا کہ اُس نے اپنے باپ کو قتل کیا ہے۔ قتل کرنے کی وجہ یہ بتائی کہ اُس کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی مگر اسے کہیں جاب نہیں مل رہی تھی، وجہ یہ تھی کہ نئی ملازمتوں پر حکومت نے پابندی لگائی ہوئی تھی۔ اسے اپنی منگیتر کو شادی کی بہت جلدی تھی مگر دونوں خاندانوں نے یہ شرط رکھی تھی کہ جیسے ہی ادریس کو کہیں ملازمت ملے گی تو ان کی شادی ہو گی۔ یہ منگنی ادریس نے اپنی مرضی سے کروائی تھی، وہ اپنی منگیتر کو پسند کرتا تھا اور وہ بھی اُسے پسند کرتی تھی۔

اس نے کہیں سے یہ سنا تھا کہ اگر دوران ملازمت کوئی ملازم فوت ہو جائے تو اُس کی جگہ اس کے بیٹے کو فوراً ملازمت مل جاتی ہے۔ ایک دن اُس کے ذہن میں یہ شیطانی خیال آیا کہ کیوں نا وہ اپنے باپ کو مار دے۔ اس طرح انشورنس کی رقم بھی مل جائے گی اور اس کی ماں کی پنشن بھی شروع ہو جائے گی اور ملازمت تو اسے ویسے بھی مل جائے گی۔ آخر کافی سوچ بچار کے بعد اُس نے اپنے باپ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ وہ صبح صبح سیر کرنے گلشن پارک میں جاتا تھا تو وہیں پر اس کو قتل کیا جا سکتا تھا۔ اس نے ایک پستول لیا اور اُس کے آگے سائیلنسر چڑھا لیا۔ جیسے ہی اس کا باپ سیر کرنے گلشن پارک گیا ادریس بھی پانچ منٹ کے بعد گھر سے نکلا اور پارک پہنچ گیا۔ اس نے جب باپ کو ایک ویران گوشے میں دیکھا تو اس پر چار گولیاں چلا دیں۔ وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ ادریس چپکے سے پارک سے نکلا اور گھر آ گیا۔ اسے پارک میں آتے جاتے کسی نے نہیں دیکھا مزید یہ پستول پر سائیلنسر لگا ہوا تھا جس کی وجہ سے کسی نے گولی چلنے کی آواز نہ سنی تھی۔ تھانیدار نے ادریس پر اپنے باپ کے قتل کا مقدمہ بنایا اور اُسے گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔

ادھر الیاس کی بیوہ شہلا بیگم سارا دن گھر میں اکیلی ہوتی تھی۔ اس نے فیس بک پر ایک پچیس سالہ نوجوان سے دوستی گانٹھ رکھی تھی۔ وہ اس کے ساتھ ان باکس میں باتیں کرتی تھی اور ویڈیو کال پر دونوں باتیں کرتے تھے۔ وہ الیاس سے بہت تنگ تھی، وہ چاہتی تھی اُسے الیاس سے چھٹکارا مل جائے۔ جب اس نے الیاس کے قتل کی خبر سنی تو اندر سے وہ بہت خوش ہوئی۔

اب اُس نے اپنی عدت گزار کر اپنے جوان دوست سے شادی کرنی تھی۔ اسی اثناء میں اس کی گریجوایٹی کی رقم اور پنشن کی رقم اس کے اکاؤنٹ میں جمع ہو گئی تھی۔ انشورنس کی رقم تو پہلے ہی اُسے مل چکی تھی، اب اس کے پاس پچاس لاکھ روپے تھے۔ بیٹا اپنے باپ کے قتل کی سزا بھگتنے جیل چلا گیا تھا۔ اب وہ آزاد تھی، اس کے راستے کی ساری رکاوٹیں ختم ہو چکی تھیں۔

شہلا بیگم نے فوراً اپنے دوست کو یہ خوشخبری سنائی۔ اُس لڑکے کا نام عاطف تھا، اس نے بی اے کیا

ہوا تھا مگر کوئی ملازمت نہیں مل رہی تھی۔ وہ سارا دن فارغ رہتا اور ہاتھ میں موبائل پکڑے فیس بک پر مختلف دوستوں سے گپ شپ کرتا رہتا۔ عاطف کوئی لمبا ہاتھ مارنا چاہتا تھا اس کی کوشش تھی کہ اسے کہیں سے موٹی رقم مل جائے، جس سے وہ کوئی کاروبار کر لے۔

جب شہلا بیگم نے اسے بتایا کہ اس کے پاس پچاس لاکھ روپے ہیں تو یہ سن کر عاطف کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ اب وہ دن رات شہلا بیگم پر اپنا پیار نچھاور کرنے لگا اس کے حسن کی تعریف کرتا اور کہتا شہلا تم تو ایک بہت خوبصورت لڑکی ہو کہیں سے بھی شادی شدہ نہیں لگتی۔ یہ سب سن کر وہ بہت خوش ہوتی اور ہواؤں میں اُڑتی۔

ایک روز عاطف نے بڑے پیار سے شہلا سے کہا۔ شہلا جان ایسا ہے ایک بہت اچھا مکان فروخت ہونے جا رہا ہے، اُس کے مالک کو فوراً پیسوں کی ضرورت ہے۔ اس لئے وہ کم قیمت پر مل رہا ہے۔ مکان بالکل نیا بنا ہوا ہے اور پانچ مرلے کا ہے۔ اگر تم کہو تو اس کے مالک سے بات کروں؟ اور ہاں یہ مکان میں نے تمہارے نام لکھوانا ہے''۔

اگر اچھا مکان ہے تو بات کر لو''۔ شہلا نے کہا۔ عاطف نے کہا۔ ٹھیک ہے میں آج ہی اس سے بات کرتا ہوں اور کل تمہیں بتاؤں گا۔

اگلے دن عاطف نے شہلا کو کال کی اور بتایا کہ اڑتالیس لاکھ روپے میں وہ مکان دے رہا ہے۔ اگر تم کہو تو خرید لوں؟ شہلا نے کہا۔

عاطف نے شہلا کو بتایا ہوا تھا کہ وہ گورنمنٹ کے کسی محکمہ میں بہت اچھی جاب کرتا ہے۔ اس کی ساٹھ ہزار روپے تنخواہ ہے۔ شہلا عاطف کے جھانسے میں آ گئی۔ عاطف نے کہا۔ اس کی عدت پوری ہونے میں ابھی پورا ایک مہینہ رہتا ہے۔ تو مہینہ پورا ہونے تک وہ مکان بھی لے لے گا اور اپنی جمع کی ہوئی تنخواہ سے وہ شہلا بیگم کے لئے زیور بنوائے گا۔ گھر کا سامان خریدے گا اور اس کے لئے ڈھیر سارے کپڑے بنوائے گا۔ اس کی باتوں میں آ کر پچاس لاکھ روپے کا چیک شہلا نے عاطف کو دے دیا۔ اگلے دن عاطف نے وہ چیک کیش کروایا۔ اپنی فیس بک آئی ڈی بند کر دی اور موبائل فون سم بھی بند کروا دی۔

شہلا بیگم اپنے خاوند اور بیٹے کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتی تھی۔ ایک جوان لڑکے کے ساتھ اپنے گھر میں رہنے کے سہانے سپنے سجائے وہ روزانہ عاطف کی کال کا انتظار کرتی مگر نہ تو وہ فیس بک پر آن لائن ہو رہا تھا اور نہ ہی کال کر رہا تھا۔ شہلا بیگم روزانہ اس کو کال کرتی مگر اس کا نمبر بند ملتا۔ اب وہ پریشان رہنے لگی اور ایک دن وہ عاطف کی رہائش پر گئی تو وہاں سے اُسے پتہ چلا کہ وہ تو ایک ہفتہ پہلے یہ مکان چھوڑ کر کسی دوسرے شہر چلا گیا ہے۔ عاطف نے اپنی فیس بک آئی ڈی بھی بند کر دی تھی۔ شہلا بیگم کو اندازہ ہو گیا تھا کہ عاطف نے اس کے ساتھ فراڈ کیا ہے۔ اس پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ اس کا خاوند قتل ہو گیا، بیٹا باپ کو قتل کرنے کے جرم میں لمبی قید کاٹنے جیل چلا گیا اور پچاس لاکھ روپے کی رقم اُس کا فیس بک فرینڈ لے کر رفو چکر ہو گیا۔ وہ اب بہت روتی اور پچھتاتی ہے کہ یہ کیا کر دیا اس نے۔ وہ اپنے بھائی کے گھر میں رہتی ہے۔ سارا دن گھر کے کام کرتی ہے اور شوہر کی پنشن بھی بھائی کے گھر خرچ کرتی ہے۔ وہ اپنے بھائی اور بھابی کی نوکرانی بنی ہوئی ہے۔ یہ ہے ناشکرے لوگوں کی داستان جو ٹھنڈے دودھ کو پھونکیں مارتے ہیں۔

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔

❁❁❁

سے انہوں نے ایک بڑا سا جھاڑو بنا کر ٹریکٹر کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔ ٹریکٹر چلا دیا گیا۔ تازہ تازہ لگائی ہوئی لاب جھاڑو سے اکھڑتی گئی اور اس میں الجھ کر اکٹھی ہوتی گئی۔ بچی کھچی لاب کارندوں نے چن چن کر اکٹھی کر لی اور کھیت کے کنارے ڈھیر لگا دیا۔ مزارع والی لاب کی جگہ سالم کھیت میں نئی لاب لگا دی گئی۔ واپسی پر کھیت کنارے لاب کا ڈھیر ٹریکٹر میں رکھا اور دور لے جا کر ضائع کر دیا۔

لاب لگانے کی حد تک دونوں سچے تھے۔ پھر ہم ادھر اُدھر کی باتیں کرتے مجمعے میں جا بیٹھے۔

فریقین سے پوچھ گچھ کے دوران میں نے مزارع سے پوچھا کہ اُس نے لاب کب لگائی تھی؟ اُس نے دیسی مہینے کے حساب سے تاریخ اور صبح سے شام تک کا وقت بتایا جو اس کے پہلے بیان اور نمبردار کی اطلاع سے ٹھیک ٹھاک مطابقت رکھتے تھے۔

مالک زمین سے بھی پوچھا۔ اُس نے کہا دن اور وقت اُسے یاد نہیں۔ لاب اس کے کارندوں نے لگائی تھی۔ وہ اس بات پر مصر رہا کہ مونجی کی کاشت اس کی ''خود کاشت'' کے زمرے میں آتی ہے۔

بہرکیف مالک زمین کو مخاطب کر کے میں نے واشگاف الفاظ میں کہا کہ قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ٹیوب ویل اور ٹریکٹر اس کے اپنے ہیں اس لئے مشینی کاشت کی سہولت ہوتے ہوئے ٹیوب ویل کے عین سامنے والے کھیت سے مزارع کا حصہ بٹائی لینا اُسے گوارا نہیں۔ قانونی طریقے سے مزارعے کی بے دخلی سہل نہیں۔ مزارعے کی براہِ راست بے دخلی کے لئے اُس نے شاطرانہ چال چلی اور پہلی لاب کو تلف کر کے نئی لاب لگا دی۔ اس چال کی آڑ میں وہ قسم کے ذریعے اپنی مبینہ سچائی ثابت کرتا ہے۔ نیز اُس نے صرف لاب لگانے کے بارے میں قسم کھانے پر آمادگی کا اظہار کیا ہے اور مونجی کے لئے کھیت کی تیاری، آبیاری اور قبضہ رانی کا دعویٰ نہیں کیا۔ پوچھا۔ کیا وہ اس بارے میں قرآن کریم پر قسم کھانے کو تیار ہے کہ کھیت کی تیاری و آبیاری وغیرہ بھی اُس نے خود کی تھی اور مزارعے نے کسی مرحلہ پر بھی لاب نہیں لگائی تھی؟

اس سوال پر مالک زمین کا طمطراق جاتا رہا۔ چہرے کے اتار چڑھاؤ سے وہ ڈانواں ڈول نظر آنے لگا اور اسے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ مزید استفسار پر اُس نے نفی میں صرف سر کو جنبش دی اور بے بسی اور بے چارگی کا بت بنا کھڑا رہا۔ مزارعے کی شکایت مبنی بر حقیقت تسلیم کر لی گئی اور میں نے فیصلہ اس کے حق میں دیا۔ حاضرین جولب کشائی سے گریزاں تھے، برملا کہہ اٹھے کہ فیصلہ بالکل حق سچ ہے۔

معاشرتی سطح پر ہر شعبۂ زندگی میں ریاکاری، ہیرا پھیری اور دروغ گوئی کے واقعات روزمرہ کا معمول ہیں۔ ان معمولات کو کسی سرکاری حکم نامہ یا عدالتی ڈگری سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کہ سچی گواہی اور انصاف کے اسلامی احکامات میں سخت تاکید ہیں ہر فیصلہ مؤثر اور معتبر شہادت پر مبنی ہوتا ہے اور ہر کیس میں کئی کئی گواہ ہوتے ہیں۔ ان میں سب کے سب سچے نہیں ہوتے۔ اگر ضابطۂ قانون میں ایک شق ایزاد کر دی جائے کہ عدالت جن گواہان کے بارے میں مطمئن ہو جائے کہ ان کی گواہی صداقت پر مبنی نہیں ہے فیصلے میں اُن کی نشاندہی کی جاوے اور انہیں آئندہ کسی فورم یا عدالت میں شہادت دینے کا نااہل قرار دیا جائے ایسے گواہان کی سرکاری طور پر تھانہ، تحصیل اور ضلع کی سطح پر تشہیر کی جائے۔ اس طرح دوسرے لوگ بھی جھوٹی شہادت دینے سے گریز کریں گے اور یوں جھوٹی گواہی کا رجحان ختم ہو جائے گا۔ عدالتوں میں مقدمات کا بوجھ بھی بتدریج کم سے کم تر ہوتا جائے گا۔

❁❁❁